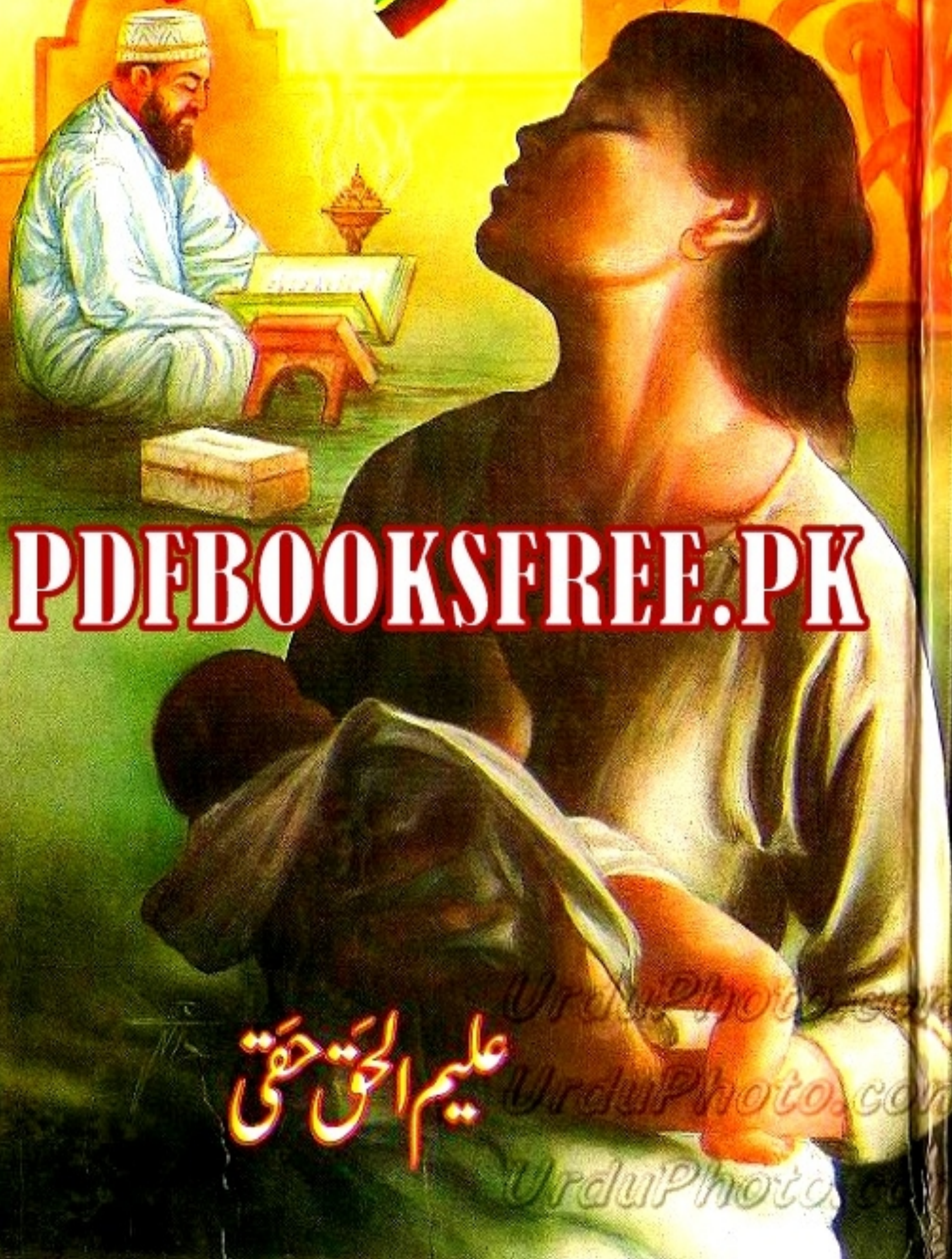
حج اکبر



گھر کی چوکھٹ پار کرنے سے پہلے چندو نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر وہ گلی میں نکل آیا۔ گلی میں کوئی بچہ بھی نہیں تھا ورنہ اس وقت وہاں سناٹے کا کوئی کام نہیں تھا۔ بچے دھما چوکڑی منا رہے ہوتے تھے۔ شاید اس کا سبب بارش تھی۔ بچے کھیلنے' نہانے اور بیر بہوٹیاں پکڑنے کے لئے شاید میدان کی طرف نکل گئے تھے۔

چندو کو مایوسی ہوئی۔ خاموشی اور بے رونقی اسے کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ مستانہ انداز میں ٹہلتا ہوا گلی کے نکڑ کی طرف بڑھا۔ بارش کی وجہ سے جگہ جگہ پانی بھر گیا تھا' چھوٹے چھوٹے تالاب سے بن گئے تھے۔ وہ پانی سے بچ کر چل رہا تھا مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ زمین تو بہرحال گیلی ہو رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوری طور پر اسے ایک چھینک آئی اور پھر دوسری.....

اسی وقت عبدالصمد کی بیوی زیب النسا اپنے دروازے پر آئی۔ چندو اس وقت اس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ زیب النسا نے اسے پکارا "اے چندو' کہاں جا رہا ہے؟؟"

چندو نے آواز سنی مگر صرف کن آنکھوں سے زیب النسا کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔ وہ اس وقت رک کر اپنا راستہ کھوٹا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"نخرے تو دیکھو اس کے۔ دیکھتا بھی نہیں ہماری طرف۔ مطلبی ہے مطلبی۔"
زیب النسا نے جل کر کہا "اپنا مطلب ہو تو کیسے آکر خوشامدیں کرتا ہے ہماری۔ آنے دے باجی کو۔ آج انہیں بتاؤں گی کہ تو کیا کیا کرتا پھرتا ہے۔"

چندو کی چال کی بے نیازی اور نمایاں ہو گئی۔ پلٹ کر دیکھنے کا بھی سوال نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔

گلی سے نکلتے ہی اس کی چال تبدیل ہو گئی۔ تنگ گلی اور چوڑی سڑک میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ وہاں چلتے ہوئے اپنے چھوٹے ہونے کا احساس ہوتا ہے اور سڑک پر اپنا آپ بہت بڑا اور بہت پھیلا ہوا لگنے لگتا ہے۔

چندو نے گہری سانس لے کر سینہ پھلا لیا۔ گلی سے چوڑی یہ سڑک اسے اس لئے بھی اچھی لگتی تھی کہ وہ کچی تھی۔ پکی سڑک پر چلنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔

سڑک پر گلی کے مقابلے میں رونق تھی۔ اگرچہ روز کے مقابلے میں کم تھی۔ اس کچی سڑک پر دو رویہ دکانیں تھیں۔ یہ سڑک آگے جا کر مین روڈ سے ملتی تھی۔ وہیں بس اسٹاپ بھی تھا۔

چندو کی چال میں بانکپن آ گیا۔ اب وہ اس انداز سے چل رہا تھا' جیسے کوئی پولیس والا اپنے علاقے میں پٹرولنگ کر رہا ہو۔ چلتے چلتے اسے پھر ایک چھینک آئی۔ اس کے بعد دوسری چھینک بھی آئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اسے ایک چھینک کبھی نہیں آتی تھی۔ چھینکیں دو دو کر کے آتی تھیں۔

اسے اپنے نتھنوں کے نیچے نمی کا احساس ہونے لگا۔

"ارے چندو' چھینکیں آ رہی ہیں تجھے۔" ایک دکان دار نے پکارا "نزلہ زکام ہو جائے گا پگلے۔ برسات کے موسم میں ایسے نہیں پھرتے۔ احتیاط کیا کر۔"

چندو نے سر گھما کر بڑے باوقار انداز میں دکان دار کو دیکھا۔ اسی لمحے پھر دو چھینکیں آئیں۔ اس کا باوقار انداز ملیامیٹ ہو گیا۔ چھینکیں ہوتی ہی ایسی چیز ہیں۔ لجلجا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ چندو نے دکان دار کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی مشکل سے سر ہلا کر گویا اس کی بات کی رسید عطا کی اور آگے چل دیا۔

"چندو کو زکام ہونے والا ہے۔" دکان دار نے بڑی فکر مندی سے اپنے پڑوسی کو مطلع کیا۔

"برسات میں اس طرح نکلنا ہی نہیں چاہیے۔" دوسرے دکان دار نے تبصرہ کیا "یہ زکام بہت پریشان کرتا ہے۔"

"اور کیا مگر چندو کو کون سمجھائے۔ بے پروا ہے بے پروا۔ بیمار ہو گا تو پتا چلے گا۔"

"ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے یار۔ تجھے تو پتا ہے' وہ باجی کی جان ہے--- اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔"

چندو کو ان تبصروں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ دین محمد کی دکان کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔



اس علاقے میں دین محمد کی دکان سب سے زیادہ چلتی تھی۔ مشہور تھا کہ کسی چیز کی بھی ضرورت ہو' وہ دین محمد کی دکان پر ضرور ملے گی۔ دین محمد بیٹے کی نعمت سے محروم تھا اور اب دکان اس سے اکیلے سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد اسے اپنے مطلب کا ایک ایمان دار لڑکا مل گیا۔ یہ تین دن پہلے ہی کی بات تھی۔ لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت تندرست اور توانا تھا۔ بڑی بڑی بوریاں اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھ دینا اس کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ دین محمد نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے اسے رکھ لیا۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے دین محمد کو خیال آیا کہ بادام اور پستے جس طرف رکھے ہیں' وہاں تو ٹپکا لگتا ہے۔ اس نے جا کر دیکھا۔ چیزیں ٹپکے سے محفوظ رہی تھیں مگر سیلن کا اثر بہرحال ہوا تھا۔

دین محمد نے باہر دیکھا۔ دھوپ نکل آئی تھی "دیکھ بیٹا کامل' یہ ڈرائی فروٹ کی بوریاں باہر دھوپ میں رکھ دے۔" اس نے لڑکے سے کہا "اور پھر یہ جو پیچھے ٹپکے کا پانی جمع ہے' اسے سوت کر ذرا پوچھا لگا دے۔ میں اتنے میں گھر سے کھانا لے کر آتا ہوں۔ فرش بالکل خشک کر دینا۔"

"اچھا بھائی جی!" کامل نے کہا۔

دین محمد چلا گیا۔ کامل نے پچھلے حصے میں جا کر ڈرائی فروٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں بادام پستے اور اخروٹ کی گری ایسی چیزیں تھیں' جو سیلن سے متاثر ہوئی تھیں۔ اس نے حسب توفیق پہلے چکھنے کی رسم ادا کی پھر ایک ایک کر کے بوریاں باہر لایا۔ انہیں دھوپ میں رکھنے کے بعد اس نے تینوں چیزیں تھوڑی تھوڑی سی جیب میں رکھیں اور

پانی سوتنے، پوچا لگانے اور فرش خشک کرنے کے لئے اندر چلا گیا۔ اسے چندو کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا!



چندو پہلے تو ٹھٹکا۔ پھر اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ آنے والی دو چھینکیں اس کے سسٹم سے خود بہ خود حذف ہو گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر تینوں بوریوں کا معائنہ کیا۔ بادام، پستے اور سب سے بڑھ کر اخروٹ کی گری۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

چندو ندیدا نہیں تھا اور یہ بھی نہیں کہ ڈرائی فروٹ اس کے لئے خواب جیسی کوئی چیز ہو۔ باجی یہ سب چیزیں اسے روز ہی کھلاتی تھیں مگر ہر چیز حساب کتاب سے ملتی تھی۔ جب کہ چندو کا جی چاہتا کہ ایک بار تو ان چیزوں سے لبالب بھر جائے۔

چندو بے حد لاڈلا تھا۔ باجی اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مگر وہ اسکول ٹیچر بھی تھیں۔ کلاس میں بھی وہ بہت اچھا لیکچر دیتی تھیں۔ جس وقت وہ چندو کو سمجھاتیں، ایسا ہی لگتا کہ کلاس کو کچھ ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایسے میں پڑوسی ایک دوسرے سے کہتے۔ باجی چندو کی کلاس لے رہی ہیں۔

باجی گن کر چندو کو سات بادام، سات پستے اور تین اخروٹوں کی گری دیتیں۔ اس کے نتیجے میں چندو کی طلب بھڑک اٹھتی تو وہ اسے سمجھاتیں "دیکھو چندو، میرے بیٹے، اعتدال بڑی چیز ہے۔ اعتدال ہر نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ اعتدال میں ہی عافیت ہے۔"

چندو اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں التجا سجائے انہیں تکتا رہتا۔ "بیٹے" آدمی اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو بڑی سے بڑی نعمت کو بھی اپنے لیے زحمت بنا لیتا ہے۔" باجی کا لیکچر جاری رہتا "اب اخروٹ کی گری ہی کو لے۔ زیادہ کھائے گا تو پاخانے میں خون آنے لگے گا۔ ڈاکٹروں کے چکر لگیں گے۔ کڑوی دوائی ملے گی اور طبیعت ٹھیک ہونے تک کھانے کی چھٹی۔ بادام بھی گرمی کرتا ہے۔ حکما نے سات بادام کا فائدہ بتایا ہے اور اس کے بعد ہر بادام فائدہ کم کرتا اور نقصان بڑھاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر باجی چندو کی آنکھوں میں جھانکتیں مگر وہاں التجا کے اور گہرے رنگ نظر

آتے۔ یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آتا" پھر یہ بھی تو دیکھ کر تیرے ماں باپ بہت امیر تو نہیں ہیں نا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اچھا کھاتے پیتے پہنتے ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ اتنا تو نہیں ہے کہ میں تیرے لیے ڈرائی فروٹ کی بوریاں لاسکوں۔" اچانک ان کا لہجہ تیز ہو جاتا "اور اتنا ہو تو بھی میں اتنا کھلا کر تجھ پر ظلم تو نہیں کر سکتی۔ ماں ہوں تیری" پھر اس کی آنکھوں کو دیکھ کر وہ موضوع ہی بدل دیتیں "اچھا، اب میں تیرے لیے بالائی لاتی ہوں۔"

سو ڈرائی فروٹ کی بوریاں دیکھ کر چندو کو ایسا لگا کہ اس کا خواب سچا ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ اخروٹ کی گری پر پل پڑا۔ مگر یہ نہیں تھا کہ بادام اور پستوں کے معاملے میں اس کے کفران نعمت کیا ہو۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش ہی نہیں رہا۔

اچانک کسی نے اس کی گردن پکڑلی۔ گرفت بہت سخت تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گردن پکڑنے والا کوئی جان دار آدمی ہے۔ چندو کے لئے یہ بات نئی تھی۔ آج تک کسی کو اس طرح کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

چندو نے جھرجھری سی لی، پھر زور لگایا۔ اس کی گردن آزاد ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کامل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے بڑا بھی تھا اور جان دار بھی۔ چندو بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

ابے ...... باپ کا مال سمجھ کر کھائے جا رہا ہے۔" کامل غرایا۔ "ایک ایک پیسہ نکلواؤں گا تیرے باپ سے۔" اس نے پھر چندو کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

چندو بہت غیر محسوس طور پر تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ گردن ہاتھ میں نہ آنے کی وجہ سے کامل کا توازن تھوڑا سا بگڑا۔ اسی لمحے چندو نے ایک ٹکر اس کے سینے پر رسید کردی۔ کامل کم از کم چار فٹ پیچھے جا گرا۔ اب وہ چت پڑا آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔

کامل کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس ٹکر میں اتنی قوت تھی کہ اسے لگا، دو ایک پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے آسمان پر اسے ستارے ناچتے نظر آ رہے تھے۔ مقام شکر تھا کہ اس وقت کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ دکان دار بھی مصروف تھے۔ کسی نے اس کا یہ توہین آمیز تماشا نہیں دیکھا تھا۔

چندو مداخلت کار سے نمٹ کر پھر ڈرائی فروٹ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کا

انہماک دیدنی تھا۔

کامل کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ جب تک وہ بے بس پڑا آسمان کو تک رہا تھا' تب تک تو خیریت تھی مگر ذرا سا سنبھلتے ہی اس کا وجود غصے اور اشتعال سے بھرنے لگا۔ وہ اٹھا اور اس نے سر جھٹک کر دماغ پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کیا۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا کہ چندو پھر اسی مشغلے میں منہمک ہوگیا ہے۔

وہ دبے پاؤں چندو کی طرف بڑھا۔ اس نے مضبوطی سے چندو کے دونوں کان تھام لیے اور غرا کر کہا "اب دیکھتا ہوں بیٹا تجھے۔ دماغ ٹھیک کردوں گا۔"



باجی بس سے اتریں اور اس سڑک کی طرف چل دیں' جو ان کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے چل رہی تھیں۔ ان کے قدم دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے۔ اسکول کے بچے انہیں تھکا دیتے تھے۔

مگر پھر جو انہوں نے نظریں اٹھا کر سامنے کی سمت دیکھا تو پہلے ان کے قدم تیز ہوئے پھر وہ باقاعدہ دوڑنے لگیں۔ برقع پہنے ہوئے دوڑنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو دوڑنا ہی ناقابل تصور تھا۔ مگر جو منظر انہوں نے دیکھا تھا' اس کے بعد انہیں کسی بات کا خیال نہیں رہا تھا۔

وہ ہانپنے لگیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھیں۔ ارے بدبخت' یہ کیا کر رہا ہے۔ میرے نازوں کے پلے بیٹے پر ہاتھ اٹھاتا ہے مگر ہانپنے کی وجہ سے ان کے لیے منہ سے ایک لفظ نکالنا بھی ناممکن تھا۔ البتہ یہی الفاظ ان کے اندر چلا رہے تھے۔ جسم کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

وہ آندھی طوفان کی طرح کامل کے سر پر پہنچیں۔ جو مضبوطی سے چندو کے دونوں کان تھامے اس سے اہانت آمیز گفتگو کر رہا تھا۔ کبھی وہ اس کے پھول سے رخساروں پر تھپڑ بھی رسید کر دیتا۔ اسے پتا ہی نہ تھا کہ کوئی سائیکلون اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

باجی نے اپنا بیگ اندھا دھند گھما کر مارا جو کامل کے سر پر لگا۔ اس افتاد سے

بوکھلا کر اس نے چندو کے کان چھوڑ دیے۔ اتنی دیر میں اس کے جسم کے مختلف حصوں پر تین چار بار بیگ کا ہنٹر پڑ چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر اور چہرے کو پناہ دیتے ہوئے "طوفان کے مرکز" کو دیکھا۔ برقع پوش کو دیکھ کر وہ اور بوکھلا گیا۔

"آ..... آپ ..... کیوں مار رہی ہیں ..... مم .... مجھے؟"

"میں تو تیرا خون پی جاؤں گی الو کے پٹھے۔" باجی دہاڑیں۔

"بب ...... بات کیا ہے؟"

"میرے بیٹے کو مار رہا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بات کیا ہے۔"

"..... یہ ہمارا ڈرائی فروٹ کھا رہا تھا۔" کامل نے فریاد کی۔

"تو ہے کون؟"

"میں اس دکان پر ملازم ہوں۔"

"جو جرات اس دکان کا مالک نہیں کرسکتا' وہ تو نے ملازم ہو کر کی ہے۔" باجی نے پھر بیگ کا کوڑا چلایا۔

اس دوران چندو کبھی باجی کو دیکھتا اور کبھی کامل کو۔ اس کی نظروں میں اور اس کے انداز میں بڑی معصومیت تھی۔

"دکان میری ذمے داری ہے اماں۔" کامل نے کہا۔

"اماں ہوگی تیری ماں۔" باجی کا غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ باجی تھیں سب کی۔ انہیں اماں کہنے کی ہمت کبھی کسی بچے نے بھی نہیں کی تھی" اور یہ دکان تیری ذمے داری ہے ...... ایں ۔ دین محمد کہاں ہے۔"

"وہ جی کھانا لینے گھر گئے ہیں۔"

"خیر..... تجھے تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" باجی پھر شروع ہوگئیں۔



دین محمد ٹفن کیریر لے کر گلی سے نکلا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسا منظر دیکھنے کو ملے گا۔ دکان کے سامنے باجی بیگ کو کوڑے کی طرح گھما گھما کر کامل کو مار رہی تھیں اور کامل بندروں کی طرح اچھل کود کرکے خود کو بچانے کی

کوشش کر رہا تھا۔ سب سے بڑا ستم یہ کہ چندو ڈرائی فروٹ کی تین بوریوں کو باری باری اور بے حد خشوع و خضوع سے نواز رہا تھا۔

یہ ہوش ربا منظر دیکھتے ہی دین محمد کے تو اسپرنگ لگ گئے۔ وہ اتنا تیز دوڑا کہ زندگی میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ پھرتی سے باجی اور کامل کے درمیان آگیا۔ اس کے نتیجے میں باجی کے بیگ نے اس کی بھی تواضع کرڈالی۔ ہانپ رہا تھا۔ ابتدا میں اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

باجی کو تو کئی سیکنڈ بعد یہ احساس ہوا کہ ان کے سامنے دین محمد آگیا ہے۔ انہوں نے ہاتھ روکا۔

"کیا ہوا باجی؟ بات کیا ہے؟" دین محمد نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟" باجی نے جواب دینے کے بجائے جواب طلبی کی۔

اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھا ہے باجی!"

"ہاتھ بٹانے کے لئے یا شرفا کے بچوں پر ہاتھ چھوڑنے کے لیے؟"

"کیا مطلب؟ آپ بات تو بتائیں باجی۔"

"یہ میرے چندو کو مار رہا تھا۔ اس کے دونوں کان ایسے پکڑے تھے قصائی نے کہ ....." باجی کا گلا رندھ گیا۔

دین محمد نے ایک نظر چندو کو دیکھا' جو اس وقت اخروٹ کی گری سے کام و دہن کی تواضع کر رہا تھا۔ پھر وہ کامل کی طرف مڑا' جو حواس باختہ کھڑا تھا "کیوں بھئی کامل' یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تو چندو کو مار رہا تھا۔"

"بھائی جی' یہ ڈرائی فروٹ ایسے کھا رہا تھا' جیسے سونف کی پھنکی لگا رہا ہو۔ میں نے روکا تو اس نے مجھے ٹکر مار کر گرا دیا۔" کامل نے فریاد کی۔

باجی نے پھر بیگ گھمایا "تجھے تو میں ٹھیک کرکے رہوں گی۔"

"باجی' معاف کردیں۔ نیا ہے نا۔" دین محمد نے سفارش کی۔ "نہ آپ کو جانتا ہے' نہ چندو سے واقف ہے۔ معاف کردیں .....!"

"اسے معاف کردوں۔ یہ چندو کے ساتھ بدسلوکی کر رہا تھا جب کہ چندو کو کبھی میں نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا۔ میں تو اسے معاف نہیں کروں گی۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں اسے نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔" دین محمد نے خشمگیں لہجے میں کہا پھر وہ کامل کی طرف مڑا اور بائیں آنکھ دباتے ہوئے بولا "جا اب بھوکا مر۔ مجھے کیا۔ میں تو تین دن کے پیسے دے کر تجھے رخصت کردوں گا۔ اب تو جان اور تیرے بھائی بہن جانیں۔"

کامل نے جو اشارہ پایا تو پوری اداکاری شروع کردی "بھائی جی' یہ ظلم نہ کرو۔ ہمارے تو گھر میں فاقے ہو جائیں گے۔"

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔" دین محمد نے سرد لہجے میں کہا "تو نے باجی کو خفا کیا' چندو کو مارا۔ مجھے اب تجھ پر رحم نہیں آسکتا۔" حالاں کہ وہ اتنا جان دار ملازم نہیں کھونا چاہتا تھا۔

اتنی دیر میں باجی کے چہرے کے عضلات نرم ہوچکے تھے۔ وہ کامل کی طرف مڑیں "تو بہت غریب ہے بیٹے؟" انہوں نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

کامل نے منہ لٹکایا اور اثبات میں سرہلا دیا "اب ہمارے گھر پھر فاقے شروع ہو جائیں گے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی "ہم سات بھائی بہن ہیں باجی۔" اس بار اس نے باجی کو اماں کہنے کی غلطی بھی نہیں کی۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" باجی نے کہا اور دین محمد کی طرف مڑیں۔ "اسے نہ نکالو۔ یہ تو ظلم ہوگا۔"

"ظلم تو اس نے کیا ہے۔ میں اسے نہیں رکھوں گا۔" "میری خاطر رکھ لو اسے۔"

خاصی رد و قدح کے بعد دین محمد راضی ہوگیا "جا ..... تجھے باجی کی خاطر بخشا۔ چندو بابا کو پیار کر۔"

کامل نے فوراً چندو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی پیشانی پر ایک بوسہ بھی رسید کردیا "سوری چندو بابا!"

اتنی دیر بعد پہلی بار باجی نے چندو کی طرف دیکھا "ارے چندو' اتنی بدتمیزی! کتنی بار تجھے سمجھایا کہ پوچھے بغیر کبھی کسی کی چیز نہیں کھاتے۔ تجھے تو میں گھر چل کر دیکھوں گی۔ چل اب سیدھا گھر چل۔ چل فوراً۔"

چندو نے بڑی معصومیت سے باجی کو دیکھا' جیسے اس کی سمجھ میں ان کے غصے کا سبب نہیں آرہا ہو۔ پھر اس نے کامل' دین محمد اور ان تمام لوگوں کو دیکھا' جو اتنی دیر میں جمع ہوگئے تھے۔ اس کے بعد اس نے باجی کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا کہ وہ اسے اتنے سارے لوگوں کے سامنے ڈانٹ رہی ہیں۔

"سنا نہیں تو نے۔ گھر چل۔"

اس بار چندو پلٹا اور سر جھکاتے ہوئے واپس چل دیا۔ اس کی چال سے شرم ساری کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے باجی بھی چل دیں۔

ان کے جانے کے بعد دین محمد نے شرمندگی سے جمع ہونے والوں کو دیکھا۔ وہ سب محلے ہی کے لوگ تھے۔

"یہ سب کیا تھا بھائی جی؟" کامل نے دین محمد سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت ہی نہیں' جانے اور کیا کیا تھا۔

"تو نہیں سمجھا۔ ان باجی کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی ان کے چندو کو ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے جب کہ تو نے تو اسے مارا تھا۔"

"مگر بھائی جی ...."

"اب تو دماغ نہ کھپا۔ جا اپنا کام کر۔" دین محمد نے اسے ڈپٹا۔ وہ دکان میں چلا گیا تو دین محمد نے تماشائیوں سے کہا "ویسے یہ زیادتی ہے باجی کی۔ چندو نے میرا بہت نقصان کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوریوں کا جائزہ لیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بادام' پستے اور اخروٹ کی گری میں کتنی کمی واقع ہوئی ہے۔

"کیوں بھئی' کیا نقصان ہوا ہے؟" ایک صاحب نے پوچھا۔ وہ باجی کی گلی میں ہی رہتے تھے۔

"اجی' یہ بادام' پستے اور اخروٹ کی گری' سب مہنگی چیزیں ہیں۔ کتنا کھا گیا کم بخت ...."

"دینو' زبان سنبھال کے ....." ایک صاحب نے اسے للکارا۔ "چندو ہمارے لئے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔"

"اسے تو اللہ نے بیٹے سے محروم رکھا ہے۔ یہ کیا جانے بیٹے کی محبت...." ایک

اور صاحب بولے۔

"یہ سب کہنا آسان ہے۔ آپ لوگوں کا کیا بگڑا ہے۔ نقصان تو میرا ہوا ہے۔" دینو کا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔

"کتنا نقصان ہوا ہے' بتا دو۔ ہم پورا کردیں گے۔" ایک اور صاحب بولے "مگر اب چندو کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہنا۔"

دین محمد بہت اچھا دکان دار تھا۔ جانتا تھا کہ جھگڑالو پن دکان داری کو تباہ کر دیتا ہے۔ وہ تو کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا اور یہاں تو معاملہ چندو کا تھا' جس سے پورا علاقہ محبت کرتا تھا۔ دو تین سو روپے کی خاطر دکان چوپٹ کرنا سراسر خسارے کا سودا تھا۔ اس نے جلدی سے پینترا بدلا "کیسی باتیں کرتے ہیں اشفاق بھائی۔ بیٹے کی اہمیت کو مجھ سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔ میں اس چیز کے پیسے لوں گا' جو چندو نے کھائی ہو۔ توبہ توبہ۔" وہ اپنا منہ پیٹنے لگا۔



ٹھیک اسی وقت شہر کے ایک اور علاقے میں' ایک گھر میں سلمیٰ بیگم میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ بچے اسکول سے واپس آکر ہاتھ منہ دھو رہے تھے "آجاؤ بھئی' کھانا کھالو۔" انہوں نے پکارا۔

تین سالہ فیاض پہلے ہی اچھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "امی جلدی سے کھانا دیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"ذرا سا صبر کرلو بیٹے۔ آپا اور بھائی آجائیں۔" سلمیٰ بیگم نے اسے تسلی دی۔

اتنی دیر میں اسکول سے آنے والے دونوں بچے بھی ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھے۔ سلمیٰ بیگم نے ڈش پہلے نو سالہ میمونہ کی طرف بڑھائی "آپ لیں نا امی۔" میمونہ نے کہا۔

"تم نکالو۔ میں لے لوں گی۔"

میمونہ نے ڈش کا ڈھکنا اٹھایا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر مایوسی جھلکی مگر فوراً ہی وہ تاثر مٹ گیا۔ سلمیٰ بیگم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دیں

مگر اس مسکراہٹ میں دکھ بھی تھا۔ ان کی بچی وقت سے پہلے بڑی اور سمجھ دار ہوگئی تھی۔

میمونہ نے پلیٹ میں سالن نکالا اور روٹی لی پھر اس نے ڈش چھ سالہ اشعر کی طرف بڑھا دی "امی ....!" اشعر کے لہجے میں احتجاج تھا۔

سلمیٰ بیگم سب جانتی تھیں۔ ان کا دل کٹ کر رہ گیا "بیٹے' میری جان' کھانا کھالو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔"

اشعر نے خاموشی سے سالن نکالا ..... بہت تھوڑا سا۔ اس کے انداز میں بے دلی تھی۔

"اور لو...... اچھی طرح کھانا کھاؤ۔"

"بس امی' زیادہ بھوک نہیں ہے۔"

سلمیٰ بیگم کو اندازہ تھا کہ بھوک کتنی تھی .... اور اس کے اڑنے کا سبب کیا ہے۔ وہ ملول ہو کر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا' روٹی لی اور پہلا نوالہ توڑ کر فیاض کی طرف بڑھایا "لو بیٹے' منہ کھولو۔"

"امی' میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ مجھے گوشت چاہیے۔" تین سالہ فیاض کو حالات سے غرض نہیں تھی۔ صبر کا مفہوم اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بس دل کی بات کہہ رہا تھا۔

"آج یہ کھالو۔ میرا وعدہ ہے کہ کسی دن تمہیں جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا "اب منہ کھولو۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ آج میں گوشت کھاؤں گا بس۔"

"بیٹے' کچھ دن صبر کرلو۔ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گی۔ اچھا' کل میں گوشت سے بھی زیادہ مزے کی ایک چیز پکاؤں گی۔"

"گوشت سے زیادہ مزے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں تو گوشت ہی کھاؤں گا۔" فیاض نے ضد کی۔

سلمیٰ بیگم نے بہلا پھسلا کر فیاض کو کھانا کھلایا۔ انہوں نے اصرار کر کے اشعر کو بھی ٹھیک طرح سے کھانے پر مجبور کیا۔ میمونہ نے خود ہی پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

"چلو' اب تم دونوں اپنے بیڈ روم میں جا کر سو جاؤ۔" سلمیٰ بیگم نے دونوں بیٹوں سے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے اماں!" فیاض بولا۔

"ٹھیک ہے' اشعر تم سو جاؤ۔ پھر اٹھ کر ہوم ورک کرلینا۔"

اشعر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میمونہ نے برتن دھلوانے میں ماں کی مدد کی۔ فیاض ادھر ادھر ڈولتا پھرا۔ پھر اس نے کہا "امی' میں آنگن میں سائیکل چلا لوں؟"

"چلا لو بیٹے۔"

سلمیٰ بیگم برتن دھلوانے اور کچن کی صفائی سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ کال بیل بجی۔ انہوں نے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ان کی پڑوسن صفیہ کھڑی تھیں۔ سلمیٰ بیگم ابھی چند روز پہلے ہی ان کے گھر گئی تھیں۔ صفیہ پہلی بار ان کے گھر آئی تھیں۔

"آیئے نا..... تشریف لایئے۔" سلمیٰ بیگم نے بے حد تپاک سے کہا۔

صفیہ اندر آگئیں "کیسی ہیں آپ؟ میں نے سوچا آپ سے مل لوں۔ اس وقت فرصت ہے۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ کبھی کوئی کام نہ ہو تو میرا بھی دل گھبرانے لگتا ہے۔ آیئے' ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر صفیہ کی آنکھیں پھیل گئیں "گھر خوب ڈیکوریٹ کیا ہے آپ نے۔" انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا "صوفے تو بہت ہی خوب صورت ہیں۔"

"جی ہاں۔"

صفیہ ٹی وی ٹرالی کی طرف متوجہ ہوگئیں "اوہ ..... یہ سونی ۲۶ انچ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" سلمیٰ بیگم کو وحشت ہونے لگی "یہ بتائیں' چائے پئیں گی یا ٹھنڈا؟"

"تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں تو باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"باتیں کرلیں گے۔ آپ بتائیں تو۔"

"چائے پلا دیں۔"

سلمیٰ بیگم کچن میں گئیں اور چائے بنا کر لے آئیں۔ چائے کی پیالی انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"آپ نہیں پئیں گی؟"

"میں تو ابھی کھانے کے بعد چائے پی کر بیٹھی ہوں۔ ایسی عادت ہے کہ کھانے کے بعد چائے کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔ حالانکہ وہ پریشان تھیں۔ چائے کی پتی اور چینی دونوں ختم ہونے والی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ صبح تک کام چل سکتا تھا۔

"آپ کا گھر اور گھر کی ہر چیز مجھے بہت اچھی لگی ہے۔" صفیہ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "آپ کا ذوق بھی بہت اچھا ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"اللہ پیسہ دے تو ذوق بھی دے ورنہ میں نے تو بڑے بڑے بے ڈھنگے لوگوں کے پاس دولت ضائع ہوتے دیکھی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے بہن۔ اس کا کرم ہے۔" سلمیٰ بیگم نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دباتے ہوئے کہا۔



عین اسی وقت شہر کے ایک بہت بڑے یتیم خانے میں بچوں کو کھانا دیا جا رہا تھا۔ بچوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ باورچی پلیٹ میں پتلی دال ڈال کر رکھے جا رہا تھا۔ یتیم خانے کا ایک ملازم سامنے آنے والے بچے کو روٹی پکڑاتا۔ بچہ دال کی پلیٹ اٹھاتا اور ایک طرف جا بیٹھتا۔

اصغر نے پہلا لقمہ توڑا ہی تھا کہ اس کی نظر اختر پر پڑی۔ وہ کھانا لینے بھی نہیں گیا تھا اور منہ پھلائے بیٹھا تھا "تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ مجھے یہ پتلی دال نہیں کھانی۔" اختر نے تند لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا کھاؤ گے؟"

"میں گوشت کھاؤں گا۔"

"وہ کہاں سے ملے گا؟"

"مجھے پتا ہے' باورچی خانے میں ہر روز گوشت ہوتا ہے۔ گوشت پکتا ہے۔"

"مگر وہ ہمارے لئے نہیں ہوتا۔" اصغر نے دکھے دل سے کہا۔

"میں ابھی بات کروں گا۔"

اصغر نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔

اختر اور اصغر میں ابتدا ہی سے دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ ان کی عمر نو سال کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے ہوش یتیم خانے ہی میں سنبھالا تھا۔ اس سے پہلے کا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا اسی لئے ان کی دوستی پر سب حیرت کرتے تھے۔ اختر بہت تیز و طرار اور چالاک تھا۔ وہ ضدی اور خود سر بھی تھا اسی لیے اس کی اکثر پٹائی بھی ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اصغر ڈرپوک تھا۔ وہ

کسی سے الجھتا ہی نہیں تھا۔

تمام بچے نمٹ گئے۔ کاؤنٹر خالی ہو گیا۔ کاؤنٹر پر البتہ دال کی پلیٹیں اب بھی رکھی تھیں۔ اختر اٹھا اور اس طرف چل دیا۔

باورچی نے اسے حیرت سے دیکھا "تو نے کھانا نہیں لیا۔"

"مجھے گوشت کھانا ہے۔"

باورچی کی آنکھوں میں ایک پل کو حیرت جھلکی اور پھر غصے کی چمک نظر آئی "دماغ ٹھیک ہے تیرا؟"

"ٹھیک ہے۔ بس، میں گوشت کھاؤں گا۔"

"تو کھالینا۔ پہلے اپنا گوشت کاٹ کر مجھے دے تاکہ وہ میں تیرے لئے پکا دوں۔" باورچی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"گوشت تو پکا ہے۔" اختر نے بڑے سکون سے کہا۔ "تم لوگوں نے کھایا بھی ہے۔ بچے ہوئے میں سے مجھے بھی دے دو۔ تمہارا کیا جائے گا۔"

"یہ جائے گا کہ تیری دیکھا دیکھی سب مانگیں گے اور یتیم خانہ مچھلی مارکیٹ بن جائے گا۔"

"تم مجھے نہیں دو گے تو بھی سب کو معلوم ہو جائے گا۔" اختر نے دھمکی دی۔

"دھونس جماتا ہے۔" باورچی کو غصہ آگیا "جا.... جا کے شاہ صاحب سے بات کر۔ وہ تجھے گوشت کھلائیں گے اچھی طرح۔"

اختر کھسیا گیا۔ شاہ صاحب یتیم خانے کے منتظم تھے۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔ ان کے کمرے سے کسی بچے کا بلاوا آتا تو اس کا پیشاب خطا ہو جاتا۔ شاہ صاحب بڑی بے دردی سے مرمت کرتے تھے اور سچ مچ کھال اتار کر رکھ دیتے تھے۔

"یہ دال لے جا، میں تجھے روٹی دیتا ہوں۔ جا، کھانا کھا لے۔" باورچی نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں کھانی مجھے دال۔" اختر نے چلا کر کہا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا گیا اور اپنی جگہ جا بیٹھا۔

"کھا لو یار۔ تمہارے بھوکے رہنے کا کسی کو دکھ نہیں ہوگا...... سوائے

میرے۔" اصغر نے بڑے پیار سے کہا۔

"تو چپ رہ۔ میں دال نہیں کھاؤں گا۔"



گھر پہنچ کر باجی نے واقعی چندو کی اچھی طرح خبر لی۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ تو ان کا لاڈلا تھا۔ وہ ان کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور زندگی کی رونق تھا۔ وہ تو اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ کسی بڑی سے بڑی شرارت پر بھی انہوں نے کبھی اسے مارا نہیں تھا۔ معاملہ ناقابل برداشت ہوتا تو وہ اسے خوب ڈانٹتیں اور کبھی سزا بھی دیتیں۔ سخت ترین سزا وہ اسے آج دینے والی تھیں۔

وہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ چندو بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ وہ ان کا ایسا فرماں بردار تھا کہ کبھی انہیں کوئی بات دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ ان کی ہر بات نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ جانتا تھا۔

اس وقت بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے اور باجی غصے میں ہیں۔ وہ سر جھکائے چلتا ہوا گھر آیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باجی نے کہا "چندو، آپ میرے کمرے میں چلیں۔"

چندو مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ باجی نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اپنی مسہری پر بیٹھ گئیں۔ چندو ان کے سامنے کھڑا تھا "چندو، آج آپ نے بری حرکت کی ہے۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی ہے۔"

چندو انہیں دیکھ رہا تھا مگر جب انہوں نے چندو کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"آپ نے باہر بلا اجازت کسی کی چیز کھا کر کیا ثابت کیا۔" باجی شدید غصے کے عالم میں آپ جناب کرتی تھیں "یہی ناکہ آپ کے ماں باپ نے آپ کی اچھی تربیت نہیں کی اور یہ بھی کہ آپ کو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ آپ بھوکے رہتے ہیں اس لئے آپ کو چوری کرنی پڑتی ہے۔" وہ کہتے کہتے رکیں "جی ہاں، یہ چوری ہے جناب۔ بغیر اجازت کے کسی کی چیز لینا چوری ہے اور اسلام میں اس کی سزا ہاتھ کاٹنا

ہے۔ سمجھے کچھ۔"

چندو شرم سار کھڑا تھا۔

"لیکن آپ سزا کے بغیر سمجھیں گے بھی نہیں۔ ہے نا بیٹے۔ تو آج پھر آپ کو سخت سزا ملے گی۔ اب آپ ایسا کیجئے کہ اس کونے میں جایئے اور دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جایئے اور جب تک میں نہ بلاؤں، یوں ہی کھڑے رہیے۔"

چندو خاموشی سے کمرے کے اس کونے میں چلا گیا، جس کی طرف باجی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ اس کے انداز تک سے شرمندگی ہویدا تھی۔ باجی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کا دل فخر اور محبت سے سرشار ہوگیا۔ آج کل ایسے سعادت مند بیٹے کہاں ہوتے ہیں۔ چوں بھی نہیں کی بچے نے ...... اور کونے میں جاکر کھڑا ہوگیا۔

مگر چند منٹ بعد باجی کا دل دکھنے لگا۔ چندو ساکت وصامت کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تھا، نہ اس نے پہلو بدلا تھا۔ معصوم بچے کو ایسی کڑی سزا! باجی کو اپنا دل کٹتا محسوس ہوا۔ ان کا جی چاہا کہ اسے بلائیں اور لپٹا کر پیار کریں مگر نہیں۔ انہوں نے سوچا، یہ سزا ضروری ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ باہر کسی کو چندو سے نقصان پہنچا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لئے سزا ضروری ہے۔ مگر اب ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے یوں کھڑا دیکھتی رہیں۔ وہ ادھر ادھر پھرتی پھریں۔ سوچا کوئی کام ہی کرلیں مگر کچھ نہیں سوجھا۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ چندو نے جانے کتنا نقصان کیا ہوگا۔ اس کی تلافی پہلے کر دیں۔ انہوں نے بیگ کو ٹٹولا۔ اس میں چھ سو سے زائد روپے تھے۔ بیگ لے کر گھر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چندو سے کہا "دیکھو چندو، میں تیرا کیا دھرا بھگتنے جا رہی ہوں۔ تو یہاں سے ہلا بھی تو بہت پٹائی کروں گی۔ میں واپس آؤں تو یہیں کھڑا ملے تو۔ سمجھ گیا۔" اب جب کہ ان کا غصہ سرد ہو چکا تھا تو آپ جناب کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔

چندو نے پلٹ کو ایک نظر انہیں دیکھا، سرہلایا اور دوبارہ پہلے ہی کی طرح کھڑا ہوگیا۔ باجی گھر سے نکل آئیں۔ گلی میں چند قدم چلنے کے بعد انہیں خیال آیا کہ چندو موقع پا کر کونے سے ہٹ تو نہیں جائے گا۔ ذرا چل کر دیکھا جائے۔ حالاں کہ انہیں

چندو کی فرماں برداری پر اندھا یقین تھا مگر تربیت کرنے والے کو ایسے یقین پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ گھر کی طرف پلٹیں......

"باجی، چندو کیسا ہے؟" حسینہ نے انہیں پکار کر پوچھا۔ وہ اسی وقت دروازے پر آئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ بس ذرا بدتمیز ہوگیا ہے۔"

"ارے باجی، اتنا تو نیک ہے۔"

باجی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔ صحن میں پہنچ کر وہ دبے قدموں کمرے کی طرف گئیں اور جھانک کر دیکھا۔ چندو اسی طرح کھڑا تھا، جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ وہ مسکرائیں اور پراعتماد قدموں سے گھر سے نکل آئیں۔



باورچی نظام نے ظاہر تو نہیں کیا لیکن درحقیقت وہ اختر کی ضد سے ڈر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اختر کتنا سرکش اور سخت جان لڑکا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ معاملات کے بگڑنے سے پہلے شاہ صاحب کو سب کچھ بتا دینے ہی میں عافیت ہے۔ اس نے اس سلسلے میں فیضو سے بات کی "دیکھو فیضو، شاہ صاحب کو یہ بتانا ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے یہاں۔" فیضو نے بے پروائی سے کہا "ایسا ہوگا تو لڑکے دھمکی بھی دیں گے۔ ہے تو یہ زیادتی نا۔" یہ کہتے ہی فیضو کو احساس ہوا کہ اس نے بہت مخدوش بات کہہ دی ہے۔ شاہ صاحب تو اس کی بھی کھال کھینچ دیں گے۔ اس نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی "یہ دھمکیاں تو چلتی رہتی ہیں مگر کبھی کچھ ہوا نہیں۔"

"لیکن اس لڑکے کے تیور بہت خراب ہیں۔"

"ارے وہ اختر! وہ تو پدا ہے پدا۔ یہاں تو بڑے بڑے ٹھیک ہو گئے۔"

"وہ ہے تو چھوٹا مگر میں جانتا ہوں، وہ بہت خطرناک ہے۔" نظام نے کہا۔

"تو بھائی' تم خود ہی شاہ جی سے بات کرلو۔"

"شاہ صاحب تو ابھی ہیں نہیں۔ میں چاہتا ہوں' تم ذرا اختر پر نظر رکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ میں کرلوں گا۔"

فیضو اختر کی تلاش میں نکلا۔ سب سے پہلے تو یہ پتا چلا کہ اختر نے صرف کھانے پینے سے ہی نہیں' پڑھنے سے بھی انکار کردیا ہے۔ وہ کسی سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ ہر بات کے جواب میں وہ یہی کہتا تھا کہ میں تو گوشت کھاؤں گا۔

فیضو نظام سے متفق ہوگیا۔ معاملہ واقعی خطرناک تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد نظام کو رپورٹ دیتا رہا۔

شام کو نظام نے اسلام الدین سے جو شاہ صاحب کے دفتر کا انتظام سنبھالتا تھا' شاہ صاحب کے متعلق پوچھا "شاہ صاحب آ تو گئے ہیں۔" اسلام الدین نے بتایا "لیکن اس وقت ایک مہمان ہے ان کے پاس۔"

عام طور پر ایسے موقعوں پر شاہ صاحب کو ڈسٹرب نہیں کیا جاتا تھا لیکن نظام کے نزدیک اختر والا معاملہ ایمرجنسی کا تھا۔ جیسے جیسے رات کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا' اسے ہول چڑھ رہا تھا' اسے شاہ صاحب سے جلد از جلد ملنا تھا۔



دین محمد نے باجی کو روبرو دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس نے سوچا' شاید کامل کی برائی کی دوسری قسط منظر عام پر آنے والی ہے مگر پھر باجی کے چہرے کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ ان کے چہرے پر نرمی ہی نرمی تھی۔

"کیا حکم ہے باجی؟" اس نے پھر بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم یہ بتاؤ کہ چندو نے تمہارا کتنا نقصان کیا ہے۔"

"نقصان کیسا باجی۔ نقصان تو ضائع ہونے والی چیز کا ہوتا۔ جو پیٹ میں گیا' وہ نقصان تو نہیں کہلائے گا۔" دین محمد نے کہا "اور چندو تو میرے لیے بھی بیٹے کی طرح ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ اللہ نے مجھے بیٹے سے نہیں نوازا ہے۔" اس نے لہجے میں رقت سمونے کی کوشش کی۔

"یہ باتیں چھوڑو۔ چندو میرا بیٹا ہے' تمہارا نہیں۔ تھوڑے سے بادام پستے کے بدلے تم میرے بیٹے میں حصہ بٹانا چاہتے ہو۔" باجی نے خراب لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں باجی۔ بیٹا تو وہ آپ ہی کا ہے۔ ہم تو اسے دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔"

"یہ تمہاری محبت ہے۔" باجی نے نرم لہجے میں کہا "مگر میرے لیے تمہارا یہ نقصان پورا کرنا ضروری ہے۔"

دین محمد سمجھ گیا کہ باجی نہیں مانیں گی "اب میں حساب کیسے لگاؤں باجی۔ چندو نے تول کر تو نہیں کھایا تھا۔"

باجی سوچ میں پڑگئیں۔ بات دین محمد کی درست تھی "تم اندازے سے بتا دو۔ کمی بیشی ہم دونوں اللہ کے سامنے ایک دوسرے پر معاف کردیں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں' اس کی ضرورت ہی نہیں باجی۔ گھر کی بات ہے۔"

"ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں چندو کسی اور کی کوئی چیز کھائے۔"

"تو پھر جو جی چاہے' دے دیں۔" دین محمد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

باجی نے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے "اس کے بعد بھی اگر تمہارا حساب میرے طرف نکلے تو ابھی معاف کردو۔"

"یہ تو زیادہ ہیں باجی۔" دین محمد نے احتجاج کیا۔

"بس رکھ لو۔" باجی نے کہا "اب میں چلتی ہوں۔"

دین محمد انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

اس بار بھی باجی دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئیں اور کمرے کی طرف گئیں۔ چندو اسی طرح کونے میں کھڑا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ہلا بھی نہیں ہے۔ باجی نے بیگ ڈریسر پر رکھا اور مسہری پر بیٹھ گئیں۔ اب کے انہیں چندو پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ "چندو .... اے چندو۔" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پکارا۔

لیکن چندو نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے باجی کو گمان ہوا کہ چندو ان سے ناراض ہوگیا ہے۔ مگر فوراً ہی ان کے ذہن نے اس خیال کو رد کر دیا۔

انہوں نے چندو سے کہا تھا کہ جب تک وہ نہ کہیں' وہ ہلے بھی نہیں۔ وہ محض ان کی پکار پر پلٹ کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے اسے پلٹنے کو تو نہیں کہا تھا۔

"چندو' مڑ کر کھڑا ہو اور میرے طرف دیکھ۔"

چندو نے اس بار رخ ان کی طرف کر لیا لیکن نظریں نہیں اٹھائیں۔

"میری طرف دیکھ۔" باجی نے بڑے لاڈ سے کہا۔

اس بار چندو نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں اور انہیں دیکھا۔

"پتا ہے' میں دکان دار کو پیسے دے آئی ہوں۔ میرا چندو کوئی مفت کی چیز نہیں کھاتا ہے۔" باجی نے کہا "اور ہاں' دیکھ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

چندو نے سرہلا کر وعدہ کرلیا۔ اب تک اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

"مجھ سے ناراض ہے؟"

چندو نے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں سرہلایا۔

"ادھر آ' میں تجھے پیار کروں۔"

چندو دھیرے دھیرے باجی کو طرف بڑھا۔ باجی نے اسے لپٹاتے ہوئے ننھے منے بوسوں سے بھگو دیا۔ وہ اسے دیوانہ وار پیار کر رہی تھیں۔

پھر اچانک چندو دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا' اس نے دونوں اگلے پیر باجی کے کندھوں پر رکھے اور ان کے چہرے پر پیار کرنے لگا۔ وہ انہیں سچ مچ پیار کر رہا تھا' چاٹ نہیں رہا تھا۔ جانور تو عموماً" چاٹتے ہی ہیں۔ کوئی اس وقت اسے دیکھتا تو ایک لمحے کے لئے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا کہ وہ دنبہ ہے۔ وہ باجی کے رخسار پر تھوتھنی رکھ کر زبان نکالے بغیر انہیں پیار کر رہا تھا۔

"میرا بیٹا ...... میرا چندو ...... میری جان!" باجی کو اس پر لاڈ آنے لگا "چندو' مجھے ناچ کر تو دکھا۔"

چندو اترا' اس نے دوسری طرف رخ کیا اور چکتی ہلا ہلا کر اپنے مخصوص انداز میں تھرکنے لگا۔ باجی ہنستے ہنستے بے حال ہوگئیں۔ "چکتی تیری بہت بڑی ہوگئی ہے رے چندو۔ کچھ باقی جسم میں بھی لگالیا کر۔ کاش میرے پاس بہت پیسہ ہوتا اور میں تجھے خوب اچھی طرح کھلا پلا سکتی۔"

چندو پلٹ کر آیا اور ان کی پنڈلیوں پر پیشانی رگڑنے لگا۔



"آپ جیسے لوگ بڑے اجر کا کام کرتے ہیں۔" شاہ صاحب صدیقی صاحب سے کہہ رہے تھے "یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا' ان کی مدد کرنا حضور صلی الہ علیہ وسلم کو بہت پسند ہے۔"

"آپ خوش نصیب ہیں شاہ جی! سر پر ان کے آپ ہاتھ رکھتے ہیں۔ آپ ان کی دل جوئی کرتے ہیں۔" صدیقی صاحب بولے "ہم تو بس پیسے سے مدد کرتے ہیں اور پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ کبھی بہت جی چاہتا ہے کہ عملاً" بھی کچھ کروں۔ یہ لیجئے اس ماہ کا چیک۔"

شاہ صاحب نے چیک کا جائزہ لیا اور مایوسی سے بولے "وہی ایک لاکھ۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے جناب کہ گزارہ مشکل ہوگیا ہے۔ پچھلے ماہ آپ نے فرمایا تھا ...."

"مجھے یاد ہے ..... اور مجھے مہنگائی کا احساس بھی ہے شاہ صاحب۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں خجالت تھی "آپ تو جانتے ہیں کہ ہم سات آدمی مل کر یہ رقم دیتے ہیں۔ میں نے ساتھیوں سے بات کی تھی۔ وہ فی الحال رقم بڑھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔ وہی آبرو رکھنے والا ہے۔" شاہ صاحب رقت آمیز لہجے میں بولے "اب تک تو میں نے ایک وقت کا بھی فاقہ نہیں ہونے دیا۔ یہ نوبت آئی تو ان بچوں سے پہلے میرے اپنے بچے فاقہ کریں گے۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"آپ فکر نہ کریں شاہ صاحب!" صدیقی صاحب ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں نے کچھ اور لوگوں سے بھی بات کی ہے۔ ایک دو ماہ میں رقم بڑھ جائے گی انشاء اللہ۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور اگلے ہی لمحے نظام اندر آگیا۔ اس نے ادب سے دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے نظام؟" شاہ صاحب نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی شاہ صاحب ' اختر بہت گڑ بڑ کر رہا ہے۔" نظام نے کہا۔ "اس نے جی دوپہر کھانا نہیں کھایا ہے' کہتا ہے رات کو بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"لیکن کیوں؟"

نظام نے کن انکھیوں سے صدیقی صاحب کو دیکھا' جو یہ گفتگو بڑے غور سے سن رہے تھے پھر بولا "وہ کھانے کو گوشت مانگتا ہے جی۔"

شاہ صاحب کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی پھر بڑی تیزی سے انہوں نے خود کو سنبھال لیا "اچھا' تم جاؤ۔ میں بلا کر سمجھا دوں گا اسے۔"

"بہتر جناب!" نظام چلا گیا۔

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ صدیقی صاحب انہیں مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب آپ ہی دیکھ لیں صدیقی صاحب! ہم تو ان محروم لوگوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو' پل صراط پر چلنا پڑتا ہے۔ ہر لمحے۔ سوچیں کہ یہ اختر کس مان سے گوشت کا تقاضا کر رہا ہے۔ اس وقت میرا دل کٹ کر رہ گیا ہے اور میں اس کی یہ خواہش پوری کروں گا۔ ہوٹل سے گوشت منگوا کر کھلاؤں گا اسے۔"

صدیقی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ شاہ صاحب کا جذبہ دل کو چھو لینے والا تھا" آپ بہت عظیم انسان ہیں شاہ صاحب۔ آپ بہت بڑا کام کر رہے ہیں لیکن گوشت تو باقاعدگی سے آتا ہے آپ کے ہاں۔ ابھی کل ہی قریشی صاحب سے بات ہوئی تھی میری۔"

پورا کہاں پڑتا ہے صدیقی صاحب۔ ہزار سے اوپر بچے ہیں ہمارے پاس۔ جیسے تیسے کام چلا لیتے ہیں۔" شاہ صاحب نے دردناک لہجے میں کہا۔

صدیقی صاحب شرمندہ نظر آنے لگے "اللہ بہتر کرے گا۔ ویسے دیگیں بھی تو آتی رہتی ہیں۔ میں تو ہر جگہ آپ کی ہی بات کرتا ہوں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" شاہ صاحب نے پینترا بدلا۔ "آپ کی عنایت سے بچے روز گوشت کھانے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ایک دن بھی دال برداشت نہیں

ہوتی ان سے۔ انہیں تو اپنے یتیم ہونے کا احساس بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ ایسے فرمائشیں کرتے ہیں' جیسے اپنے گھر میں اپنے والدین سے بچے کرتے ہیں۔"

صدیقی صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں "اللہ آپ کو لمبی عمر اور لامحدود وسائل عطا فرمائے شاہ صاحب!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

صدیقی صاحب شاہ صاحب سے مصافحہ کرکے رخصت ہو رہے تھے کہ شاہ صاحب نے انہیں پکارا "حضرت ..... ایک التجا ہے۔"

صدیقی صاحب نے پلٹ کر انہیں دیکھا "حکم کیجئے شاہ صاحب"

"تین دن بعد بقر عید ہے۔ اس بار کھالوں کے سلسلے میں ہمارا خاص خیال رکھیے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ صاحب!"

صدیقی صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی شاہ صاحب کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ بے حد غضب ناک نظر آرہے تھے۔ "اسلام الدین!" انہوں نے چیخ کر پکارا۔

اسلام الدین کمرے میں آیا تو انہوں نے کہا "جاؤ ..... نظام کو بلا کر لاؤ۔"



"گوشت کو چھوڑو۔ بس پیٹ بھر جائے' اتنا کافی ہے۔" اصغر اختر کو سمجھا رہا تھا۔ اس وقت وہ نو سال کا بچہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ "گوشت کھانے کو صرف تمہارا ہی نہیں' میرا بھی دل چاہتا ہے۔ سب کا چاہتا ہوگا۔"

"میری طرح نہیں چاہتا ہوگا۔"

"تمہیں کیا پتا۔" اصغر نے آہ بھر کے کہا "میرا تو کبھی کبھی ایسا دل چاہتا ہے کہ اپنا ہی گوشت پکا کر کھالوں مگر میں جانتا ہوں کہ مانگنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ زیادہ تین پانچ کرو گے تو شاہ جی کھال کھینچ لیں گے اسی لئے میں صبر کرلیتا ہوں۔ صبر کا یہ مطلب نہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا۔"

"پھر تو بزدل ہے۔" اختر نے جوش اور غصے سے کہا "میں سب کچھ دیکھ کر چپ کیوں رہوں۔ یہاں مفت کا گوشت آتا ہے ..... ہمارے لیے اور ہمارے سوا سب کھا

جاتے ہیں۔ ہمیں ایک بوٹی بھی نہیں ملتی۔ دیگیں بھی ہمارے نام پر آتی ہیں۔ یہ لوگ کھاتے بھی ہیں اور بیچتے بھی ہیں۔ ہمیں ایک نوالہ بھی نہیں ملتا۔"

"مگر ہم کچھ کر نہیں سکتے۔"

"تو نہیں کرسکتا ہوگا۔ میں بہت کچھ کرسکتا ہوں اور کروں گا۔"

اسی لمحے اسلام الدین آگیا "چل اختر' تجھے شاہ جی نے بلایا ہے۔"

اصغر کا تو رنگ فق ہوگیا لیکن اختر گوشت کی طلب کے نشے میں سرشار تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن شاہ جی کے کمرے میں شاہ جی کے تیور دیکھ کر وہ بھی ڈر گیا۔ شاہ جی نے اسلام الدین سے کہا "تو باہر جا۔ میں بعد میں تجھے آواز دے لوں گا۔"

اسلام الدین کے جانے کے بعد شاہ جی نے اختر کو بہت غور سے دیکھا "ہاں شہزادے' تو بہت کمزور لگ رہا ہے۔ کیا بات ہے؟"

وہ نرم لہجہ اور ڈرا دینے والا تھا۔ اختر نے دل کڑا کرکے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں شاہ جی۔"

"سنا ہے' آج تو نے کھانا بھی نہیں کھایا؟" شاہ جی بولے۔ "مجھے اس کی کوئی پروا نہیں مگر میں نے کچھ اور تشویش ناک باتیں سنی ہیں۔ نظام بتا رہا تھا کہ جب تک گوشت نہیں ملے گا' تو کھانا نہیں کھائے گا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی شاہ صاحب۔"

"مجھے افسوس ہے اس لئے کہ اس صورت میں تو بھوک کی وجہ سے مرجائے گا۔ زندہ رہنا ہے تو تجھے ضد چھوڑنی ہوگی' جو ملے گا کھانا ہوگا ورنہ تو بھوکا مرجائے گا۔ کسی کو کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا اس لئے کہ تیرا کوئی رونے والا بھی نہیں۔" شاہ جی نے سرد لہجے میں کہا۔

یتیم خانے کی زندگی نے نو سالہ اختر کو عمر سے بڑا بنا دیا تھا مگر آخر وہ تھا تو بچہ ہی۔ وہ سہم گیا۔ موت کا تصور ہی بہت خوف ناک تھا۔ اس نے سوچا' واقعی میرا تو کوئی رونے والا بھی نہیں' سوائے اصغر کے۔ وہ تو لازماً روئے گا "شاہ جی' میں پیٹ

بھر کے گوشت نہیں مانگتا۔ بس مجھے ایک بوٹی اور تھوڑا سا سالن لادو۔ پچھلی بقرعید سے بھی پہلے میں نے گوشت کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک گوشت دیکھا بھی نہیں ....." وہ گڑگڑایا۔

"میں تجھے خواہ مخواہ کمزور سمجھ رہا تھا۔ تجھ میں تو بڑی طاقت ہے۔ ہاں تو نے ساری طاقت زبان میں لگا دی ہے۔ کیسے فرفر بولتا ہے۔"

"شاہ جی' خدا کے لئے' مجھے ایک بوٹی دے دو۔" اختر کی ساری اکڑ نکل گئی۔ وہ ایسے گڑگڑا رہا تھا' جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔

ایک دم شاہ جی کے تیور بدل گئے "سالے حرام زادے' تیرا باپ یہاں گوشت رکھوا کر گیا تھا کہ میں تجھے گوشت کھلاؤں۔ کتے کے پلے' کھاتا ہے اور غراتا ہے۔ اپنی اوقات بھی نہیں پہچانتا۔ یہ نہ بھولا کر کہ تو یتیم ہے ..... بلکہ ہوسکتا ہے' حرامی ہی ہو۔"

گالیوں سے اختر کا کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سننے کا تو وہ بچپن ہی سے عادی تھا۔ البتہ اس کی اکڑ عود کر آئی۔ اس نے کہا۔ "شاہ جی' میں گوشت کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا۔ چاہے مرجاؤں۔"

"تو بھوک سے نہیں' میرے ہاتھوں سے مرے گا۔"

"دیکھیں شاہ جی' اتنا گوشت آتا ہے۔ سارے نوکر کھاتے ہیں۔ آپ کے گھر بھی جاتا ہے۔ ایک بوٹی مجھے دیں۔ قسم سے' میں کب سے ترس رہا ہوں ایک بوٹی کے لئے۔ آپ کا کیا جائے گا۔ شاہی جی۔" اس نے بے حد لجاجت سے کہا۔

اپنے گھر گوشت جانے کا حوالہ سن کر شاہ جی کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ وہ الماری کی طرف گئے اور بید کی چھڑی نکال لی۔

اختر کو اندازہ ہوگیا کہ اب پٹائی ہوگی اور شنوائی نہیں ہوگی۔ اس نے سوچا' جلدی جلدی اپنی بات تو کہہ دے۔ دل میں کچھ نہ رہ جائے۔ اس نے دیگوں کا حوالہ دیا۔ یتیم خانے کے لئے آنے والے عطیات اور چندے کا تذکرہ کیا۔ یوں وہ شاہ صاحب کی آتش غضب کو اور بھڑکاتا رہا۔

شاہ جی اب غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے "تو سمجھتا ہے' یہ سب تیرے لیے آتا ہے ..... تیری وجہ سے آتا ہے۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں شاہ جی' میری نہیں ..... سب یتیموں کی وجہ سے آتا ہے۔" اختر اب بھی گڑگڑا رہا تھا۔

"غلط۔" شاہ جی دہاڑے "یہ سب میرے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ اگر میں نکال دوں سب کو ..... تو کوئی نہیں پوچھے گا تمہیں۔ بھیک مانگتے پھرو گے' بھیک بھی نہیں ملے گی۔ کتے کے پلے' حرام کے جنے' گندی نالی کے کیڑے ..... تجھے میں پناہ نہ دیتا تو جھاڑو لگا رہا ہوتا کہیں ...."

"شاہ جی ! خدا کے لئے' مجھے ایک بوٹی دلوا دیں۔" اختر پھر گڑگڑایا۔ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ابھی دیتا ہوں ..... لیکن تیرے اپنے جسم سے اتار کر۔" شاہ جی نے غرا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چھڑی سے اندھا دھند اس کی دھنائی شروع کر دی۔

اختر نے پہلی بار شاہ صاحب کا چھڑی والا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا تو خوف نے اسے جکڑ لیا مگر پہلی چھڑی جسم پر لگتے ہی اس کے وجود میں سرکشی اور بغاوت کی ایک تند موج اٹھی۔ اسے ایسا لگا' جیسے اس کا جسم پتھر کا ہوگیا ہے۔ اسے تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بس اس نے اتنا کیا کہ دونوں ہاتھوں سے سر اور چہرہ چھپالیا۔

شاہ جی مارنے کے ساتھ ساتھ مغلظات بھی بک رہے تھے۔

"شاہ جی ' اب تو میں سب کو بتاؤں گا کہ ہمیں کیا ملتا ہے۔" اختر چھڑی کی ہر چوٹ سے بلبلا کر چیختا "جو لوگ ہمارے لئے تمہیں چندہ دینے آتے ہیں' میں انہیں بتاؤں گا۔ جو دیگیں لے کر آتے ہیں' میں انہیں بتاؤں گا۔ میں یتیم خانے کے تمام بچوں کو بتاؤں گا۔ وہ سب پوری دنیا کو بتائیں گے۔" اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے "تم ہمارا گوشت کھا رہے ہو۔ تم آدم خور ہو۔" اس کا ہذیان بڑھتا گیا "میں سب کو بتاؤں گا کہ تم کیا ہو ....."

شاہ جی کا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سن رہے تھے مگر درحقیقت کچھ بھی نہیں سن رہے تھے۔ ہاں' ان کا ذہن اختر کے کہے ہوئے ہر لفظ کو ریکارڈ کر رہا تھا۔ اختر گر گیا۔ وہ پھر بھی اسے مارتے رہے مگر دھمکی سن کر ان کا ہاتھ رک گیا "تو کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔" انہوں نے وحشیانہ لہجے میں کہا "اس لیے کہ اس سے پہلے ہی میں تجھے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دوں گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ کسی کو تیری کمی کا احساس نہیں ہوگا۔ تیرا ہے ہی کون۔"

"ہاں ...... یہ ضرور کرلینا۔" اختر بھی چیخ رہا تھا "ورنہ میں سب کو بتا دوں گا کہ تم شیطان ہو مگر مجھے مارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھ جیسے اور بھی ہیں یہاں۔"

شاہ صاحب کی چھڑی پھر حرکت میں آگئی۔ یہ احساس بھی انہیں کچھ دیر بعد ہوا کہ اختر دیر سے خاموش ہے۔ انہوں نے ہاتھ روکا اور نیچے پڑے ہوئے اختر کو دیکھا۔ انہیں ڈر لگا کہ کہیں وہ مر ہی نہ گیا ہو۔ وہ سوچنا چاہتے تھے۔ کرسی کی طرف بڑھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ ہانپ رہے ہیں۔

وہ ساکت وصامت پڑے اختر کو دیکھتے اور سوچتے رہے۔ لڑکا بہت سرکش اور سخت جان تھا۔ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ انہیں اس کے لئے کچھ کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اسلام الدین کو پکارا۔ اسلام الدین آیا تو انہوں نے فرش پر پڑے ہوئے اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے لے جاؤ اور کوٹھری میں بند کردو۔ خیال رکھنا' کوئی لڑکا اس سے ملنے نہ پائے۔ اسے تنہا اور قید رکھنا ہے۔"

اسلام الدین نے اختر کو دیکھا اور جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پٹنے کے بعد اتنے برے حال میں اس نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔



ریاض احمد بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ بمشکل پون کلومیٹر تھا مگر وہ انہیں بہت بھاری لگ رہا تھا اور تو اور بریف کیس انہیں بوجھ

لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس میں انشورنس کلیم کے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ قدموں سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا مگر یہ سب کچھ جسمانی نہیں تھا۔ کندھے ان کے حالات نے جھکا دیے تھے اور وقت کی گردش نے قدموں کو بوجھل کر دیا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے' جیسے جادو کے زور سے سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ ان کے جھکے ہوئے کندھے اٹھ گئے۔ قدموں میں چستی آگئی۔ چہرے سے تھکن مٹ گئی۔ یہ تبدیلی لاشعوری تھی۔ وہ پڑوسیوں پر کسی پریشان حال آدمی کا تاثر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی پریشانیاں گھر بھی نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ بچے جو کچھ جھیل رہے تھے' ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں امداد صاحب نظر آگئے۔ امداد صاحب برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ علاقے کے اور لوگوں کی طرح امداد صاحب بھی خوش حال کاروباری تھے "السلام علیکم امداد صاحب!" ریاض احمد نے اپنی گونج دار آواز میں انہیں پکارا۔

امداد صاحب نے سر گھما کر انہیں دیکھا "آہا ..... ریاض صاحب ہیں۔" انہوں نے بڑھ کر ریاض احمد سے مصافحہ کیا۔

"اور کیسے مزاج ہیں؟" ریاض احمد نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" امداد صاحب نے انہیں سرتاپا دیکھا۔ عمدہ سلا ہوا نفیس کپڑے کا سوٹ' چمک دار جوتے اور ٹائی جو میچنگ کے اعلیٰ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ اس پر شخصیت۔ امداد صاحب نے سوچا' اس شخص کے چہرے سے اور ہر انداز سے خوش حالی اور فراغت کا اظہار ہوتا ہے" مجھے تو آپ پر رشک آتا ہے ریاض صاحب!"

"کس سلسلے میں جناب؟"

"اب یہی دیکھیے کہ آپ صبح کے گئے رات کو واپس آرہے ہیں مگر ماشاء اللہ

کتنے فریش لگ رہے ہیں۔ میں تو دکان سے آتا ہوں تو اتنا برا حال ہوتا ہے کہ گلی میں کوئی جاننے والا مل جائے تو شرمندگی ہونے لگتی ہے۔"

"اللہ کا کرم ہے اور اپنے بارے میں آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔"
ریاض احمد نے مسکراتے ہوئے کہا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں بھرم رکھنے کا ظرف عطا فرمایا۔

"جی نہیں۔ یہ سچ ہے۔" امداد صاحب بولے "بھئی سچ پوچھیں تو مجھے آپ کی آمد کی بڑی خوشی ہے۔ اچھا پڑوسی اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ پڑوس کا گھر غیر آباد ہو تو بہت برا لگتا ہے مگر برا پڑوسی اس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں آپ جیسے اچھے پڑوسی ملے۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں مجھے۔"

"ہرگز نہیں۔ میری بیوی کو بھی آپ لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ آپ کے گھر اور بیوی بچوں کی بہت تعریف کر رہی تھیں وہ۔"

"اصل میں آپ لوگ اچھے ہیں۔"

"اور ریاض صاحب' کسی وقت ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بلاتکلف حکم کیجیے گا۔ آپ تو جانتے ہیں' پڑوسی کا کتنا حق ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔" ریاض احمد نے کہا۔ دل میں انہوں نے سوچا' سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہاں تو آدمی کو اپنی سولی آپ اٹھانی پڑتی ہے۔ سفید پوشی کا بھرم بھی کوئی چیز ہے۔

"کسی دن ہمارے ہاں تشریف لائیے نا۔" امداد صاحب نے کہا۔

"انشاء اللہ آؤں گا۔ بس مصروفیت ہی اتنی ہے۔"

ریاض احمد نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ان کی بیٹی میمونہ نے کھولا
"السلام علیکم ابو۔"

"وعلیکم السلام بیٹا۔ کیسی ہو۔" ریاض صاحب مسکرائے۔

"ٹھیک ہوں ابو۔"

دونوں بیٹے بھی آ گئے۔ انہوں نے سلام کیا۔ ریاض احمد کو دکھ ہوا۔ کتنے دن ہو گئے، بچوں نے یہ نہیں پوچھا کہ ابو، میرے لیے کیا لائے ہو۔ پھر انہیں خوشی بھی ہوئی کہ بچوں کو سمجھوتا کرنا آتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں ان کی بیوی کی تربیت کا بھی دخل ہے۔

وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ میمونہ ان کے جوتے اتارنے لگی۔ اس نے موزے اتار کر باہر لے جا کر پھیلا دیے۔ اسی وقت سلمیٰ بیگم ان کے لئے چائے لے آئیں پھر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں "تم لوگ جاؤ۔ کھیلو۔"

"دل نہیں چاہ رہا ہے امی۔" اشعر نے کہا۔

"یہ لوگ گھر سے نکلتے ہی نہیں۔ حالاں کہ اتنا اچھا محلّہ ہے۔" سلمیٰ بیگم نے شکایتاً کہا۔

"ابو، آپ بکرا کیوں نہیں لائے۔" فیاض نے باپ سے کہا۔

"یہاں تو سب کے ہاں دو دو تین تین بکرے ہیں۔ بچے انہیں نہلانے لے جاتے ہیں۔"

"بیٹے، چاہوں بھی تو نہیں لا سکتا۔ انشاء اللہ اگلے سال میں تمہیں دو بکرے لا کر دوں گا۔"

"ابو، آپ تو ہر سال قربانی کرتے ہیں۔" اشعر بولا۔

"اچھا، اب تم لوگ ابو کو تنگ نہ کرو۔ یہ سب تو میں تمہیں سمجھا چکی ہوں۔"

"سوری ابو۔" اشعر نے کہا اور ریاض احمد کے رخسار پر بوسہ دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی فیاض نے بھی ایسا ہی کیا پھر اشعر نے کہا۔

"چلو آنگن میں سائیکل چلاتے ہیں۔"

دونوں چلے گئے تو سلمیٰ بیگم نے شوہر سے پوچھا "کیا رہا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک ہفتہ لگے گا کلیم منظور ہونے میں۔" ریاض احمد نے افسردگی سے کہا۔

"تو پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ بس چند ہی روز کی تو

بات ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر عید سر پر آ گئی ہے۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے۔"

"بقر عید پر ضروری بھی نہیں ہوتے کپڑے۔" سلمیٰ بیگم نے بے پروائی سے کہا "اور ہر بچے کے پاس کم از کم دو تین جوڑے کپڑے ایسے ہیں، جو کبھی نہیں پہنے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ عید سے پہلے کام ہو جائے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر عید میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ اور ایک دن پہلے سے چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ دو دن میں کام بننے کا تو امکان نہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ چھوڑیں اس بات کو۔"

رات کے کھانے پر ریاض احمد کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان کے بچے گوشت کو ترس رہے ہیں۔ فیاض بہت چھوٹا تھا۔ وہ تو حالات نہیں سمجھتا تھا۔ وہ گوشت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ سلمیٰ بیگم اسے بہلا رہی تھیں۔ ریاض احمد کو افسوس ہوا کہ بچوں نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔

دونوں بیٹے ریاض احمد سے لپٹ کر سونے کے عادی تھے۔ سوتے وقت وہ ہمیشہ کہانی سنانے کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ اس رات ریاض احمد نے انہیں اس بادشاہ کی کہانی سنائی، جس کی سلطنت چھن گئی تھی اور وہ اپنے بچوں کو لے کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کہانی کے ذریعے انہوں نے بچوں کو سمجھایا کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے پھر اللہ مشکل وقت کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ آدمی کو نعمتوں کی قدر کرنا بھی آ جاتا ہے۔

بچوں کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا مگر ریاض احمد کو یقین تھا کہ بچوں سے کہی گئی کوئی بات رائگاں نہیں جاتی۔ جو اب سمجھ میں نہیں آئے گا، بعد میں سمجھ جائیں گے۔

بچے سو گئے مگر وہ دیر تک جاگتے رہے۔ سلمیٰ بیگم ان کے پاس آ گئیں "نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"آ جائے گی۔"

"لائیں، میں آپ کے سر میں تیل لگا دوں۔"

"آپ نے اپنی پڑوسن کو خوب متاثر کیا۔" تیل لگوانے کے دوران ریاض احمد نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"امداد صاحب بتا رہے تھے ...."

"ہاں، وہ صوفوں سے، ٹی وی سے، مکان کی آرائش سے بہت متاثر نظر آ رہی تھیں۔"

"اللہ کیسا پردہ رکھتا ہے۔" ریاض احمد کے لہجے میں تشکر تھا۔



اختر کو ہوش آیا تو وہ قبر میں تھا!

وہاں ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ شاہ جی نے اسے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دینے کی بات کی تھی۔ اور شاید اس پر عمل بھی کر لیا تھا۔ کرامت بابا نے جو بچوں کو سپارہ اور دینیات پڑھاتے تھے، قبر کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، یہ جگہ اس پر پوری اترتی تھی۔ بس اسے اس کی تنگی چیک کرنی تھی۔

اس نے اوپر دائیں بائیں قبر کی گنجائش چیک کرنے کی غرض سے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ایسی تکلیف تھی کہ وہ ہلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر اسے یقین ہو گیا کہ وہ مرا نہیں ہے۔ کرامت بابا نے بتایا تھا کہ مرنے کے بعد آدمی ہر تکلیف سے بے نیاز ہو جاتا ہے جبکہ ..... وہ شدید تکلیف میں تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں ایک بات آ سکتی تھی اور وہ یہ کہ شاہ جی نے اسے مردہ سمجھ کر زمین میں گاڑ دیا ہے جب کہ درحقیقت وہ مرا نہیں تھا۔

یہ اور بڑی مصیبت تھی۔ جب تک وہ ہلنے جلنے کے قابل نہ ہوتا، قبر کے متعلق تفتیش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ سانس لینے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ قبر میں گھٹن بالکل نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ عمر بھر یوں ہی پڑا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے پوری قوت ارادی کو کام میں لاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ جسم میں کہاں کہاں ٹیسیں اٹھی ہیں۔ بہرکیف ذرا سا ہلنے کی کوشش میں

اس نے اپنی شامت بلالی تھی۔ اذیت کی ایسی تندو تیز لہریں اٹھی تھیں کہ اگر بے ہوشی نے اسے اپنی نرم گرم آغوش میں نہ سمیٹ لیا ہوتا تو شاید وہ مر ہی جاتا۔



اسلام الدین نے اختر کو نیفو کی تحویل میں دے دیا تھا۔ نیفو تو اس کا حشر دیکھ کر کانپ اٹھا تھا۔ اس کے پورے بدن پر نیل ہی نیل تھے۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں تھا' جہاں نیل نہ پڑے ہوں۔ جا بجا جلد ابھر آئی تھی اور وہ بے ہوش تھا مگر نیفو کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ زندہ کیسے ہے۔

نیفو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور لپکا ہوا نظام کے پاس آیا۔ اس نے نظام کو کوٹھری میں لے جاکر اختر کا حشر دکھایا۔ "میرا دل دکھ رہا ہے اس کے لیے " نیفو نے کہا" یار' اس نے گوشت ہی تو مانگا تھا۔ کون سی بڑی بات تھی۔"

"تجھے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟" نظام نے جل کر کہا۔

"میرے اپنے بھی بچے ہیں۔ یار وہ مجھ سے اس طرح سے گوشت کو کہیں تو خدا کی قسم" اپنا گوشت کاٹ کر دے دوں۔"

"تو اسے بھی دے دینا تھا۔"

نیفو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں" یہ تو یار' بن ماں باپ کے بچے ہیں اور ہم جو کھاتے ہیں' وہ انہی کے لئے تو آتا ہے۔"

"تو نہ کھایا کر۔" نظام کو اس کی باتوں پر غصہ آرہا تھا۔

"خیر' اب دال تو دے۔ سوتے میں ہی اس کے حلق میں انڈیل دوں گا ورنہ یہ تو بڑا ضدی ہے۔ بھوکا ہی مرجائے گا۔"

نیفو نے جیسے تیسے دال کا پانی اختر کے حلق میں انڈیلا۔ وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ اس بار وہ واپس آیا تو اس نے نظام سے کہا۔ "یار' وہ بڑی تکلیف میں ہے۔ اس کی تو سنکائی بہت ضروری ہے۔"

"اس پر شاہ جی کا عتاب ہے۔ تو اس سے ہمدردی نہ کر۔" نظام نے اسے مشورہ دیا۔

اسی لمحے اسلام الدین آگیا۔ اس نے بتایا کہ شاہ جی کا حکم ہے' اختر کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی جائے۔ اس کے بعد نیفو کچھ محتاط ہوگیا۔

"دیکھا تو نے۔" نظام نے نیفو سے کہا۔

"مگر یار' اسے اس طرح چھوڑا تو نہیں جاسکتا۔" نیفو سوچ میں پڑگیا پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "اس لڑکے اصغر سے اس کی بڑی دوستی ہے۔ وہ ہے بھی اچھا۔ اکڑو نہیں ہے ذرا بھی۔ اس سے مختلف ہے۔ اسے اس کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ اس کی سنکائی بھی کردے گا۔ مرہم بھی لادوں گا اسے۔"

"سوچ لے۔ شاہ جی کو پتا چل گیا تو ....."

"کیسے پتا چلے گا۔ تو بس مجھے گرم پانی کر دے اور لالٹین دے دے۔ کوٹھری میں تو لائٹ بھی نہیں ہے۔"

نظام ہچکچایا مگر مان گیا۔ انسان تو وہ بھی تھا۔ اس کا دل بھی دکھ رہا تھا۔



اصغر بہت پریشان تھا بلکہ پریشان سے زیادہ وہ خوف زدہ تھا۔ جب سے اختر شاہ صاحب کے پاس گیا تھا' واپس نہیں آیا تھا۔ جب کہ اب رات ہوگئی تھی۔ پہلے کبھی کسی کو سزا بھی ملتی تھی تو وہ پٹ پٹا کر واپس آجاتا تھا مگر اختر کا تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

وہ کمرے میں سہما ہوا سا بیٹھا تھا نیفو نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ اصغر اس کے پاس گیا "سن اصغر' کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تو میرے ساتھ چل خاموشی سے۔"

اصغر اس کے ساتھ چل پڑا۔ نیفو نے اسے لالٹین تھمائی' خود گرم پانی کا برتن لیا اور کوٹھری کی طرف چل دیا۔ کوٹھری یتیم خانے کی عمارت کے پچھواڑے تھی۔ اس طرف کوئی جاتا بھی نہیں تھا۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہاں اندھیرا رہتا تھا۔

کوٹھری کچی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ نیفو دروازے پر رکا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی "تو اختر کا دوست ہے نا؟"

اصغر نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"اختر کا حال دیکھ کر صبر کرنا۔ اسے تیری مدد کی ضرورت ہے۔"

اصغر نے پھر اثبات میں سرہلایا۔ وہ بدترین ہی کی توقع کر رہا تھا۔ مگر اسے اندا
نہیں تھا کہ بدترین کیا ہوسکتا ہے۔

فیضو نے تالا کھول کر نکالا' کنڈی کھولی پھر دروازے کے پٹ دھکیلے۔



دوسری بار اختر کو ہوش آیا تو بھی وہ اسی قبر میں تھا مگر اس بار جسمانی اذیہ
ایسی تھی کہ اس نے خود کو قبر میں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہلنے جلنے کی ہر کوشہ
اس کی اذیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر ساکت لیٹ گیا۔

کچھ دیر گزری تو اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں۔ اسے ا
اندازہ ہوگیا کہ اگر یہ قبر ہی ہے تو کافی کشادہ ہے۔ اس کی چھت تو اچھی خاصی بلند
پر تھی بلکہ اسے یقین ہوگیا کہ یہ قبر نہیں ہے۔ شاہ جی نے اسے کہیں قید کر دیا ہے۔

اور کچھ دیر گزری تو اپنے دائیں جانب سے اسے پہلے انسانی آوازیں سنا
دیں۔ آواز تو واضح تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ اس کے بعد کھڑکھڑاہٹ
سی سنائی دی۔ وہ آواز کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے آسمان نظر آیا۔ اگرچہ باہر بھ
اندھیرا ہی تھا لیکن آسمان کو پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

پھر آسمان کی بجھی بجھی روشنی کے پیش منظر میں اسے دو ہیولے نظر آئے۔
اسی لمحے اس کی سمجھ میں بہت کچھ آگیا۔ آسمان اسے دروازہ کھلنے کی وجہ سے نظر آ
تھا اور دراصل وہ ایک کمرے میں تھا۔ دروازہ کھولنے والے اب کمرے میں آرہے
تھے۔

دروازہ پھر بند ہوگیا۔ اب وہ پھر اندھیرے میں تھا۔ اچانک روشنی سی ہوئی۔
اندر آنے والوں میں سے کسی نے دیا سلائی جلائی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں لالٹین
تھی۔ دیا سلائی کی مدد سے لالٹین روشن کر دی گئی۔

روشنی ہوئی تو اپنی تمام تر اذیت کے باوجود اختر نے سکون کی سانس لی۔ پہلی با
اسے احساس ہوا کہ روشنی کتنی بڑی نعمت ہے۔ روشنی سے پہلے تو اس کی آنکھیں

چندھیائیں مگر پھر اس سے ہم آہنگ ہوگئیں۔

اس نے اندر آنے والوں کو پہچان لیا۔ ایک تو اصغر تھا اور دوسرا یتیم خانے کا
ملازم فیضو۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ذرا ہی دیر میں اس کی سمجھ میں آگیا کہ
اسے کوٹھری میں رکھا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اسے کال کوٹھری بنا رکھا تھا۔ جسے سزا
دینا ہوتی' اسے اس الگ تھلگ اور اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔

فیضو اور اصغر اس کے پاس آگئے "تو ہوش میں آگیا؟" فیضو نے پوچھا۔

"ہاں۔" اختر نے جواب دیا۔ اپنی آواز خود اس سے نہیں پہچانی جا رہی تھی۔

دونوں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اصغر گم صم تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ
رہی تھیں۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ دکھی نظروں سے اختر کو تکے جا رہا
تھا۔

"دیکھو اصغر' پہلے گرم پانی کی بھاپ سے اس کی سنکائی کرنی ہے۔" فیضو نے
اصغر سے کہا۔ اس نے اسے کپڑے کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے دیے "پانی ٹھنڈا
ہو جائے تو اس کے جسم پر ہلدی کا یہ لیپ کر دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ بعد میں بھی
تجھے گرم پانی لادوں۔ نہ لاسکوں تو کپڑا لالٹین کے اوپر رکھنا اور اس سے سنکائی کرنا۔"

اصغر نے کچھ کہا نہیں۔ بس اثبات میں سرہلایا۔

"تم مجھ پر یہ مہربانی کیوں کر رہے ہو؟" اختر نے فیضو سے بمشکل پوچھا۔

فیضو چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا "دیکھ اختر' تو مجھے
بددعا نہ دینا۔ مجھے بددعا سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"میری بددعا سے کسی کو ڈر نہیں لگتا ورنہ میرا یہ حشر نہ ہوتا۔" اختر کی آنکھوں
سے آنسو بہنے لگے۔

"یتیم کی بددعا بڑی خطرناک ہوتی ہے۔" فیضو نے کہا "بس تو مجھے بددعا نہ
دینا۔ تو بھوکا ہوگا۔ میں کھانا لادوں تجھے؟"

"نہیں۔ میں گوشت کے سوا کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

"نہیں کھائے گا تو کمزور ہو جائے گا۔ اتنی تکلیف تو ویسے ہی ہے ...."

"میں نے کہہ دیا نا۔"

"اچھا ..... میں تجھے گوشت لا دیتا ہوں۔"

"چوری کر کے لاؤ گے۔ مجھے نہیں چاہیے۔" اس وقت اختر پوری طرح بچہ بن گیا تھا۔ اس پر ضد سوار تھی۔

"ضد نہ کر اختر۔ مان جا۔" اصغر نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اچھا' میں ہوٹل سے لا دوں گا ..... اپنے پیسوں سے۔"

"ٹھیک ہے۔"

فیضو اٹھ کھڑا ہوا "میں ایک گھنٹے میں آؤں گا۔ کوئی چادر بھی لے آؤں تمہارے لیے۔" وہ چلا گیا اور باہر سے دروازہ بند کر گیا۔

"دیکھ 'گوشت کی ضد میں تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے۔" اصغر نے اختر سے کہا۔

"لیکچر نہ دے۔ میرے لیے کچھ کر۔" اختر چڑ کر بولا۔

اصغر خاموشی سے فیضو کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سنکائی کی تیاری کرنے لگا مگر جیسے ہی اصغر نے گرم کپڑا اختر کے مضروب بدن پر رکھا' اختر کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی .... طویل چیخ! پھر وہ چیختا چلا گیا۔

کہتے ہیں' یتیم کی فریاد عرش کو بھی ہلا دیتی ہے!



کھانے کے بعد چندو کو لے کر ٹہلنے کے لئے نکلنا بھائی جان کا معمول تھا۔ وہ خاصی لمبی چہل قدمی کرتے تھے۔ میدان تک کا فاصلہ بھی اچھا خاصا تھا مگر وہ میدان کا ایک چکر بھی لگاتے تھے۔ اس دوران چندو کبھی ان کے آگے آگے بھاگتا اور کبھی پیچھے رہ جاتا تو وہ اسے پکارتے۔ راستے میں جو کوئی بھی ملتا' پہلے وہ بھائی جان کو سلام کرتا پھر چندو کا سر تھپتھپا کر چندو کی مزاج پرسی کرتا "کیسے ہو چندو میاں۔" جیسے باجی جگت باجی تھیں' ویسے ہی ان کے شوہر بھی جگت بھائی جان تھے۔

ٹہل کر گھر واپس آئے تو وہ کمرے میں چلے گئے اور چندو صحن کی دیوار کے ساتھ بنے ٹین کے اس شیڈ میں بیٹھ گیا' جو اس کی اسٹڈی تھا۔ یہاں وہ صرف غور و فکر اور جگالی کی غرض سے بیٹھتا تھا۔ ورنہ تو پورے گھر میں دندناتا اس کا معمول تھا لیکن رات کی چہل قدمی کے بعد وہ لازمی طور پر یہاں بیٹھتا تھا۔ شاید دن بھر کے معاملات پر غور کرنے کے لئے۔

بھائی جان نے کمرے میں داخل ہوتے ہی باجی سے کہا "اور بھئی' اب چائے پلا دو جلدی سے۔"

باجی چائے کا پانی پہلے ہی چولھے پر رکھ چکی تھیں۔ دو منٹ میں وہ چائے لے آئیں' دونوں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

"آج پتا ہے' چندو نے کتنی بری حرکت کی۔" باجی نے کہا اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا "اتنی شرمندگی ہوئی مجھے۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟" بھائی جان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے اسے سخت سزا دی۔ اس کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر

دیا۔ پورے ایک گھنٹے کھڑا رہا بے چارہ۔"

"زیادتی کی۔" بھائی جان نے تاسف سے کہا۔

"یہ سب تربیت کا حصہ ہوتا ہے۔" باجی فوراً" اسکول ٹیچر بن گئیں" بچے کو ٹوکنا ضروری ہے۔ خواہ وہ سمجھ دار نہ ہو۔ اسے لاشعوری طور پر برے اور بھلے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ بچے کو بے لگام تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"بھئی وہ تو جانور ہے۔ ناسمجھ ہے۔ صرف محبت کیا کرو اس سے۔"

"آپ اسے جانور نہ کہا کریں۔" باجی نے چڑ کر کہا "وہ بیٹا ہے ہمارا۔"

"ہے۔ مگر جانور تو جانور ہی رہتا ہے۔"

"نہیں رہتا۔ انسان کی سچی محبت ملے تو آدمی کا بچہ بن جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں آپ' کتنا سمجھ دار ہے۔ ہر بات سمجھتا اور مانتا ہے۔ جیسا کہو' ویسا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سے اور مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ باقاعدہ پیار کرتا ہے۔"

بھائی جان نے اداس نظروں سے بیوی کو دیکھا "کب تک خود کو بہلاؤ گی شمسہ بیگم۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ میرے لیے تو وہ اس بیٹے کی طرح ہے' جسے میں نے نو ماہ پیٹ میں رکھا ہو اور اذیتیں سہہ کر جنم دیا ہو اور وہ بھی مجھے ماں ہی سمجھتا ہے۔ اب دیکھ لیجئے گا۔ آئندہ وہ اس طرح باہر کبھی منہ نہیں مارے گا۔"

"اب آپ اس پر شرط بھی لگائیں گی۔" بھائی جان نے آہ بھر کے کہا۔

"بالکل لگا سکتی ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" بھائی جان نے کہا "آئندہ جس دن بھی وہ کہیں منہ مارے' آپ مجھے قیمہ پراٹھے پکا کر کھلائیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ شرط تو دو طرفہ ہوتی ہے۔" باجی نے کہا۔

"یہ شرط بھی دو طرفہ ہے۔" بھائی جان مسکرائے "وہ زندگی بھر باہر کہیں منہ نہیں مارے گا تو آپ شرط جیت جائیں گی اور جو آپ مانگیں گی' وہ میں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" آپا نے کہا لیکن کہتے ہی چونکیں "مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ ساری زندگی کی شرط! مجھے تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"بھئی آپ نے چیلنج ہی یہ کیا ہے۔"

"نہیں جی' کوئی وقت کی حد بھی تو دیجئے۔"

بھائی جان کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتے رہے پھر بولے۔ "جانور کا .... میرا مطلب ہے' چندو کا معاملہ ہے۔ آزمائشی وقت تو زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ اچھا' ایک سال ٹھیک رہے گا؟"

"جی نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہے۔"

"چلیں .... ساڑھے گیارہ مہینے سہی۔" بھائی جان نے خاصی سوچ بچار کے بعد کہا۔

"یہ کیا۔ کسی دکان پر بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں کیا۔" باجی چڑ گئیں۔

"بھاؤ تاؤ تو آپ کرتی ہیں۔ میں تو آپ کو احساس دلا رہا ہوں کہ دکان دار کیسے عاجز آجاتے ہوں گے۔"

"بس ایک مہینہ کافی ہے۔" باجی نے فیصلہ سنا دیا۔

"نہیں بھئی۔ یہ تو بہت کم ہے۔"

دو مہینے پر اتفاق ہوگیا "چلیں ..... اب سو جائیں۔" باجی نے کہا۔

بھائی جان دانت برش کرنے کے لئے باتھ روم میں چلے گئے۔ باجی نے باہر کا رخ کیا۔ شیڈ میں بلب جل رہا تھا اور چندو بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا ہے "چندو بیٹا" آجا اب سوئیں گے۔ رات ہو رہی ہے۔" باجی نے اسے پکارا۔

چندو اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں بلکہ شاید اس نے ان کی آواز بھی نہیں سنی۔

"آجایئے ...... سونا نہیں ہے۔"

اس بار چندو نے سر اٹھا کر بڑی بے نیازی سے انہیں دیکھا۔ اس بار بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"ٹھیک ہے۔ میں لائٹ بند کر رہی ہوں۔ آج تو اکیلے ہی سونا۔ میں دروازہ بھی بند کر رہی ہوں کرے گا۔"

اب کے چندو بڑی پھرتی سے اٹھا۔ وہ بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا اور ان کی

ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا۔ باجی بیٹھ گئیں "تو ناراض ہے مجھ سے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ چندو نے باقاعدہ اوپر نیچے سر ہلایا۔

"پگلا کہیں کا۔" باجی نے بڑے پیار سے کہا "بچے بدتمیزی کرتے ہیں تو ماں باپ کی بے عزتی ہوتی ہے اس لئے انہیں سزا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں ان کی بہتری ہوتی ہے۔ اب تو آئندہ ایسی بدتمیزی کبھی نہ کرنا۔"

چندو نے اس بار سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت دی۔ باجی نے اس کا منہ اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ انہوں نے اسے پیار کیا۔ "روتا ہے ..... امی سے ناراض ہوتا ہے۔ بے وقوف کہیں کا۔ چل کمرے میں' آج میں تجھے بہت اچھی لوری سناؤں گی۔"

اس بار چندو نے ان کے رخسار پر پیار کیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ باجی نے آنگن والے دروازے کی کنڈی چیک کی' پھر لائٹ آف کردی۔ وہ کمرے میں آئیں تو چندو مسہری پر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹ چکا تھا۔ وہ بھائی جان اور باجی کے درمیان سوتا تھا۔

اسی وقت بھائی جان باتھ روم سے نکل آئے "آگیا آپ کا لاڈلا۔"

باجی نے کمرے کی لائٹ آف کی اور زیرو کا بلب روشن کردیا۔ پھر وہ اپنی جگہ آلیٹیں۔ چندو نے ان کے لیٹتے ہی بڑے لاڈ سے اپنا ایک ہاتھ ان کی گردن میں حمائل کردیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اپنے پہلو میں سمیٹ کر رکھا تھا تاکہ ساتھ سونے والے ماں باپ میں سے کسی کو بھی پریشانی نہ ہو۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر چندو مضطرب ہوکر کسمسانے لگا۔ باجی اس کا سبب جانتی تھیں مگر دانستہ نظر انداز کرتی رہیں۔ بالاخر چندو سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑی باریک سی ..... میں ..... کی آواز نکالی۔ وہ محض آواز نہیں تھی۔ اس میں لہجہ بھی تھا۔ وہ التجا کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے چندو؟ نیند نہیں آرہی ہے؟"

چندو نے اس بار موٹی سی ..... میں ..... نکالی۔ اس میں شکایت تھی۔ پھر اس کے بعد باریک سی میں .....

"لوری سنے گا۔"

بستر ہل کر رہ گیا۔ چندو نے سر ہلانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ نے اس کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔" بھائی جان نیند میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائے۔

"آپ سو جائیے۔"

بھائی جان نے جواب نہیں دیا۔ وہ سچ مچ سو چکے تھے۔

باجی نے لوری شروع کردی۔ چندا کے ہنڈولے میں' اڑن کھٹولے میں۔ امی کا دلارا' ابو جی کا پیارا سوئے۔ نندیا جھلائے تجھے جھولے ..... وہ ایسے جذبے سے گا رہی تھیں کہ خود اپنی آواز انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چندو کا ہاتھ ان کے سینے پر تھا اور اس کی آنکھیں مندتی جا رہی تھیں۔

باجی کو خود بھی احساس نہیں ہوا کہ کتنی دیر ہوگئی ہے۔ وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لوری گاتی چلی گئیں۔ اندر مامتا کا ایک سمندر تھا' جو ان کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک بے خودی سی طاری تھی ان پر۔

جب وہ اس کیفیت سے نکلیں تو سب سے پہلے ان کی نظر چندو پر پڑی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب بھی ان کے سینے پر تھا اور اس کے خوب صورت چہرے پر معصومیت تھی۔ باجی کو اچانک ہی ایک خیال آگیا۔ شوہر کی بات ان کے دل میں چبھ رہی تھی۔

"سنتے ہیں ..... اجی سنتے ہیں۔" انہوں نے ہلے بغیر شوہر کو پکارا۔ اصولاً انہیں اٹھ کر شوہر کو جھنجوڑ دینا چاہیے تھا مگر وہ ایسی پوزیشن میں تھیں کہ اٹھتیں تو چندو کی نیند خراب ہوتی۔ چناں چہ وہ پکارتی رہیں ..... سنئے ..... اجی سنتے ہیں ..... ہر بار ان کی آواز پہلے سے بلند ہو جاتی۔

بڑی مشکل سے بھائی جان کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کیا کھلی' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے "کیا ہوا ..... کیا ہوا شمسہ بیگم؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "خیر تو ہے؟"

"ہاں ..... کچھ دکھانا چاہتی ہوں آپ کو۔"

"کہاں ..... کدھر ..... کیا ہے؟" بھائی جان نیند سے اٹھے تھے اور گھبرائے ہوئے

تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے ہیں اور باجی نے ان کی آہٹ سن لی تھی۔

"ارے ادھر دیکھیے ..... میرے چندو کو۔"

"کک .... کیا ہوا ..... زندہ تو ہے؟"

"کیا واہی تباہی بکے جا رہے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں۔"

بھائی جان نے زور زور سے آنکھیں ملیں اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چندو کو دیکھا۔ بظاہر تو وہ خیریت سے تھا "دیکھ تو رہا ہوں۔ صاف نظر آرہا ہے مگر ہوا کیا ہے اسے۔ خیریت تو ہے۔"

"خیریت ہے۔ ذرا اسے دیکھ کر یہ تو بتائیے کہ کیا جانور ایسے ہوتے ہیں ... ایسے سوتے ہیں۔"

بھائی جان کو ان کی بات سمجھنے میں ایک منٹ لگا اور جب بات سمجھ میں آئی تو وہ بھنا گئے "یہ بتانے کے لئے میری نیند خراب کی ہے آپ نے؟"

"آپ ہی تو اسے جانور کہے جا رہے تھے۔" باجی نے شکایت کی۔

"وہ تو میں مذاق کر رہا تھا ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ نہ کرتا ہوتا تو یوں سوتا بھلا اس کے ساتھ۔"

دلیل سچی اور عملی تھی۔ باجی کے دل پر اثر کرگئی پھر بھی شک کا کانٹا انہیں بے چین کر رہا تھا۔

بھائی جان بڑی محبت سے چندو کو دیکھ رہے تھے "اسے میں جانور سمجھوں گا" انہوں نے سوئے ہوئے چندو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ارے یہ تو میرا بیٹا ہے ..... بیٹا۔"

یہ کہہ کر وہ لیٹے اور لیٹتے ہی سوگئے۔ باجی کے وجود میں عجیب سی طمانیت تیر گئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کرکے بڑی سچائی سے زیر لب کہا "اے اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا چندو بہت اچھا بیٹا ہے۔" چند لمحوں کے اندر وہ سو بھی گئیں۔



سنکائی تو اختر برداشت نہیں کرسکا تھا۔ چناں چہ اصغر نے اس کے بجائے اس کی

چوٹوں پر ہلدی کا لیپ پہلے لگا دیا۔ اس سے بہت بڑا فرق پڑا۔ ہلدی نے جیسے جادو کے زور پر پورا درد کھینچ لیا۔ تکلیف اب بھی تھی مگر پہلے کے مقابلے میں تو اسے آرام ہی کہا جاسکتا تھا۔

نجانے کتنی دیر کے بعد فیضو آیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ ایک دری بھی تھی، جو اس نے کوٹھری کے لیپے ہوئے کچے فرش پر بچھا دی۔ "میری بیوی کہہ رہی تھی کہ پہلے ہلدی لگانی چاہیے۔ اس کے بعد جہاں درد کا احساس ہو اور سوجن بھی ہو، وہاں سنکائی کرنی چاہیے۔"

"سنکائی تو اس سے برداشت ہی نہیں ہو رہی تھی فیضو بھائی۔" اصغر نے اسے بتایا "پھر میں نے ہلدی کا لیپ لگا دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔ میری بیوی تو مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اب میں کیا جانوں ان معاملات کو۔" فیضو اختر کی طرف مڑا "اب کیا حال ہے تیرا؟"

اختر نے شکر گزاری سے اسے دیکھا "تکلیف بہت کم ہوگئی ہے فیضو بھائی۔"

"چل اٹھ کر بیٹھ۔ کھانا کھالے۔"

"مجھے دال نہیں کھانی۔" اختر کی اکڑ اب بھی قائم تھی۔

"اٹھ تو سہی۔ دیکھ میں کیا لایا ہوں تیرے لیے۔"

فیضو نے اخبار کو دسترخوان کی طرح بچھا دیا۔ ایک بڑی پلیٹ میں بھنا ہوا قیمہ تھا، جس سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اختر اٹھ تو بیٹھا مگر اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بظاہر تو درد کھنچ چکا تھا مگر درحقیقت وہ سویا ہوا تھا اور اس کے جوڑ دکھ رہے تھے۔ بہرکیف وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے بے تابی سے چپاتی سے نوالہ توڑا مگر نوالہ قیمے کی طرف بڑھاتے بڑھاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔

"کیا ہوا؟" فیضو نے پوچھا۔

"دل نہیں چاہتا فیضو بھائی۔ اب میں نے سوچا تھا کہ یتیم خانے کا کچھ بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"ابے یہ یتیم خانے کا مال نہیں ہے۔ یہ میں لایا ہوں۔" فیضو نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

اصغر کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ قیمے پر ٹوٹ پڑے مگر وہ ضبط کرتا رہا۔ اختر نے پہلا نوالہ لیا "واہ فیضو بھائی، کون سے ہوٹل کا ہے؟" اس نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوٹل کا نہیں، گھر کا کھانا ہے بیٹے۔ میں قیمہ لے گیا تھا۔ تیری بھابی نے پکایا ہے۔"

"مزہ آگیا۔" اختر نے کہا۔ پوری روٹی کھانے کے بعد پیٹ کچھ بوجھل ہوا تو اسے خود سے ہٹ کر بھی کچھ دیکھنے کی توفیق ہوئی۔ اسے اصغر کا خیال آیا۔ وہ بھی تو گوشت کے لئے ترس رہا تھا "اصغر، تو بھی تو کھا۔" اس نے اصغر کو دعوت دی۔

"نہیں یار، تو کھا۔ میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔ پیٹ بھرا ہوا ہے۔" اصغر نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

"کھا لے یار۔ تو بھی تو گوشت کو ترس رہا تھا۔"

"مگر یار، ایک بار پیٹ بھر کر کھانے کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کھایا جاتا۔" اصغر کا خیال تھا کہ دن بھر کے بھوکے اختر کے لئے ہی یہ کھانا کم ہے پھر وہ کیوں اس میں حصہ بٹائے۔

فیضو جو باہر چلا گیا تھا، جگ میں پانی اور گلاس لے آیا۔ اتنی دیر میں اختر پورا کھانا چٹ کر چکا تھا۔ اس نے پانی پیا اور فوراً ہی دری پر لیٹ گیا۔

"ابھی مت لیٹ۔ پہلے یہ پی لے۔" فیضو نے اس کی طرف ایک بڑی بوتل بڑھائی۔

"یہ کیا ہے فیضو بھائی۔"

"دودھ ہے۔ اس میں ہلدی ملائی ہے۔ میری بیوی کہتی تھی، یہ سارا درد کھینچ لے گا۔ جلدی سے پی لے۔"

اختر اب اٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر فیضو کے اصرار پر اس نے وہ دودھ پی لیا۔ دودھ پی کر وہ جو لیٹا تو اسے فوراً ہی نیند آگئی۔ "میں اب چلتا ہوں۔" فیضو نے اصغر سے کہا "تو اس کے پاس رہ اور اس کا خیال رکھ۔ کہیں درد ہو تو سنکائی کر دینا۔"

"تم دروازہ باہر سے بند کر جاؤ گے؟" اس بار اصغر خوف زدہ ہوگیا۔

"صرف بند کر کے نہیں جاؤں گا، تالا بھی لگاؤں گا۔"

"فیضو بھائی، ہمیں ڈر لگے گا۔" اصغر نے کہا پھر اسے ایک اور بہانہ بھی مل گیا "اور جو مجھے یا اختر کو پیشاب لگا تو؟"

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔" فیضو نے کہا "پتا ہے، شاہ صاحب نے کہلوا دیا تھا کہ اختر کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی۔ ان کا حکم تھا کہ اسے اس کوٹھری میں اکیلا ڈال دیا جائے پھر بھی میں جو کر سکتا تھا، میں نے اس سے زیادہ کیا ہے۔ اب میں دروازہ کھلا چھوڑ دوں اور تم لوگ بھاگ جاؤ ......" یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ "...... تو میری تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ دیں گے نا۔ اس لئے میں دروازہ بھی بند کروں گا اور تالا بھی لگاؤں گا۔ اب کوٹھری میں ایک کدال پڑی ہے، اس کی مدد سے تم دیوار توڑ کر نکل جاؤ تو اور بات ہے۔ نہ وہ کدال میں نے یہاں رکھی، نہ میں اس کا ذمے دار ہوں۔ بلکہ میں کہہ دوں گا کہ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ سمجھے کچھ؟"

نو سالہ اصغر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر بھی اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"یہ ہلدی درد تو کھینچ لے گی مگر اس کے جسم پر زخم بھی ہیں۔ ان پر مرہم لگاتے رہنا۔ ہلدی بھی لگا دینا اور سنکائی بھی کرنا۔ ابھی کل تک تو یہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا مگر مشکل سے۔ تو اس کا خیال رکھنا۔ تیری یہاں موجودگی کا میرے اور نظام کے سوا کسی کو پتا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے فیضو بھائی!"

"اب میں چلتا ہوں۔" فیضو نے کہا۔

فیضو چلا گیا تو اصغر نے جا کر دروازے کی آزمائش کی۔ دروازہ واقعی بند تھا پھر اس نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں اسے وہ کدال نظر آگئی، جس کا تذکرہ فیضو نے کیا تھا۔ اس نے جا کر کدال کو اٹھایا اور ہاتھوں میں تول کر دیکھا۔ کدال خاصی بھاری تھی۔ اس نے آزمائش کے طور پر کدال زمین پر ماری۔ اسے خوشی ہوئی کہ بھاری ہونے کے باوجود وہ کدال استعمال کر سکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ فیضو نے کدال سے دیوار توڑ کر نکلنے کا امکان بھی ظاہر کیا تھا۔ چناں چہ اس نے کدال کی دھار کو کچی دیوار پر بھی آزمایا۔ اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا تھا۔ یعنی دیوار توڑی جا سکتی تھی۔

اصغر نے کدال کو ایک طرف رکھا اور اختر کے قریب آ بیٹھا۔ وہ فیضو کی باتوں

پر غور کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ایک بات تو سمجھ میں آئی تھی اور وہ یہ کہ یہاں سے بھاگا جاسکتا ہے مگر بھاگ کر کہاں جائیں گے وہ؟ دنیا میں ان کا کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔ کہاں پناہ ملے گی انہیں؟ اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ضرورت بھی کیا ہے بھاگنے کی۔

وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا مگر یقینی طور پر رات کافی ہو چکی تھی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ دری خاصی بڑی تھی۔ وہ وہیں پڑگیا۔ اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اختر کا درد تو بہت کم ہوگیا تھا مگر جس طرح کی اسے مار لگی تھی، اس کے نتیجے میں جسم کے بیش تر حصے بری طرح دکھ رہے تھے۔ سوتے میں بے خیالی میں جو اس نے پہلو بدلا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کی چیخ سن کر اصغر جاگا۔ اس بار اس نے زخموں پر مرہم بھی لگایا اور بند چوٹوں پر بھی ہلدی کا لیپ کیا۔

دونوں بچوں کی رات اسی طرح گزری۔ جانے کتنی بار اختر ایسے ہی چیخ مار کر جاگا ..... کبھی تکلیف کی وجہ سے اور کبھی کسی ڈراؤنے خواب کی وجہ سے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر کو تقریباً پوری رات جاگنا پڑا۔

"صرف گوشت کی ضد میں تو نے اپنا یہ حال کرالیا۔" ایک بار اصغر نے اسے ملامت کی "کیا پتلی دال کھانے سے مرجاتا۔ پتلی دال کھا کر بھی زندہ رہا جاسکتا ہے۔"

"عمر بھر پتلی دال کھا کر ہی تو زندہ رہا ہوں۔" اختر نے جواب دیا "مگر اب سوچتا ہوں، کیا یہ زندہ رہنا ہے کہ آدمی اپنا حق بھی نہ مانگ سکے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ حق مانگتے ہوئے مرجائے۔" چھوٹا سا بچہ اپنی عمر سے بہت بڑی بات کر رہا تھا۔ یا تو وہ اصل مفہوم سے بے خبر تھا اور محض لفظ ادا کر رہا تھا یا پھر زندگی نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

"کیا حاصل ہوا تجھے؟"

"یار اصغر، میں اس موٹے پیٹ والے شاہ جی سے صرف ایک ..... صرف ایک بوٹی مانگ رہا تھا۔" اختر رو دیا "وہ مجھے گوشت میں تلوا سکتا تھا مگر اس نے مجھے ایک

بوٹی بھی نہیں دی۔ پتا ہے، کیوں نہیں دی۔"

اصغر نے نفی میں سرہلایا۔

"اس لیے نہیں دی کہ کہیں مجھے اپنا حق مانگنے کی عادت نہ پڑ جائے اور جانتا ہے، اس نے مجھے اتنا کیوں مارا؟"

"کیوں مارا؟"

"اس لیے کہ میں دوسروں کو ان کے حق کے بارے میں نہ بتاؤں۔ انہیں یہ نہ بتاؤں کہ جو کچھ ان کے لئے آتا ہے، وہ دوسرے کھا جاتے ہیں اور اس لئے کہ میں نے غصے میں اس سے کہا تھا کہ میں دینے والوں کو بھی بتا دوں گا۔"

"مگر اس سب کے بعد تجھے تو کچھ بھی نہیں ملا۔" اصغر نے تاسف سے کہا۔

"مجھے بہت ڈر لگا۔ اب بھی لگ رہا ہے۔ پتا ہے، اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" اختر کے لہجے میں خوف تھا "مجھے اس وقت بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

اصغر اس سے زیادہ خوف زدہ ہوگیا "شاہ جی ایسا کر بھی سکتا ہے۔"

"ہاں، کر سکتا ہے مگر اصغر اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو اصغر اس کی مخالفت کرتا مگر اس وقت تو اس پر شاہ جی کا خوف طاری تھا "مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"دیکھیں گے۔ دنیا بہت بڑی ہے اور ہم باہر جا کر خوب جی بھر کر گوشت کھائیں گے۔"

یہی باتیں کرتے کرتے صبح ہوگئی۔



اس صبح ریاض احمد کی آنکھ سویرے ہی کھل گئی۔ رات بھی وہ ٹھیک طرح سے سوئے نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ تھکن اور بڑھ گئی تھی' جسے دن بھر سمیٹنے کے بعد وہ بستر تک لے گئے تھے۔ اب جاگے تو بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے لیکن جب سے وہ لوگ اس گھر میں آئے تھے' سلمیٰ بیگم انہیں سویرے اٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

"اتنی تھکن ہوتی ہے۔ آپ سو تو اچھی طرح لیا کریں۔" وہ کہتیں۔ "اور آپ کو کون سا جلدی جانا ہوتا ہے۔" بات درست تھی۔ لہٰذا ریاض احمد لیٹے رہتے۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی جلدی اٹھ گئے۔ دونوں بڑے بچے اسکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چھوٹا فیاض ہنگامہ کر رہا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ سلمیٰ بیگم تینوں کو کیسے نمٹاتی ہیں۔

سلمیٰ بیگم کمرے میں آئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور باتھ روم جانے کا ارادہ کر رہے تھے؟ ارے ..... آپ اتنی جلدی اٹھ گئے؟"

"ہاں ' آنکھ کھل گئی۔ رات نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔"

سلمیٰ بیگم نے ان کا ہاتھ چھو کر دیکھا اور تشویش سے بولیں۔ "آپ کو تو حرارت ہے۔"

"ہاں ' جسم بھی ٹوٹ رہا ہے۔"

"آپ باتھ روم سے فارغ ہو کر لیٹ جائیں ....."

"میں سوچ رہا ہوں کہ ناشتا بچوں کے ساتھ کروں۔"

"ارے نہیں۔ آپ لیٹیں۔ میں آپ کو یہیں ناشتا دے دوں گی۔ وہاں تو بڑا

ہنگامہ ہے۔ سر میں درد ہو جائے گا آپ کے۔"

ریاض احمد نے مدت سے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا نہیں کیا تھا۔ بہت دل چاہ رہا تھا ان کا لیکن بیگم کے لہجے میں ایسا اصرار تھا کہ وہ اسے رد نہ کر سکے۔ باتھ روم سے باہر آکر وہ بستر پر بیٹھ گئے۔ ڈائننگ روم کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"جلدی کرو بیٹے ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔" سلمیٰ بیگم کہہ رہی تھیں۔

"امی' مجھ سے خالی ڈبل روٹی نہیں کھائی جاتی۔" اشعر نے تنک کر کہا۔

"تم ٹھیک طرح سے کھاتے نہیں ہونا' اس لیے۔ چائے میں بھگو کر کھاؤ۔"

"امی کتنے دن ہو گئے' مکھن نہیں کھایا۔"

"تھوڑے دن کی بات ہے پھر جی بھر کے مکھن کھلاؤں گی تمہیں۔"

"اور پنیر بھی۔" یہ فیاض کی آواز تھی۔

"ہاں ' پنیر بھی۔"

"اور جام اور جیلی بھی .... اور انڈا بھی۔"

"ہاں ہاں' سب کچھ ملے گا انشاء اللہ۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ تھوڑے دن کب پورے ہوں گے۔" اشعر بولا۔

"جب اللہ کی مرضی ہوگی' پورے ہو جائیں گے۔"

"امی' پہلے ابو روز یہ سب چیزیں لے کر آتے تھے۔ اب کچھ نہیں لاتے۔ اب تو ہمیں شہد اور بادام بھی نہیں ملتا۔" فیاض نے شکایت کی۔

"سب کچھ اللہ میاں دیتے ہیں بیٹے۔ آدمی کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ پھر اللہ میاں کبھی کبھی محروم کر دیتے ہیں تاکہ آدمی کو ان چیزوں کی اہمیت کا پتا چلے اور یہ بھی سمجھ میں آئے کہ سب کچھ اللہ میاں دیتے ہیں۔"

"ہماری تو سمجھ میں آگیا امی۔"

"تو اب تمہیں سب کچھ مل جائے گا انشاء اللہ۔"

کرسیاں کھسکانے کی آواز آئی پھر سلمیٰ بیگم نے کہا "اور لو نا۔"

"نہیں امی۔ مجھ سے زیادہ نہیں کھایا جاتا۔" یہ اشعر تھا "اور امی' آج گوشت

ضرور پکائیے گا۔"

"آج میں تمہارے لیے گوشت سے بھی اچھی چیز پکاؤں گی۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ گوشت نہیں پکاتیں۔"

"اچھا بیٹے' اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ امی۔"

اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھے ریاض احمد کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ بچوں کا کہا ہوا ایک لفظ ان پر گھونسا بن کر لگا تھا۔ اتنے دنوں میں انہوں نے اس زاویے سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ بچوں کی محرومی تو بہت بڑی ہے۔ انہیں کیا پتا کہ حالات بدلنا کسے کہتے ہیں اور برا وقت کیا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں بیوی پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ واقعی اچھی بیوی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ سلمیٰ بیگم نے انہیں اس گھر میں بچوں کے ساتھ ناشتا کیوں نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ انہیں اس کرب سے بچاتی رہیں .... اور خود سہتی رہیں سب کچھ اور وہ بچوں کو کتنی اچھی طرح ہینڈل کر رہی تھیں۔

مگر پھر ان کا دل کٹنے لگا۔ بچے ناشتے میں خالی ڈبل روٹی کھا رہے تھے۔ وہ ان کے حلق میں پھنس رہی ہوگی مگر فوراً" ہی انہیں یہ خیال آیا کہ یہ ڈبل روٹی کہاں سے آئی۔ انہوں نے تو ایک ماہ سے سلمیٰ بیگم کو پیسے ہی نہیں دیے تھے۔ آخری بار جو پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تھے' اس سے انہوں نے گھر میں راشن ڈلوا لیا تھا اور اپنے کرائے کے لئے پیسے سنبھال کر رکھ لیے تھے اور اس کے بعد انہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ممکن ہے' راشن ختم ہوگیا ہو۔ وہ باہر کی پریشانیوں میں گم ہوگئے۔ گھر کا خیال ہی نہیں رہا انہیں۔ سلمیٰ بیگم نجانے کیسے گھر چلا رہی ہیں۔

سلمیٰ بیگم لان کے لئے چائے اور گھی میں سنکے ہوئے سلائس لے کر آئیں۔ ریاض احمد نے دیکھا کہ گھی برائے نام ہی استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے بے دلی سے ناشتا کیا۔ اور بیوی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے رہے "بچے بہت فرسٹریٹ ہوگئے ہیں۔" انہوں نے اچانک کہا۔

"جی نہیں۔" سلمیٰ بیگم مسکرائیں "خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو

اتنے سمجھ دار بچے عطا فرمائے۔ اتنی سی عمر میں حالات سے سمجھوتا کرنا آسان نہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" ریاض احمد نے بے حد خلوص سے کہا "مگر آج مجھے شرمندگی بہت ہوئی ہے۔ میں اپنی نظروں سے گر گیا ہوں۔"

سلمیٰ بیگم نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "ایسے نہ سوچیں۔ وقت اچھا ہو یا برا' آپ تو ان کے مہربان باپ ہیں اور سچ' آپ کے بچے تو بہت پیارے ہیں۔ کب سے اسکول جاتے وقت میں نے انہیں پیسے نہیں دیے۔ ایک دن ناشتا بھی نہیں کرکے گئے۔ دیر سے سو کر اٹھے تھے ہم لوگ۔" انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "اس روز میں بریک میں ان کے لئے لنچ باکس لے کر گئی تو جانتے ہیں' کیا دیکھا میں نے؟"

ریاض احمد نم آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

"سب بچے ادھر ادھر چیزیں خریدتے اور کھاتے پھر رہے تھے۔ اشعر اور میمونہ بے فکروں کی طرح سب سے الگ تھلگ پکڑم پکڑی کھیل رہے تھے۔ انہیں گردوپیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔ مجھے اس وقت ان پر ایسا پیار آیا کہ کیا بتاؤں۔ سچ .... بہت اچھے بچے ہیں۔"

"اور آپ بہت اچھی بیوی ہیں سلمیٰ بیگم!" ریاض احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا "یہ بتائیں کہ میں نے کب سے آپ کو پیسے نہیں دیے۔ آپ کیسے کام چلا رہی ہیں؟"

"اسے چھوڑیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکرائیں "لیکن آپ میرے مقروض ہو رہے ہیں۔"

"وہ تو میں ہوں اور رہوں گا۔" ریاض احمد نے کہا "مگر ایک بات کہوں۔"

"کہیے۔"

"آج آپ مجھے کچھ نہ دیں۔ گوشت پکالیں۔ بچے ہڑک گئے ہیں گوشت کو۔"

"میں یہ کردیتی لیکن سوچیں تو' صرف کل کا دن بیچ میں ہے۔ پرسوں بقرعید ہے۔ انشاء اللہ خوب اچھی طرح گوشت کھالیں گے۔ آج میں انہیں بہلالوں گی۔ سوچا ہے' بیسن کی کھنڈویاں پکالوں گی بہت اچھی طرح۔ آپ بے فکر رہیں۔"

ریاض احمد ممنونیت سے انہیں دیکھتے رہے۔

○

باجی صبح ہی اٹھیں۔ انہوں نے جلدی جلدی شوہر کے لئے ناشتا تیار کیا۔ انہیں جلدی نکلنا ہوتا تھا۔ پک اپ پوائنٹ سے کمپنی کی گاڑی میں بیٹھے تو دفتر پہنچتے۔ لیٹ ہو جاتے اور گاڑی نکل جاتی تو بڑی دشواری ہوتی۔ کمپنی کے دفاتر شہر سے اچھا خاصا باہر تھے۔ اپنے طور پر وہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ کم از کم دو تین گھنٹے لگتے۔

وہ دفتر چلے گئے تو چندو کے معمولات کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے باجی نے چندو کو خوشبو دار صابن سے رگڑ رگڑ کر نہلایا۔ تولیے سے اس کا جسم اچھی طرح خشک کرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اسے سویٹر پہنایا۔ چندو کے پاس کئی سویٹر تھے۔ وہ سب باجی نے خود بنے تھے۔ نہلانے کے بعد چندو کو سویٹر پہنانا بہت ضروری تھا۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو اسے چھینکیں آنے لگتیں۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد باجی ڈرائی فروٹ کا ڈبا نکال لائیں۔ انہوں نے معمول کے مطابق سات بادام' سات پستے اور اخروٹ کی گری کے تین دانے نکال کر پلیٹ میں رکھے۔ یہ بھی ان کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ چندو نے وہ فوراً ہی ہڑپ نہیں کیے بلکہ سکون سے کھائے۔ شروع میں وہ اسے ٹوکتی تھیں "جانوروں کی طرح ایک دم سے نہیں کھا جاتے۔ خوب چبا چبا کر کھایا کر۔"

چندو نے تمام چیزیں خوب چبا چبا کر کھائیں۔ مزید کا تقاضا تو وہ ہمیشہ کرتا تھا لیکن گزشتہ روز کا بے حساب ڈرائی فروٹ کھانے کا تجربہ اسے یاد تھا۔ باجی ڈبا لے کر اٹھنے لگیں تو اس نے دانتوں میں ان کا دامن دبا کر انہیں ملتجی نظروں سے دیکھا۔

باجی نے معمول کے مطابق اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے اسے غریب والدین کے حوالے سے سمجھایا۔ پھر انہوں نے بادام اور اخروٹ زیادہ کھانے

کے نقصان گنوانے شروع کیے تو چندو زور زور سے سر ہلانے لگا۔ باجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر وہ سمجھ گئیں۔ چندو بے زبان ضرور تھا۔ اس کے باوجود پوری وضاحت اور صراحت سے انہیں بتا رہا تھا کہ گزشتہ روز اس نے جی بھر کے بادام' پستہ اور اخروٹ کھایا تھا پھر بھی خون آیا تھا' نہ کوئی نقصان ہوا تھا۔

باجی شرمندہ ہوگئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے "چندو بیٹے' ٹھیک ہے تجھے نقصان نہیں ہوا لیکن تجھے یہ تو نہیں معلوم کہ یہ چیزیں کتنی مہنگی ہیں اور تیرے ماں باپ سچ مچ اتنے امیر نہیں کہ ان چیزوں کی بوریاں خرید سکیں۔ کیوں میرا دل دکھاتا ہے۔ اللہ نے دیا تو بوریوں کے حساب سے بھی کھلاؤں گی تجھے مگر ابھی تو اتنی حیثیت نہیں میری۔"

چندو نے باجی کا دامن چھوڑا اور ان کی پنڈلیوں سے سر رگڑنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو..... میں سب سمجھتا ہوں امی۔ معاف کر دیں آئندہ آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔

باجی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولیں "ابھی میں تیرے لیے ناشتا لاتی ہوں۔"

چندو کا ناشتا دو مرحلوں میں مکمل ہوتا تھا۔ پہلا انسانی ناشتا ہوتا تھا۔ اس میں ڈبل روٹی کے سلائس' دودھ' شہد' بالائی اور مکھن ہوتا تھا۔ چندو یہ تمام چیزیں بڑی رغبت سے اور حتی الوسع بے حد تہذیب سے کھاتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں اسے دنبے کا ناشتا ملتا تھا۔ چنے کی دال رات کو بھگو دی جاتی تھی پھر ہری بھری تازہ گھاس ہوتی تھی۔ کبھی دانہ بھی ہوتا تھا۔

چندو کو ناشتا کرانے کے بعد باجی نے کہا "جا چندو اب کھیل۔" پھر انہوں نے اپنے ناشتے کی فکر کی۔ چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر انہوں نے رات کا سالن نکالا اور اسے رات کی بچی ہوئی روٹی کے ساتھ سوارت کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں چائے بن گئی۔ چائے کی پیالی لے کر وہ آنگن میں آگئیں۔

آنگن میں ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ باجی کے انداز میں عجلت نہیں تھی ورنہ وہ عام طور پر ٹھیک سے ناشتا نہیں کرسکتی تھیں۔ اسکول کے لئے لیٹ ہو جانا بھی

انہیں قبول نہیں تھا اور چندو کے معمولات میں کوئی کمی رہ جائے' یہ بھی وہ برداش
نہیں کرسکتی تھیں مگر اب اسکول کی بقرعید کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔

ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر سکون سے بیٹھیں پھر انہیں خیال آیا کہ گھر کی صف
کرلی جائے۔ انہیں صفائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ یہ ان کا فرصت کا سب سے پسند
مشغلہ تھا۔ وہ فوراً" ہی گھر کی جھاڑ پونچھ میں جت گئیں۔



نعمت آپا کو وہ علاقہ چھوڑے دو سال ہوچکے تھے مگر مہینے پندرھواڑے میں
یہاں کا ایک چکر ضرور لگاتی تھیں۔ کچھ اس لیے کہ ان کی جڑیں اب بھی یہ
تھیں۔ یہاں ان کا ایک حلقہ تعلقات تھا جو ابھی تک نئے علاقے میں نہیں بن
تھا۔ دوسرے باجی سے انہیں بڑی محبت تھی۔ صحیح معنوں میں تو وہ باجی سے ملنے
کے لئے یہاں آتی تھیں۔

اس روز نعمت آپا گلی میں داخل ہوئیں تو سب سے پہلے زیب النساء ا
دروازے پر کھڑی نظر آگئی۔ اس سے علیک سلیک ہوئی پھر نعمت آپا نے کہا "باجی کی
آج چھٹی ہوگی۔ گھر پر ہی ہوں گی۔ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" زیب النساء نے جواب دیا پھر مسکرائی "مجھے معلوم ہے' آپ ا
سے ملنے آئی ہیں۔ ہم تو آپ کے کچھ لگتے ہی نہیں۔"

"یہ بات نہیں مگر باجی سے تعلق ہی کچھ اور ہے۔ پھر بھی میں سب سے ہی
ہوں۔"

"میں آپ کو چائے پلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ جلدی سے لے آؤ۔ آج دراصل میں ایک کام سے آ
ہوں۔"

"باجی کے پاس؟"

"ہاں۔"

"خیر تو ہے۔" زیب النساء نے انہیں چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔

"ایک مشورہ دینے آئی ہوں..... چندو کے سلسلے میں۔"

"چندو کے سلسلے میں؟ وہ کیا؟" زیب النساء کی آنکھیں چمکنے لگیں "شادی کرائیں گی اس کی؟"

"نہیں۔ میں باجی سے کہوں گی کہ وہ اس کی قربانی کردیں۔"

نعمت آپا نے سنجیدگی سے کہا۔

زیب النساء کا ہاتھ سیدھا اپنے دل پر گیا۔ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔ "کیسی بات کرتی ہیں آپا۔ اللہ نہ کرے۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"کیوں بھئی' وہ باجی کا ہی نہیں' گلی کے ہر گھر کا بیٹا ہے..... سچ مچ کا بیٹا۔"

"ارے بھئی' وہ جانور ہے۔ محض ایک دنبہ ہے۔"

"آپ کو لگتا ہوگا۔" زیب النساء نے جذباتی ہوکر کہا۔ آپا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ لڑ پڑتی۔ لتے لے ڈالتی اس کے "کون اسے جانور کہے گا۔ گھر کو تو چھوڑیں' اس نے باہر بھی کبھی گندگی نہیں کی۔ کون سا ایسا جانور ہے' جو رفع حاجت کے لئے بیت الخلا جاتا ہو' جو انسانوں کی طرح پیار کرتا ہو' ہر بات سمجھتا ہو۔"

"اس کے باوجود بھی وہ جانور ہی ہے۔ کپڑے چبا کر خراب کرتا ہے یا نہیں۔"

"وہ تو میں نے بچوں کو بھی یہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔" زیب النساء نے مدافعانہ انداز میں دلیل دی "میرے کتنے ہی کپڑے چبا ڈالے اس نے۔ ایسے ایسے کپڑے کہ کوئی اور ہوتا تو میں جان سے مار ڈالتی اسے۔ مگر آپا' مجھے چندو سے محبت ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ سبھی اس سے محبت کرتے ہیں' ہر گھر کا کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی نقصان کیا ہے اس نے مگر کسی نے اف بھی نہیں کی۔ گلی کی تو رونق ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور گہری سانس لے کر بولی "آپا..... سوچیں تو چندو ہے کتنا خوب صورت۔" چندو کی تعریفوں میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ آپا اسے قربان کرنے کی تجویز لائی ہیں۔

"دنبے تو ہوتے ہی خوب صورت ہیں۔" نعمت آپا نے کہا۔

"کچھ ہوتے ہیں' کچھ نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں' وہ بھی چندو جیسے خوب

صورت نہیں ہوتے۔ آپ یہاں رہتی نہیں ہیں نا' اس لئے آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ میں نے چندو جیسا خوب صورت کوئی نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد' دہانے کے گرد اور چاروں ہاتھ پاؤں پر سیاہ حلقے دیکھیں۔ ایسا میں نے کہیں نہیں دیکھا اور بڑی بڑی آنکھیں دیکھیں ......"

"دنبوں کی آنکھیں بڑی ہی ہوتی ہیں۔" آپا بولیں۔

"بے شک ..... ہوتی ہیں مگر اتنی خوب صورت نہیں ہوتیں اور چندو تو آنکھوں سے تمام باتیں کرتا ہے۔ بتائیں کہیں وہ بے زبان لگتا ہے؟"

"تم اپنی باتوں پر غور کرو۔ تم خود اسے دنبہ ہی سمجھتی ہو .... ایک جانور!"

"وہ تو ہے آپا مگر کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ وہ دنبے کے بھیس میں کوئی اور ہے۔"

"کیا مطلب؟" آپا بری طرح چونکیں "تمہارے خیال میں کون ہے وہ؟"

"کوئی جن' کوئی پری زاد۔ یہ لوگ تو اس طرح کے بھیس میں ہوتے ہیں نا آپا۔"

"سنا تو ہے مگر میں نہیں مانتی۔ چندو میں ایسی کون سی بات دیکھی ہے تم نے؟"

"اس کی آنکھیں آپا ..... مجھے وہ ایسے دیکھتا ہے کہ میں کسی مرد کو اس طرح دیکھتے دیکھ لوں تو پانی پانی ہو جاؤں۔ عبدالصمد کبھی کبھی ایسے دیکھتا ہے تو میں اسے ٹوک دیتی ہوں اور چندو ہمیشہ مجھے ایسے ہی دیکھتا ہے اور وہ مجھ سے جیسے لپٹتا ہے' جیسے مجھے پیار کرتا ہے' کسی کو نہیں کرتا۔ آپا یہاں چومتا ہے ..... یہاں۔" زیب النسا نے ہونٹوں کی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا پھر وہ شرما گئی۔

آپا اب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "اچھا' فرض کرلو' وہ دنبے کے جسم میں کوئی اور ہے تو تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر لگتا ہے آپا۔" زیب النسا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "پر اس کی محبت جیت جاتی ہے۔ پیار آنے لگتا ہے اس پر۔ مجھے بہت محبت آتی ہے اس کی۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ دنبہ ہی ہے۔" آپا نے کہا

"اچھا میں چلتی ہوں۔"

"باجی سے یہ بات نہ کہئے گا۔ وہ بہت ناراض ہوں گی۔ اپنا بیٹا کوئی قربان کرتا ہے آپا۔"

"یہ قربانی کی رسم یادگار ہی بیٹے کو قربان کرنے کی ہے۔" آپا اٹھ کھڑی ہوئیں۔



صفائی سے فارغ ہونے کے بعد باجی چندو کی واسکٹ لے بیٹھیں۔ زوبفت کی یہ واسکٹ وہ اسے عید کے دن پہنانے کے لیے سی رہی تھیں۔ بہت خوب صورت واسکٹ تھی۔ سیتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ چندو دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پکارا "چندو؟"

چندو جاتے جاتے رک گیا۔

"دور نہ جانا۔ گلی میں ہی رہنا۔ ایک آواز پر چلے آنا۔ سمجھے چندو۔"

چندو باہر چلا گیا۔ باجی پھر مشین پر جھک گئیں۔ دو منٹ بعد دروازے پر آہٹ ہوئی تو انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے خیال میں چندو واپس آیا تھا مگر نعمت آپا کو دیکھ کر وہ مسکرا دیں "آؤ نعمت' کیسے رستہ بھول پڑیں؟"

"آپ یہ بات کہہ رہی ہیں باجی۔" نعمت آپا کے لہجے میں شکایت تھی "جب کہ مہینے میں دوبار میں لازمی طور پر آتی ہوں۔"

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آؤ بیٹھو۔ میں یہ واسکٹ مکمل کر کے تمہیں چائے پلاؤں گی۔"

"یہ واسکٹ کس کی ہے؟"

"چندو کی ہے۔ عید پر پہناؤں گی اسے۔" باجی نے کہا "بس تھوڑی سی سلائی رہ گئی ہے۔ پرسوں تو عید ہے نا۔"

آپا کا دل بیٹھنے لگا۔ اب وہ قربانی کی بات کیسے کریں۔ یہاں تو عید کی تیاری ہو رہی ہے۔

باجی تمام وقت چندو کی باتیں کرتی رہیں۔ چندو کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں

تھا۔ چندو کچھ زیادہ ہی شریر ہوگئے ہیں مگر فرماں برداری میں کمی نہیں آئی ہے۔ چندو میاں یہ کرتے ہیں' چندو میاں وہ کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات تھی باجی میں۔ چندو کے غیاب میں وہ اس کے متعلق گفتگو بہت احترام سے کرتی تھیں۔ سامنے تو تڑاخ ہوتی تھی مگر موجود نہ ہوتے تو چندو میاں محترم ہو جاتے۔

باجی نے چندو کا گزشتہ روز والا ایڈونچر آپا کو سنایا۔ ڈرائی فروٹ والا۔ آپا مسکراتی رہیں مگر دل میں خود کو ملامت کرتی رہیں۔ جو کہنے کا ارادہ کر کے آئی تھیں' کہہ دیتیں تو باجی کا تو دل خون ہو جاتا۔ ممکن ہے' تعلقات ہی ختم ہو جاتے۔

باجی نے واسکٹ مکمل کی' اسے کمرے میں رکھا اور چائے بنانے چلی گئیں۔ اس دوران نعمت آپا اپنی تجویز کے سلسلے میں غور و فکر کرتی رہیں۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ باجی کو اس طرح کا مشورہ دینا مخدوش ضرور ہے مگر ان کی نیت صائب ہے' اس لیے وہ دے سکتی ہیں۔

باجی چائے لے آئیں۔ چائے پی گئی اور اس دوران بھی چندو میاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پینے کے بعد آپا نے اچانک کہا۔ "یہ چندو کہاں غائب رہتا ہے۔ کب سے میں نے نہیں دیکھا اسے۔"

"ارے یہیں گلی میں کھیل رہا ہے۔ ایک آواز دوں گی تو چلا آئے گا۔" باجی نے بڑے مان سے کہا۔

"تو پھر ذرا بلائیں تو اسے۔"

"چندو ..... چندو بیٹے۔" باجی نے دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا "آجا میرے بیٹے۔"

چند سیکنڈ بعد ہی چندو مستانہ وار چلتا گھر میں داخل ہوا۔ آتے ہی باجی کی گود میں گھس کر لیٹ گیا "دیکھا" کتنا کہنا مانتا ہے۔ میں نے کہا تھا' دور نہ جانا۔ گلی میں ہی کھیلنا۔" باجی نے فخریہ لہجے میں کہا۔

نعمت آپا چندو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زیب النساء نے سچ کہا تھا۔ چندو واقعی بہت خوب صورت ہے۔ آنکھوں کے گرد' تھوتھنی کے گرد سیاہ حلقے بہت ہی خوب صورت لگتے تھے اور اس کی آنکھیں ..... وہ واقعی غیر معمولی تھیں۔ وہ بولتی

تھیں۔ وہ اس وقت باجی کو جس محبت سے دیکھ رہا تھا' وہ واضح اور یقینی تھی اور باجی اس سے جو محبت کرتی تھیں' وہ تو اظہر من الشمس تھی۔

"باجی ..... آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا برا چاہنے والی نہیں۔" نعمت آپا نے تمہید باندھی۔

"جانتی ہوں نعمت۔ بات کیا ہے؟"

"میں ایک ایسی بات کہنا چاہتی ہوں' جو آپ کو بہت سخت لگے گی۔ ناگوار گزرے گی۔ ہوسکتا ہے' آپ میری نیت پر بھی شک کریں۔"

"کچھ بھی ہو' تم کہہ دو۔" باجی نے گمبھیر لہجے میں کہا "اس لیے کہ تمہارے نزدیک اسے کہنا ضروری بھی ہے۔ ورنہ تم یہ تمہید نہ باندھتیں۔"

نعمت آپا سوچ میں پڑگئیں۔ وہ پوری دنیا میں گھوم پھر کر لفظوں کے حسین ترین پھول جمع کریں اور پھر اس بات کو گل دستے کے روپ میں باجی کو دیں' تب بھی باجی کے لئے تو وہ کھینچ کر مارا ہوا پتھر ہی ہوگا "باجی ..... میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ آپ اس سال چندو کی قربانی کردیں۔"

پہلے تو باجی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر جب سمجھیں تو وہ بے یقینی سے نعمت آپا کو گھورتی رہیں "کیا مطلب ہے تمہارا؟" ان کے لب ہلے "چندو کی قربانی کردوں؟ اپنے بیٹے کی قربانی کردوں؟" انہوں نے سر جھکا کر گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے چندو کو دیکھا' جو انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

"جی باجی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا ہے۔"

"نعمت' مجھے تمہارے خلوص پر' تمہاری نیت پر پورا بھروسا ہے اس لئے یہ بات برداشت کرلی ہے۔" باجی کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا "گلی میں تو کیا اس پورے علاقے میں کوئی اور مجھ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں اس لیے کہ وہ سب چندو سے محبت کرتے ہیں ...... اور جانتے ہیں کہ چندو کے لئے میری محبت ان سے ہزار گنا بڑی ہے اور تم نے یہ بات اس لیے اتنی آسانی سے کہہ دی کہ تم یہاں سے چلی گئی تھیں' جب میں نے چندو کو پالا۔ تم نے اسے پلتے ہی نہیں دیکھا۔ اس کی شرارتیں' اس کی محبت بھری

ادائیں نہیں دیکھیں۔ جس نے یہ سب کچھ دیکھا ہے' مجھ سے یہ کہتے ہوئے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

نعمت آپا کو دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے تو واقعی چندو کو نہیں دیکھا۔ دیکھنے والوں میں ایک زیب النساء سے تو وہ بات کرچکی تھیں۔ اس کا ردعمل وہی تھا' جو باجی بتا رہی تھیں "باجی .... میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ یہ قربانی کا موقع ہے۔"

"دیکھو نعمت' میں صاحب نصاب نہیں ہوں۔ ہوتی تو بھی میں بازار سے جانور خرید لاتی۔ اپنا بیٹا تو قربان نہ کرتی۔"

"بازار سے جانور تو سبھی لاتے ہیں باجی۔" نعمت آپا نے گہری سانس لے کر کہا "قربانی کی روح کو کون سمجھتا ہے۔ اللہ کو کسی کے پیسے کی ضرورت تو نہیں نعوذ باللہ ..... نہ دو ہزار کی نہ ایک لاکھ کی۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کون اس کا کتنا فرماں بردار ہے۔ کون اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔"

نعمت آپا نے جس گداز لہجے میں بات کہی تھی' اس نے باجی کے دل کو چھو لیا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو نعمت۔" انہوں نے بہت نرم لہجے میں کہا "لیکن سوچو تو۔ چندو میرا بیٹا ہے ..... میری کائنات ہے۔ اسے قربان کرکے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔"

"خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں باجی' جو اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کردیں۔ وہ خالی ہاتھ تو نہیں رہتے۔ دونوں جہاں ان کے ہوتے ہیں۔ یہ سعادت خود سے تو کما بھی نہیں سکتا کوئی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے نعمت لیکن چندو میرا بیٹا ہے .... سچ مچ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اسے قربان کردوں ......"

"یہی تو اللہ نے کہا ہے باجی۔ اللہ نے حضرت ابراہیم سے ان کی عزیز ترین شے کی قربانی طلب کی تھی ...... اور آخر میں کیا ثابت ہوا۔ یہی نا کہ انسان کو سب سے زیادہ عزیز اولاد ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم نے یہ قربانی پیش بھی کردی۔ اللہ نے قبول بھی فرمائی اور بیٹا بھی واپس دے دیا آپ کو۔ اسی محبت اور اطاعت کی یادگار تو

ہے یہ قربانی' جو ہم ہر سال پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ واقعی قربانی ہے بھی یا نہیں۔" نعمت آپا کہتے کہتے رکیں پھر گہری سانس لے کر بولیں" آپ خوش نصیب ہیں باجی کہ اللہ نے آپ کو چندو کے لئے اولاد کی سی محبت دی۔ اس لئے کہ کچھ بھی ہو' چندو ہے تو دنبہ ہی .... اور قربانی کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے۔ اللہ نے آپ کے لئے ایک مقبول قربانی کا اہتمام کر دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ کمزور ثابت ہوتی ہیں یا ثابت قدم۔ میری بات مان لیجئے باجی۔"

باجی کا ضبط جواب دے گیا "اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تمہارے خلوص اور نیت پر مجھے یقین ہے مگر اب تم جتنی بار بھی کہو گی' مجھے گناہ گار کرو گی۔ اس لیے کہ میں سو بار انکار کروں گی' ہزار بار انکار کروں گی۔" باجی کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "جیسے تم مجھے سمجھا رہی ہو' میری جگہ تم ہوتیں تو خود کو کبھی نہ سمجھا پاتیں۔ تمہیں اپنا آپ برا لگنے لگتا۔ وہ بات کہنا بہت آسان ہے' جو خود پر Apply نہ ہوسکے۔"

نعمت آپا کے دل پر چوٹ لگی لیکن جانتی تھیں کہ بات سچی ہے۔ اس وقت وہ تصور کرتیں' خود کو باجی کی جگہ رکھتیں تو بھی اپنے ضمیر کی پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتی تھیں کہ یہ بات مان لیتیں۔ اس لیے کہ تصور میں سب کچھ ہوتا ہے مگر روح نہیں ہوتی' محسوسات نہیں ہوتے۔ جب تک وہ کسی چندو کو ماں بن کر ایسے ہی نہ پالتیں' اس سے متعلق اس طرح محسوس نہیں کرسکتیں۔

"اور مثال تم کس کی دے رہی ہو ..... ایک بے حد محترم پیغمبر کی!" اب باجی بپھر گئی تھیں "میں .... ہم ان کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں۔ ہمارے پاس وہ ظرف کہاں۔ ہاں وہ اوپر والا ہی دے تو دے۔ ہم تو جانور ہی قربانی کرسکتے ہیں۔ یا یوں کہہ لو کہ ہزاروں یا لاکھوں روپے قربان کرسکتے ہیں جانور کے روپ میں۔ یہ ضرور ہے کہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔ "وہ کہتے کہتے رکیں۔" اور نعمت' اب تم چلی جاؤ۔ تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"ٹھیک ہے باجی۔ مجھے افسوس ہے کہ شاید آج میں نے آپ کو ہمیشہ کے لئے کھودیا مگر میرا دل جانتا ہے کہ میں نے یہ بات بھی آپ کی محبت میں' آپ کی بھلائی

کیلئے کی تھی۔ اچھا باجی جاتی ہوں۔"

باجی نے ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ نعمت آپا بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف چل دیں۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ باجی دانستہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔ انہوں نے چندو کو لپٹا رکھا تھا' اور چندو بڑی محبت سے ان کے رخسار کو چوم رہا تھا۔

نعمت آپا نے اس دید کو اپنی نگاہوں میں محفوظ کیا اور باہر نکل گئیں۔ وہ ہار گئی تھیں!



دن کی روشنی میں کوٹھری اتنی خوف ناک نہیں لگ رہی تھی۔ کوٹھری کی چھت میں جو روشن دان تھا' اس سے دھوپ اور روشنی اندر آرہی تھی۔ روشنی اور آگہی کتنی ہی تکلیف دہ ہوں' آخر میں باعث آرام ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اختر نے دن کی روشنی میں اپنے جسم کا جائزہ لیا تو پہلے تو کانپ گیا۔ اصغر کا ردعمل بھی یہی تھا مگر پھر دھیرے دھیرے سکون آگیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اندھیرے میں تو وہ سوچ رہا تھا کہ ان چوٹوں سے جاں بر ہی نہیں ہوسکے گا۔

روشنی کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ انہیں معلوم ہوگیا کہ کہاں مرہم لگانا ہے' کہاں ہلدی کا لیپ کرنا ہے اور کہاں سنکائی۔ فیضو لالٹین میں پوری طرح تیل بھر کے لایا تھا۔ اصغر نے بتی نیچے کردی۔ دن میں اسے صرف سنکائی کے لئے استعمال کرنا تھا۔

اصغر کو تو صبح سویرے ہی سے بھوک ستا رہی تھی۔ اختر کی چوٹوں کو ذرا آرام آیا تو اسے بھی بھوک لگنے لگی۔ وہ دونوں فیضو کا انتظار کر رہے تھے۔ اب دھوپ گھڑی بتا رہی تھی کہ دوپہر ہونے والی ہے۔ اب انہیں فیضو کے نہ آنے سے پریشانی ہو رہی تھی ..... بھوک کے سلسلے میں نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے بارے میں کوئی خطرناک فیصلہ نہ کرلیا گیا ہو۔

"میں تو کہتا ہوں' تجھے شاہ جی سے معافی مانگ لینی چاہیے۔" اصغر نے کہا۔

"اس حرامی سے ..... میں مرجاؤں گا مگر اس سے معافی نہ مانگوں گا۔" رسی جل

گئی تھی مگر بل نہیں گئے تھے۔

"کیا پتا' وہ سچ مچ ہمیں مار کر صحن میں گڑوا دے۔ تو نے مجھے بھی مروا دیا۔"

مگر دن کی روشنی میں یہ تصور اختر کے لئے بے جان تھا کہ انہیں مار کر صحن میں گاڑ دیا جائے گا "اندھی لگ رہی ہے کیا۔" اختر نے تند لہجے میں کہا مگر اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ اتنے دور کا امکان بھی نہیں ہے" ماریں گے تو رات کو ہی ماریں گے نا۔" اس نے جلدی سے کہا "اور رات ہونے سے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

اصغر کی نظریں کونے میں رکھی کدال کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے اختر کو نیفو کی کہی ہوئی تمام باتیں بتا دی تھیں "تو کیا ہم دن میں دیوار توڑیں گے؟"

"نہیں تو کیا رات کو صحن میں گاڑے جانے کا انتظار کریں گے۔ اسی کدال سے؟" اختر نے چڑ کر کہا۔

"مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے یار۔ نیفو بھائی کیوں نہیں آئے؟"

اختر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔ وہ وسوسوں میں گھرے ہوئے تھے۔

خاصی دیر کے بعد کوٹھری کے باہر کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ وہ جانتے تھے' یہ ضروری نہیں کہ آنے والا نیفو ہی ہو' ممکن ہے' ان کے لئے کوئی افتاد ہی ہو۔

لیکن آنے والا نیفو ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور پیالیاں اور ایک تھیلی تھی' جس میں پاپے تھے۔ یہ ساری چیزیں اس نے دری پر رکھ دیں۔

"اتنی دیر کر دی نیفو بھائی۔" اصغر نے شکایت کی۔

"اب بھی جان پر کھیل کر آیا ہوں۔" نیفو نے کہا اور پھر وضاحت کی "شاہ جی نے سختی سے حکم دیا ہے کہ کوٹھری میں کھانے کی کوئی چیز نہ جائے۔ مجھے موقع ہی نہیں مل رہا تھا آنے کا۔ اگر شاہ جی کو پتا چل جائے کہ میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے زمین میں۔"

گاڑنے کے حوالے نے دونوں بچوں کو لرزا دیا۔ انہوں نے عجیب سی نظروں

سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لیے۔

نیفو نے پیالیوں میں چائے انڈیل کر انہیں دی اور پاپوں کی تھیلی کی طرف اشارہ کیا "لو..... کچھ پیٹ میں ڈال لو۔"

دونوں بچے پاپے چائے میں بھگو بھگو کر کھانے لگے۔

"اب تیری چوٹیں کیسی ہیں اختر؟"

"اب تو بہت آرام ہے نیفو بھائی۔ چل پھر بھی سکتا ہوں۔" اختر نے جواب دیا۔

"شکر ہے اللہ کا۔ جب اس کوٹھری میں' میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا تو میں تو سمجھا کہ تو گیا۔ بہت برا حال تھا تیرا۔" نیفو اصغر کی طرف مڑا "میں گرم ہلدی بھی لایا ہوں۔ ناشتا کرتے ہی یہ بھی لگا دینا۔ درد بالکل ختم ہو جائے گا انشاء اللہ۔"

اصغر نے اثبات میں سرہلایا اور اختر اسے ممنونیت سے دیکھنے لگا "تم نے بڑی مہربانی کی ہے نیفو بھائی۔"

"مہربانی کیسی۔" نیفو نے شرم ساری سے کہا "میرے اپنے بچے بھی ہیں تم جیسے۔ جیسے وہ ویسے تم۔"

دونوں بچوں نے چائے اور پاپے ختم کر لیے۔

"اب تھوڑی دیر میں دوپہر کا کھانا ہوگا مگر میں رات سے پہلے تمہارے لیے کچھ لا نہیں سکوں گا۔" نیفو نے کہا پھر اس نے کونے میں پڑی کدال کی طرف دیکھا "مگر میری دعا ہے کہ اس سے پہلے ہی تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔ شاہ جی بڑا ظالم آدمی ہے۔"

دونوں بچوں نے بھی کدال کو دیکھا اور سرہلا دیے۔ "اللہ تمہیں خوش رکھے نیفو بھائی..... اور محفوظ رکھے۔" اختر نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" نیفو نے کیتلی اور پیالیاں سمیٹتے ہوئے کہا "اور ہاں' کبھی کسی کو نہ بتانا کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ بھلائی کی ہے۔ نکلنے سے پہلے شاہ جی کے ہتھے چڑھ جاؤ تو اس کے سامنے بھی زبان نہ کھولنا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا فیفو بھائی۔ تم بے فکر رہو۔" اختر نے کہا۔

فیفو چلا گیا۔ اصغر نے اختر سے کہا "لا میں یہ گرم گرم ہلدی لگا دوں۔"

"ہاں لگا دے۔" اختر بولا "اندھیرا ہونے سے پہلے میں جتنا بہتر ہو جاؤں' اچھا ہے۔"

"کیا ارادہ ہے؟"

"اندھیرا ہونے سے ذرا پہلے ہی کام شروع کردیں گے۔" اختر نے کدال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔



پہلا نوالہ لیتے ہی میمونہ نے کہا "واہ امی۔ یہ تو بڑے مزے کا سالن پکایا ہے آپ نے۔" یہ سب کچھ طے شدہ تھا۔ سلمیٰ بیگم نے اسے رات کو ہی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ رائے عامہ کو کیسے ہموار کیا جاتا ہے۔

مگر جب میمونہ نے صحیح معنوں میں اس نوالے کا ذائقہ محسوس کیا تو اس کا دل خوش ہوگیا "واقعی امی' یہ تو بہت مزے کا ہے۔" اس کے لہجے میں مسرت اور استعجاب کا عجیب امتزاج تھا "آج تو میں ڈٹ کر کھانا کھاؤں گی۔"

سلمیٰ بیگم نے مسکراتے ہوئے دونوں لڑکوں کو دیکھا' جو ناک بھوں چڑھا رہے تھے "کھا کر تو دیکھو۔"

دونوں اب بھی ہچکچا رہے تھے "فیضی ..... اشعر..... واقعی بہت مزے کا ہے۔" میمونہ نے انہیں یقین دلایا۔ وہ خود بھی بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔

اس کے کہنے پر اشعر نے پہلا نوالہ لیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "واقعی مزے کا ہے۔"

فیاض نے بھی پہلا نوالہ لیا اور منہ بنا کر بولا "اچھا ہے لیکن گوشت نہیں ہے۔"

"مجھے تو بھئی یہ گوشت سے اچھا لگ رہا ہے۔" میمونہ نے کہا۔

"گوشت سے اچھا تو نہیں ہے۔ ہاں گوشت جتنا اچھا ہے۔"

اشعر نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

اب چھوٹا فیاض بھی رغبت سے کھا رہا تھا۔ سلمیٰ بیگم بچوں کو بڑی محبت سے دیکھتی رہیں۔ آج انہیں بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اچانک اشعر نے کہا "لیکن امی' آپ گوشت کیوں نہیں پکاتیں؟"

"بیٹے' زیادہ گوشت کھانا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ دانے نکل آتے ہیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔" سلمیٰ بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر ہمارے ہاں تو بہت دن سے گوشت نہیں پکا ہے۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے بیٹے۔ بس اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ پتا ہے' دنیا میں نجانے کتنے بچے ایسے ہوتے ہیں' جنہیں دوپہر کا کھانا نہیں ملتا اور ایسے بھی ہوتے ہیں' جنہیں رات کا کھانا بھی نہیں ملتا۔"

"پھر وہ تو بہت روتے ہوں گے امی۔" فیاض نے پریشان ہو کر کہا۔

"ان میں جو اچھے بچے ہوتے ہیں' وہ اللہ کا شکر ادا کرتے اور رزق کی کشادگی کی دعا مانگتے ہیں ..... اور جو برے بچے ہوتے ہیں' وہ روتے اور ضد کرتے ہیں۔"

"میں تو اچھا بچہ ہوں۔" فیاض نے فخریہ لہجے میں کہا "میں نہیں روتا۔"

"لیکن امی' کل گوشت ضرور پکائیے گا۔" اشعر نے شوشہ چھوڑا۔

"جی امی' کل گوشت نہیں ہوا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

فیاض بھی پھیلنے لگا۔

"کل تو میں تمہیں ایسی مزے کی چیز کھلاؤں گی' جو گوشت سے بھی اچھی ہوتی ہے۔" سلمیٰ بیگم نے بہلانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ مجھے تو گوشت ہی چاہیے۔"

"اس چیز میں گوشت سے زیادہ پروٹین ہوتے ہیں۔" سلمیٰ بیگم نے بتایا۔

"امی' ہم گوشت پروٹین کے لیے تو نہیں کھاتے۔" اشعر نے' اعتراض کیا۔

"کل تو میں گوشت ہی کھاؤں گا بھئی۔" فیاض نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔

"کل میں تو لوبیا پکاؤں گی بھئی اور دیکھنا' تم انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔"

"انگلیاں چاٹنا تو بدتمیزی ہوتی ہے امی۔" فیاض نے جلدی سے کہا۔

"ارے پگلے' یہ محاورہ ہے۔" سلمیٰ بیگم نے محبت سے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔

"مگر امی' کل گوشت ......" فیاض کی سوئی اسی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"بیٹے کل نہیں۔ بس کل اور صبر کرلو۔ پرسوں میں تمہیں جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی انشاء اللہ۔"

"بہت سارا۔"

"ہاں اتنا کہ گوشت ختم نہیں ہوگا اور تم میز سے اٹھ جاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے امی۔"

"لیکن شرط یہ ہے کہ تم آج بھی اور کل بھی خوب اچھی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاؤ گے اور اللہ کا شکر ادا کرو گے۔"

"ٹھیک ہے امی۔"

سلمیٰ بیگم خوش تھیں کہ بچوں نے اچھی طرح کھانا کھایا ہے۔ ایک دن اور گزر گیا تھا۔ اب کل ہی کی تو بات ہے۔



ان کے پاس وقت کے اندازے کے لئے بس کوٹھری کا روشن دان تھا۔ اب روشن دان سے روشنی نظر نہیں آرہی تھی مگر روشن دان تاریک بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شام ہوچکی ہے اور تھوڑی دیر میں سورج غروب ہونے والا ہے۔

ہلدی کے لیپ نے جادو کر دکھایا تھا۔ اختر کے کچھ زخم تو ابھی ہرے تھے لیکن ہڈیوں اور جوڑوں سے درد رخصت ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ اٹھ کر کوٹھری میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ وہ آزمائشی چہل قدمی تھی "میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے مسرت بھرے لہجے میں یہ اعلان کیا "میں یہ دیوار بھی توڑ سکتا ہوں۔"

اصغر نے شک آمیز نظروں سے اسے دیکھا "ابھی چوٹیں نظر آرہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"ان سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں درد اور تکلیف کی وجہ سے پریشان تھا۔" اختر نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے جاکر کدال اٹھائی اور اسے دیوار پر چلایا "دیکھا۔" اس نے فخریہ لہجے میں دیوار سے گری ہوئی مٹی دکھائی۔

"مگر یار تو چاہتا کیا ہے؟"

"ہمیں رات ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا ہے۔"

"ہم جائیں گے کہاں۔ ہمارا تو کوئی ہے ہی نہیں۔" اصغر ڈر رہا تھا "اتنے بڑے شہر میں مارے مارے پھریں گے۔"

"تو چاہتا ہے کہ ہم یہاں مار کر گاڑ دیے جائیں؟"

یہ خیال اصغر کو پہلے ہی سے دہشت زدہ کر رہا تھا "باہر پولیس پکڑ لے گی تو؟" اس نے اعتراض کیا مگر اس کے انداز میں نیم رضامندی تھی۔

"پولیس جان سے تو نہیں مارے گی۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" اصغر نے سرہلاتے ہوئے کہا "لیکن پولیس نے پکڑ کر دوبار یتیم خانے بھیج دیا تو؟" اس نے ایک نیا خدشہ دریافت کیا۔

اختر چند لمحے سوچتا رہا "ایسا ہوگا نہیں۔ ہم پولیس والوں کو سب کچھ بتا دیں گے پھر بھی انہوں نے ہمیں واپس بھجوا دیا تو شاہ جی ہمیں جان سے مارنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

یہ بات اصغر کے دل کو لگی مگر بنیادی طور پر وہ ڈرپوک اور نرم بچہ تھا۔ وہ اب بھی ڈر رہا تھا۔ اختر نے یہ بات بھانپی تو فوراً" دھمکی دی "ٹھیک ہے۔ تجھے یہاں ر پسند ہے تو تو یہاں رہ۔ میں تو نکل جاؤں گا۔"

اصغر نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا "میں تو تیری وجہ سے مصیبت میں پھن ہوں اور تو ایسا کہہ رہا ہے۔"

اختر نے پھر کچھ غور و فکر کیا "تجھے تو کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں۔ تو یہیں رہ۔"

"نہیں۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اصغر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں اندھیرا ہوچکا تھا۔ انہوں نے لالٹین کی بتی اوپر کی اور دیوار توڑنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ پہلے اصغر نے کدال سنبھالی۔ اسے اعتماد بہت تھا کیوں کہ اس نے رات کو کدال چلا کر دیکھی تھی مگر اب باقاعدہ دیوار توڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کام اتنا آسان نہیں' جتنا لگ رہا تھا۔ دیوار کچی ضرور تھی مگر بہت چوڑی تھی اور وہ اس دیوار کو سمجھ بھی نہیں سکے تھے۔ درحقیقت وہ مٹی کی اینٹوں سے بنائی گئی دیوار تھی' جس پر گارے کا خاصا بھاری پلستر کیا گیا تھا۔ پلستر تو آسانی سے ٹوٹتا رہا مگر جب کچی اینٹیں شروع ہوئیں تو کام مشکل ہوگیا۔ دوسرے ایک بار کدال چلانا اور بات تھی۔ مسلسل کدال چلانے میں ہاتھ دکھنے لگے پھر چھالوں کی نوبت آگئی۔

اصغر تھک کر بیٹھا تو اختر نے کدال سنبھال لی۔ اپنی چوٹوں کے باوجود وہ اصغر کے مقابلے میں زیادہ جان دار ثابت ہوا لیکن اس کے ساتھ بھی مسئلہ یہی تھا کہ اس نے کام کو آسان سمجھ کر شروع کیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشکل لگا تو اس کا حوصلہ ٹوٹنے

لگا۔

دونوں باری باری دیوار پر کدال آزماتے رہے۔ مگر ان کے **دوانیے** سمٹتے گئے۔ ہاتھوں میں چھالے نکلے پھر وہ پھوٹ بھی گئے تو تکلیف اور بڑھ گئی۔ اگر انہیں اپنی دانست میں جان کا خطرہ لاحق نہ ہوتا تو حوصلہ ہار چکے ہوتے اور اب تو وہ دہرے مجرم تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار ان کے دوسرے جرم کا ناقابل تردید ثبوت تھی۔

انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مگر خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر آہٹ پر ان کی جان نکل جاتی۔ یہ دھڑکا لگا تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔ انہیں تو یہ ڈر بھی تھا کہ دیوار پر کدال مارنے کی آواز بلند ہونے کی وجہ سے دور تک سنی جا رہی ہوگی۔ ان کے جسم پسینے میں تر تھے اور سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ جو بھی اپنی باری پوری کرکے آرام کے لئے بیٹھتا' اسے یہ یقین ہوتا کہ اب وقفے کے بعد وہ کدال نہیں اٹھا سکے گا۔ اس کے ہاتھوں میں جان نہیں رہی ہے لیکن ہر بار موت کا خوف ..... گاڑے جانے کا خوف اٹھنے پر مجبور کر دیتا ... اور کدال چلانے پر احساس ہوتا کہ وجود میں کہیں تھوڑی سی توانائی چھپی ہوئی تھی' جو اب کام آ رہی ہے۔

مگر اس بار اصغر کو یقین ہوگیا کہ اب اس میں جان نہیں ہے۔ وہ گر جانا چاہتا تھا "اب مجھ سے نہیں ہوگا۔" اس نے بے بسی سے کدال گراتے ہوئے کہا۔

اختر کا اپنا بھی یہی حال تھا مگر اس کی طبیعت میں جارحیت تھی۔ وہ آسانی سے ہار ماننے کا قائل نہیں تھا۔ وہ محض اپنی قوت ارادی اور اپنی ضد کے زور پر اٹھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اب اس میں طاقت نہیں رہی۔ اس نے بڑی مشکل سے کدال اٹھائی اور اس کا پھل دیوار پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ کدال اس بار نرم مٹی سے ٹکرائی تھی اور خاصی اندر گئی تھی۔ مٹی کا خاصا بڑا ڈھیر ٹوٹ کر گرا تھا۔

پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کدال جھکائے دیوار کو دیکھتا رہا' جس میں اتنا بڑا سوراخ ہونے والا تھا' جس سے وہ باہر نکل سکتے تھے۔ پھر اچانک اس کی سمجھ میں آیا کہ کچی اینٹوں کی دیوار ٹوٹ چکی ہے۔ اور اب صرف دیوار کے دوسری طرف والا گارے کا پلستر باقی ہے۔ وہ بھی بہت کم۔ اس نے دو بار اور کدال ماری پھر

وہ بڑی بے یقینی سے اس سوراخ کو دیکھتا رہا‘ جس سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سوراخ اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر یہ بتا رہا تھا کہ وہ جیت گئے ہیں۔ اب بس اس سوراخ کو بڑا کرنا تھا۔

”اصغر ادھر آجلدی سے۔“ اس نے اصغر کو پکارا۔

اصغر کے لئے اٹھنا بھی مشکل تھا۔ جیسے تیسے وہ اٹھا مگر اس سوراخ کو دیکھ کر اس کا حوصلہ بلند ہوگیا۔ جسم میں جیسے توانائی کا چھپا ہوا خزانہ دریافت ہوگیا۔ اس نے کدال لے کر اندر بیٹھ کر سوراخ کو بڑا کیا۔ اب وہ باہر نکل سکتے تھے۔

”ہم یہاں کوئی چیز نہیں چھوڑیں گے۔“ اختر نے کہا ”لالٹین بھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”فیضو بھائی پر کوئی مصیبت نہ آئے۔“

”ہاں‘ ٹھیک ہے۔“

اختر نے لالٹین سنبھالی۔ اصغر دری سمیٹنے لگا۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ کہیں عین موقع پر کوئی نہ آجائے۔



اسی شام واپسی پر ریاض احمد ایک بدلے ہوئے آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی اور چال میں خود اعتمادی۔ کندھے بھی جھکے ہوئے نہیں تھے۔ اس روز پہلی بار انہوں نے بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ گردو پیش کو دیکھتے ہوئے طے کیا۔ ان کی آنکھیں چمک بھی رہی تھیں۔

اس روز بھی گلی میں امداد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ امداد صاحب اپنے بکرے کی رسی پکڑے ہوئے اسے ٹہلانے کے لئے لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ریاض احمد سے ہاتھ ملایا۔

”کیسے ہیں ریاض صاحب؟“

”اللہ کا شکر ہے جناب!“ ریاض احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چہل قدمی ہو رہی ہے۔“

”جی ہاں۔ بکرے کو پیٹ کی گرانی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کتنے کا لیا؟“

”بہت بھاؤ تھاؤ کے بعد ۶۴۰۰ کا ملا ہے۔“ امداد صاحب نے بتایا ”ان دنوں مارکیٹ بہت تیز ہے۔ مجھے تو بھئی ایک گھر کا پلا ہوا بکرا پسند آیا تھا۔ تیس ہزار کا تھا۔ میں لے بھی لیتا مگر ہمارے ہاں تینوں دن قربانی ہوتی ہے۔ میں نے تین بکرے لیے۔“

”جی!“

”اور صاحب‘ ایک بکرا تو میں نے ایسا دیکھا کہ بس۔ قیامت تھا قیامت۔ کل کے اخبار میں تصویر بھی آئی ہے اس کی۔ ڈیڑھ لاکھ میں بکا مگر صاحب‘ ایسا بکرا تھا کہ دیکھ کر یقین آجائے کہ بارہ افراد کے کنبے کو حشر کے دن بیک وقت پل صراط پار کرا دے گا۔ بہت تگڑا تھا جناب!“

”میں تو سمجھا تھا کہ پل صراط پار کرنے کے لئے روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ ریاض احمد نے ہنستے ہوئے کہا ”کوئی اپنا پیٹ کاٹ کر خلوص دل سے کوئی مرگھلا جانور بھی قربان کرے تو وہ پل صراط پار کرا سکتا ہے۔“

امداد صاحب ان کا طنز سمجھ نہیں سکے ”یہ تو سارا طاقت کا کھیل ہے ریاض بھائی۔ بکرا تگڑا نہ ہو تو جہنم میں ہی گرا دے گا اپنے مالک کو۔“

ریاض احمد اس بات سے ڈر رہے تھے کہ امداد صاحب ان سے ان کے بکرے کے متعلق نہ پوچھ لیں۔ اسی لئے وہ اس میں خوش تھے کہ ان کے بچے گھر سے نکلتے ہی نہیں ہیں۔ مگر وہ بستی ایسی تھی کہ لوگ شاید ایک دوسرے پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ گلی میں کم و بیش دو درجن بکرے‘ دنبے اور گائیں بندھی تھیں۔ اس وجہ سے بھی پردہ رہ جاتا ہو گا۔

”اچھا امداد صاحب‘ چلتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”کسی دن آئیں نا ہمارے ہاں۔“

”جی انشاء اللہ۔“ وہ گھر کی طرف چل دیے۔

اس روز دروازہ سلمیٰ بیگم نے کھولا اور انہیں ان کی تبدیلی فوراً ہی نظر آگئی

"آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔" انہوں نے سلام کے بعد کہا۔

"صرف نظر نہیں آرہا ہوں' خوش ہوں بھی۔" ریاض احمد مسکرائے "آپ چائے پلائیں پھر خوش خبری سناؤں گا۔"

معمول کے مطابق میمونہ نے ان کے جوتے اور موزے اتارے اور لے گئی۔ وہ صوفے پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ پہلی بار وہ اتنے پرسکون تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کی آرائش کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی بہت اچھی تھی۔

کیسی عجیب بات ہے۔ انہوں نے سوچا۔ میں نے اس گھر میں ایک مہینے سے کچھ زیادہ ہی گزارا ہے مگر میں اس گھر کو آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ جس راستے پر ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک میں صبح و شام چلتا .... آتا جاتا رہا ہوں' اس کے گرد و پیش کا مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ آج دیکھا ہے میں نے۔

بات تو عجیب تھی مگر اتنی عجیب بھی نہیں تھی۔ وہ یہاں آئے ہی ایسے حالات میں۔ اب سے ڈیڑھ ماہ پہلے وہ لکھ پتی تھے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا۔ بنگلا' گاڑی' دنیا کی ہر نعمت۔ طارق روڈ پر ان کا بہت بڑا اسٹور تھا۔ وہاں کپڑا' گارمنٹ' کاسمیٹکس' غرض دنیا کی ہر چیز موجود تھی اور اسٹور چلتا بھی خوب تھا۔ کروڑوں کا مال تھا اس میں۔ پھر اچانک بدقسمتی ان پر حملہ آور ہوگئی۔

ایک رات دو بجے کے بعد نجانے کیسے ان کے اسٹور میں آگ لگ گئی۔ وقت ہی ایسا تھا۔ امدادی کارروائی ہوتے ہوتے اسٹور میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ جل کر خاک ہوگیا تھا۔ اس میں پریشانی کی ایسی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اسٹور مال سمیت انشورڈ تھا مگر صورت حال یوں بگڑی کہ ان دنوں اپنے ملک میں بھی امریکا کی طرح انشورنس فراڈ رواج پانے لگا تھا۔ انشورنس کمپنی اس بات کی تصدیق چاہتی تھی کہ آگ دانستہ تو نہیں لگائی گئی ہے۔ صرف انشورنس کلیم کے لئے۔ دوسرے یہ کہ اسٹور میں اتنا مال موجود بھی تھا یا نہیں۔

تفتیش بہرحال پولیس کو کرنی تھی اور اپنے ملک میں پولیس کا ہی نہیں' ہر سرکاری محکمے کا یہی حال ہے۔ کچھ دو اور کچھ لو والا معاملہ ہوتا ہے۔ خواہ لینا تمہارا بنیادی حق ہی کیوں نہ ہو۔ ریاض احمد کے پاس بینک میں چند لاکھ پڑے تھے۔ انہیں

اطمینان تھا کہ وہ بہرحال کنگال نہیں ہیں۔

جس وقت اسٹور میں آگ لگی' اس میں لاکھوں روپے کا ایسا مال تھا' جس کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ ریاض احمد کی بڑی ساکھ تھی۔ ان سے کاروباری تعلق رکھنے والے ان پر اعتماد کرتے تھے اور مال کی ادائیگی کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ وہ نقصان تو انشورنس کمپنی کو پورا کرنا تھا۔

لیکن جب انشورنس کلیم کا معاملہ اٹکا تو سب لوگ پریشان ہونے لگے۔ لوگوں کو کیا پریشان ہونا تھا۔ اصل میں تو ریاض احمد پریشان ہوئے۔ کوئی شخص انشورنس کلیم کا انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ معاملہ تشویش ناک ہونے لگا تو ریاض احمد کے پاس اپنا مکان اور گاڑی فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود وہ تمام ڈیلرز کو نہیں نمٹا سکے اور ان کے پاس دھیلا بھی نہیں رہا۔

جس روز انہوں نے اپنے مکان کا سودا کیا' ان کا ایک عزیز دوست فرشتہ رحمت بن کر ان کے پاس آیا "یار ریاض' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نعمان نے انہیں دلاسا دیا "کل میں امریکا جا رہا ہوں ورنہ یہاں کے معاملات میں بھی تمہاری مدد کرتا۔ فی الوقت ایک کام کرسکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

یہ وہ وقت تھا جب درحقیقت سایہ بھی ریاض احمد کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ایسے میں نعمان انہیں پی آئی بی کالونی لے کر آیا۔ اس نے اپنا مکان انہیں دکھایا۔ مکان میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی "تم جب تک چاہو' یہاں رہ سکتے ہو۔"

نعمان نے انہیں دس ہزار روپے بھی دیئے۔ ریاض احمد نے گھر میں دو ماہ کا راشن لا کر ڈالا اور خود انشورنس کلیم کے معاملے میں جت گئے۔ اس کڑے وقت میں انہیں ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس طرح رہ رہے ہیں۔ آج وقت نے انہیں مہلت دی تو انہوں نے اپنے گردوپیش کو دیکھا تھا ورنہ اس احساس نے انہیں شل کر رکھا تھا کہ ان کے بچوں پر اس عرصے میں کیا گزری رہی ہے۔ وہ جو ناز و نعم سے پالے گئے تھے' اب چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترس رہے تھے۔

سلمی بیگم نے انہیں چونکا دیا۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ انہوں نے چائے کی پیالی شوہر کے سامنے رکھ دی "اب فرمایئے۔"

ریاض احمد نے اطمینان سے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولے "انشورنس کلیم منظور ہوگیا ہے۔"

سلمی بیگم بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہیں "سچ؟"

"جی ہاں۔ مکمل کلیم منظور ہوا ہے۔ پہلا چیک میں آج جمع کرا آیا ہوں۔"

سلمی بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں "اللہ تیرا شکر ہے۔"

"پھر بھی میں خالی ہاتھ آیا ہوں۔" ریاض احمد نے اداسی سے کہا "چیک اتنی دیر میں ملا کہ بینک کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ میں خالی ہاتھ ہی آیا ہوں اور کل سے بینک کی بقرعید کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ اس میں اداس ہونے کی کون سی بات ہے۔" سلمی بیگم نے خفگی سے کہا "خواہ مخواہ ناشکرا پن کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کتنا بڑا کام اتنی آسانی سے ہوگیا۔ ہم تو خدا کا جتنا شکر ادا کریں، کم ہے۔"

"بے شک۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ لیکن بچوں کے کپڑے نہیں بن سکیں گے۔"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کے پاس نئے کپڑے موجود ہیں۔"

"اور آپ؟"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب ہم بچے تو نہیں ہیں، بچوں والے ہیں۔"

"میں نے بینک مینجر سے بات کرلی ہے۔ پوری تو نہیں، لیکن عید کے تیسرے دن کچھ رقم میں نکال سکوں گا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم قربانی کرسکیں گے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ لیکن ریاض صاحب، قربانی تو ہمیں ہر حال میں کرنی تھی... اور ہم کرتے بھی۔"

ریاض احمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے بیوی کو تکتے رہے۔

"دیکھیں نا، ہم صاحب نصاب ہیں۔ میرے پاس اتنا زیور ہے۔ حالات کیسے ہی ہوں، قربانی تو ہم پر واجب تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ زیور بیچ کر قربانی کردوں گی۔"

"اوہ .... مجھے تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

"مگر جناب، آج مجھے یقین ہوگیا تھا کہ بس اب دن پھرنے والے ہیں۔ اچھا وقت شروع ہو رہا ہے۔" سلمی بیگم مسکرائیں۔

"یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟"

"آج میں نے کھنڈویاں پکائی تھیں۔ بچوں نے بہت شوق سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اس تمام عرصے میں یہ پہلا موقع ہے۔"

"مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر۔" ریاض احمد بولے "لیکن افسوس بھی ہوا کہ میں گوشت نہیں لاسکا۔"

"میں نے انہیں سمجھا دیا کہ پرسوں جی بھر کے گوشت کھالیں۔ ظاہر ہے، پڑوس سے گوشت آئے گا ہی اور پرسوں تو اپنے گھر بھی قربانی ہوگی۔"

"انشاء اللہ۔" ریاض احمد نے کہا "ویسے سلمی بیگم، یہ تو بتائیے کہ یہ سخت وقت کیسا لگا؟"

"اس عرصے میں میری سمجھ میں وہ کچھ آیا، جو میں کبھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔" سلمی بیگم نے گہری سانس لی "میرا خیال ہے، سخت وقت اپنی حماقتوں کی وجہ سے آئے یا تقدیر کی وجہ سے، وہ بہرحال آزمائش ہوتا ہے۔ اللہ دیکھتا ہے کہ بندہ اس کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اس سے مدد اور حوصلہ مانگتا ہے یا نہیں اور یہ بھی بتا دوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم پر تو برا وقت آیا ہی نہیں۔ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی مل گیا۔ بچے بھی اچھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے ایک وقت بھی فاقہ نہیں کیا۔"

ریاض احمد جھرجھری لے کر رہ گئے "سلمی بیگم، آپ بہت اچھی ہیں۔"

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہیں ریاض صاحب!"



اس رات بھائی جان کو احساس ہوا کہ ان کی بیوی پریشان ہیں۔ وہ کھوئی کھو سی تھیں۔ کسی بات پر توجہ نہیں دے رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی بات بھی نہیں ک تھی۔ جواب دینا پڑا تو وہ بھی بے دھیان میں دیا۔

اس وقت وہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ "آج آپ نے چھٹی منائی؟" بھائی جا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" باجی نے مختصراً کہا۔

"کوئی آیا تھا؟"

"جی--- نعمت آئی تھی۔"

"اور آپ کی کیا مصروفیات رہیں؟"

"چندو کی واسکٹ مکمل کر لی تھی۔" پہلی بار باجی کے لہجے میں دلچسپی کا رنگ جھلکا۔

"واہ--- مجھے بھی دکھائیں۔"

"دیکھ لیجئے گا جلدی کیا ہے۔"

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اصولاً اس معاملے میں باجی کو بچوں کی طر ایکسائیڈ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ بھائی جا نے بھی زور نہیں دیا۔ معاملہ تفتیش طلب معلوم ہوتا تھا "اور چندو میاں کی ک مصروفیات رہیں؟ کوئی نیا کارنامہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بے چارہ دن بھر اداس رہا۔ گھر میں پڑا رہا۔"

بھائی جان کا ماتھا ٹھنکا "کیوں بھئی' خیرت تو ہے؟"

"بس ایک ایسی بات سن لی تھی اس نے کہ خوف زدہ ہوگیا ہوگا۔" باجی نے آ

بھر کر کہا۔

"کس نے ..... کیا کہہ دیا؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" باجی نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

بھائی جان خاموش ہوگئے۔ جانتے تھے کہ بیگم خود ہی بتا دیں تو بتا دیں ورنہ ان سے کوئی بات اگلوانا ممکن نہیں ہے۔ باجی برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئیں۔ بھائی جان نے پاؤں پھیلا لیے اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گئے۔ بیگم کے رویے نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ دو منٹ بیٹھے ہوں گے کہ چندو آگیا۔ پہلے تو وہ ان کے جسم سے سر رگڑتا رہا پھر اس نے دونوں اگلے پیران کے دونوں کندھوں پر رکھے اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بھائی جان خوش تو بہت ہوئے مگر کڑے لہجے میں بولے "چندو میاں' آپ بہت مطلبی ہیں۔ بغیر غرض کے آپ کبھی کسی کو پیار نہیں کرتے۔"

اس پر چندو نے کچھ آوازیں نکالیں۔ جیسے بھائی جان کی تردید کر رہا ہو۔

"جی نہیں۔ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" بھائی جان نے کہا۔ "آپ خود بتائیں۔ کبھی صبح دفتر جاتے ہوئے آپ نے مجھے پیار کیا۔ اس وقت جو آپ مجھے پیار کر رہے ہیں تو درحقیقت مجھے یاد دلا رہے ہیں کہ ٹہلنے کے لئے بھی جانا ہے۔"

چندو نے سر ہلاتے ہوئے پھر کچھ آوازیں نکالیں۔

"چلئے ..... چلتے ہیں۔" بھائی جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

بھائی جان چہل قدمی کے دوران چندو سے دنیا زمانے کی باتیں کرتے تھے۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی دنبہ ہے۔ ان کا انداز تو ایسا ہوتا تھا' جیسے کسی دوست سے تبادلہ خیال کرتے ہوں۔ چندو بھی ہنکارے بھر بھر کے گویا گفتگو میں شامل رہتا تھا۔

"اب چندو میاں' آپ ہی بتائیں۔ قانون اور تعزیرات کا ہتھیار حکومت کے پاس ہے یا لوگوں کے۔" بھائی جان پر زور لہجے میں کہہ رہے تھے "تو امن و امان قائم رکھنا حکومت کی ذمے داری ہی ہوا نا۔ پھر یہ ہے کہ قانون تو آپ بنالیں مگر....."

"السلام علیکم بھائی جان۔"

"وعلیکم السلام۔"

"کیسے ہو چندو میاں؟"

چندو میاں نے ہنکاری بھر کر اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ چہل قدمی اور گفتگو کے دوران یہ مداخلتیں چلتی رہتی تھیں۔ بھائی جان اور چندو دونوں اس کے عادی تھے سلام کا جواب دینے کے لئے جہاں سے سلسلہ ٹوٹتا' وہیں سے جوڑ دیا جاتا۔

"ہاں تو چندو میاں' میں کیا کہہ رہا تھا؟"

چندو میاں بھی سوچ میں ڈوب گئے۔ کیا یاد دلائیں ..... لیکن کوئی بتا دے' بھولے ہیں ہم جہاں سے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔

مگر بھائی جان کا دماغ بہت تیز تھا۔ وہ کبھی کچھ بھی نہیں بھولتے تھے "ہاں! میں یہ کہہ رہا تھا کہ قانون سازی تو آپ کریں اور عمل درآمد نہ ہو تو کیا فائدہ۔ بھئی قانون بنائیں تو سختی سے انہیں نافذ بھی کریں۔ صرف قانون بنا دینے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے صرف اچھے قانون بنا دینا کافی ہے تو آپ بہت بھیانک غلطی کر رہے ہیں ....."

پھر مداخلت ہوتی۔ سلام' چندو کی مزاج پرسی' سر کو پیار سے تھپتھپانا۔

"اور بھائی چندو' انسانوں کے لئے سب سے اچھے قوانین تو اللہ میاں نے بنائے اور اتار دیئے۔ قرآن حکیم کی صورت میں ....." بھائی جان کی گفتگو پہاڑی دریا کی طرح ہوتی تھی۔ بڑی سے بڑی چٹان اس کے دھارے کو روک نہیں سکتی تھی۔ ہاں دھارے کا رخ ذرا سا تبدیل ہو جاتا مگر بہاؤ اور تیز ہو جاتا "..... ہمیں تو صرف ان پر عمل کرنا ہے۔ اسی میں ہماری عافیت ہے ....."

"السلام علیکم بھائی جان۔ کیسے ہیں؟ تم کیسے ہو چندو بیٹے۔"

"اور بھائی' حکومت کیا ہے؟ دیکھو نا چندو میاں' اقتدار اعلیٰ تو صرف اللہ کا ہے۔ اللہ نے اس کا ایک حصہ حکومت کو سونپ دیا ..... اپنی امانت کے طور پر لیکن یہ کبھی کوئی نہیں سوچتا کہ کس لیے۔ اس لئے نہیں کہ تم طاقت کے زعم میں مبتلا ہو جاؤ کہ تم ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہو۔ رعایا کی تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں اللہ نے اقتدار اس لیے دیا کہ تم اس کے بنائے ہوئے قوانین پر لوگوں سے عمل کراؤ

سختی سے۔ سو بھائی' قانون سازی مت کرو۔ جو قوانین تمہیں دیے گئے ہیں' ان سے بہتر کوئی قانون تم کبھی نہیں بنا سکتے۔ عمل کرو تاکہ عمل کرا سکو ....."

"السلام ..... کیسے ..... چندو میاں .....؟"

"اور میاں' تم اقتدار کو سمجھتے کیا ہو۔ تم اقتدار ملنے پر خوش ہوتے ہو ..... جشن مناتے ہو۔ تمہارے اسلاف تھرا جاتے تھے۔ سجدے میں گر کر روتے ..... گڑگڑاتے تھے کہ ان پر کتنی بھاری ذمے داری عائد ہوگئی ہے۔ دیکھو نا' حکمران تو اپنی رعایا کے حساب میں بھی شریک ہوں گے۔ دس کروڑ پر حکمراں ہو تو جواب دہی بھی صرف اپنی نہیں' دس کروڑ کی کرنی ہے۔ تمہیں تو حکمرانی ملے تو تم پر افضلیت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے کہ تم دس کروڑ سے افضل ہو.....

"میاں' کبھی سوچو تو۔ سب سے زیادہ وسیع و عریض مملکت حضرت عمر کے دور میں تھی اور آپ راتوں کو نیند سے محروم ہوگئے تھے۔ رات رات بھر روتے ..... خوف سے تھرتھراتے کہ کہیں کوئی کتا بھی بھوکا رہ گیا تو جواب دہی انہیں کرنی ہوگی۔ تو بھائی اقتدار ملے تو خوف بڑھ جاتا ہے اور بندے میں عاجزی بھی بڑھ جاتی ہے اور اقتدار کو اقتدار اعلیٰ سمجھ بیٹھو تو فرعون ہو جاؤ گے.....

"اور اب اس پارک کو لو۔ اسے گارڈن کہتے ہیں۔" بھائی جان کے لہجے میں حقارت ہوتی اور اس سے یہ بھی سمجھ لیں کہ وہ میدان میں پہنچ چکے ہیں اور میدان کا چکر لگانے والے ہیں" اور گارڈن میں ٹخنے ٹخنے مٹی ہے۔ گھاس کی ایک پتی اور پھول کا ایک پودا نظر نہیں آتا مگر کاغذات میں یہ ایک ہرا بھرا باغ ہے' جس کے لیے پودے' کھاد اور گھاس خریدی جاتی ہے۔ اس کے لئے چار مالی اور دو چوکی دار بھی ہیں۔ اب پوچھو کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ وصول کرتے ہیں ..... آدھی تنخواہ۔ آدھی مقتدر لوگوں کے پاس چلی جاتی ہے۔ پودے' کھاد اور گھاس اور دوسری چیزیں بھی وہی لوگ کھا جاتے ہیں۔ بتاؤ' کہتے ہیں' آدمی گھاس نہیں کھاتا۔ میں کہتا ہوں' آدمی گھاس بھی کھاتا ہے اور کھاد بھی اور جانتے ہو' کھاد کس چیز سے بنتی ہے ....."

واپسی میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ اپنی گلی سے ذرا پیچھے شیخ صاحب مل گئے۔

شیخ صاحب کو اس علاقے میں آئے ہوئے دو ڈھائی مہینے ہوئے تھے۔ انہوں نے کرائے پر مکان لیا تھا۔ انہوں نے بھائی جان کو سلام کیا' ہاتھ ملایا' چندو کا سر تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے بولے "چندو میاں' کل اور عیش کرلو۔ خوب کھا پی لو میاں تمہیں پتا ہے کہ پرسوں بقر عید ہے۔ کچھ قصائی سے بھی سلام دعا کرلو۔"

بھائی جان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس طرز تخاطب سے انہیں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ گلی کے ..... بلکہ علاقے کے لوگوں نے کبھی ان کے پیٹھ پیچھے بھی ایسی بات نہیں کی تھی "کیا مطلب ہے آپ کا شیخ صاحب؟" انہوں نے کڑوے لہجے میں پوچھا پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے چندو سے کہا "چندو میاں' آپ گھر جایئے۔ میں آتا ہوں۔"

چندو سیدھا اپنی گلی کی طرف چل دیا۔

"ہاں' اب بتایئے شیخ صاحب!"

"مطلب کیا بھائی۔ میرا اشارہ قربانی کی طرف تھا۔" شیخ صاحب بولے "مقبول قربانی تو عزیز ترین چیز کی ہوتی ہے۔"

"آج آپ نے ایسی بات کی ہے' آئندہ نہیں کیجیے گا۔" بھائی جان کا لہجہ نرم مگر مستحکم تھا۔

"اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے بھائی جان؟" شیخ صاحب نے حیرت سے کہا۔

"میں نے آج تک آپ کا گھر نہیں دیکھا۔" بھائی جان نے موضوع ہی بدل دیا۔

"اسی گلی میں رہتا ہوں میں۔ تیسرا مکان ہے بائیں جانب۔"

شیخ صاحب نے اشلوے سے بتایا "کبھی تشریف لائیں نا۔"

"آج ہی کیوں نہیں؟"

"زہے نصیب۔ آیئے ....."

شیخ صاحب بھائی جان کو اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے بھائی جان کو بیٹھک میں بٹھایا۔ "ٹھنڈا لیجیے گا یا گرم؟"

اس وقت تو کچھ بھی نہیں۔ آپ کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔"

اسی وقت اندر سے ڈھائی تین سال کا بچہ آیا اور شیخ صاحب کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ شیخ صاحب رہ رہ کر اسے پیار کرتے۔ وہ شیخ صاحب کی داڑھی سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ کبھی کھینچتا' کبھی سہلانے لگتا۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے ماشاء اللہ؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"ماشاء اللہ پانچ ہیں۔ تین بیٹیاں' دو بیٹے۔" شیخ صاحب نے فخریہ لہجے میں بتایا "سب سے بڑی بیٹی دس سال کی ہے اور یہ سب سے چھوٹا ہے۔" انہوں نے گود میں بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے' یہ آپ کو سب سے پیارا ہے۔"

"یہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے بھائی جان۔ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ مجھے سب سے عزیز ہے۔"

بھائی جان اٹھ کھڑے ہوئے "میں اب چلتا ہوں۔ تعلقات رہے تو پھر ملاقات ہوگی۔" دروازے پر پہنچ کر وہ رکے اور مڑے۔

"بس تو اس بار بقر عید پر آپ اپنے اس بچے کو قربان کر دیجیے گا۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔"

شیخ صاحب ہکا بکا رہ گئے "یہ کیا بکواس ....؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مقبول قربانی عزیز ترین چیز کی ہوتی ہے۔"

"یہ میرا بیٹا ہے ....." شیخ صاحب لحہ بہ لحہ غضب ناک ہوتے جا رہے تھے۔

"اور چندو میرا بیٹا ہے۔" بھائی جان نے بے حد شیریں لہجے میں کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں اور سمجھیں' چندو دنبہ ہے۔"

"آپ اپنے پانچ بچوں سے جتنی محبت کرتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ میں اپنے چندو سے محبت کرتا ہوں۔ سمجھے۔" بھائی جان نے کہا اور پلٹ کر باہر چلے گئے۔

شیخ صاحب اچانک پن کی وجہ سے دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے مگر بات کی معنویت اور کاٹ جیسے جیسے ان پر روشن ہوئی۔ ان کا غصہ بڑھتا گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ غصے کی شدت سے لرزنے لگے۔ انہوں نے بچے کو ایک طرف پٹخا اور

باہر بھاگے۔ باہر نکل کر انہوں نے دیکھا تو بھائی جان گلی کے نکڑ پر تھے "او الو کے پٹھے بھائی جان۔" انہوں نے للکارا "ٹھہر تو جا' میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

بھائی جان رکے اور پلٹے "آیئے حضرت' میں آپ کا منتظر ہوں۔" انہوں نے چیخ کر کہا "اگر میں آپ کو بہت عزیز ہوگیا ہوں تو مجھے قربان کر دیجئے۔"

"میں واقعی تجھے ذبح کر دوں گا۔" شیخ صاحب ان کی طرف بڑھنے لگے۔

چند لمحوں میں گلی میں مجمع لگ گیا۔ لوگوں کو بات کا پتا چلا تو انہوں نے بھائی جان کو سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔ شیخ صاحب اب مغلظات بک رہے تھے۔

"آپ کو بھائی جان سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔" ایک صاحب بولے۔ وہ عمر میں بھائی جان سے بھی کافی بڑے تھے۔

"ارے صاحب' میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ دنبے کی قربانی ہی کی تو بات کی تھی۔" شیخ صاحب نے تنک کر جواب دیا۔

"چندو دنبہ نہیں اور صرف باجی اور بھائی جان ہی کو نہیں' پورے محلے کو اولاد کی طرح عزیز ہے۔" ایک اور صاحب بولے۔

مگر شیخ صاحب اب بھی بپھرے ہوئے تھے۔ ایک جوان لڑکے نے سخت لہجے میں کہا "شیخ صاحب' اس طرح تو آپ یہاں نہیں رہ سکیں گے۔" اور محلے والوں نے اس کی بات پر یوں صاد کیا کہ اس کے بعد کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور سب اپنے اپنے گھر میں چلے گئے۔ شیخ صاحب گلی میں اکیلے کھڑے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔



دونوں لڑکے بغیر کسی رکاوٹ اور دشواری کے باہر نکل آئے تھے۔ رات ہو چکی تھی مگر سڑکیں سنسان نہیں تھیں۔ بلکہ عید کی شاپنگ کرنے والوں کی وجہ سے عام دنوں کی نسبت زیادہ رونق تھی۔

اختر نے بغل میں دری دبالی تھی۔ اصغر کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دونوں چلتے رہے۔ اس وقت وہ آزادی کی خوشی سے سرشار تھے۔ دوسرے جلد از جلد یتیم خانے

کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ابھی انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کا کیا بنے گا۔

وہ چلتے رہے۔ انہیں اطمینان ہوگیا کہ یتیم خانہ بہت پیچھے رہ گیا ہے "لالٹین یہیں کہیں چھوڑ دے بھائی۔ کیا لٹکائے پھرے گا۔" اختر نے کہا۔

اصغر نے لالٹین سے پیچھا چھڑالیا لیکن دری ان کے بہت کام آسکتی تھی۔

اب ذرا سکون ہوا تو انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ باہر نکلے ہوں۔ دو تین بار تو وہ مختلف تقریبات میں لے جائے گئے تھے۔ پھر دوبارہ یتیم خانے والوں نے کیمپ لگایا تھا تو وہ اس میں بھی بیٹھے تھے مگر بہرحال ان موقعوں پر وہ آزاد نہیں تھے جب کہ اس وقت وہ اپنے مالک آپ تھے۔

ابتدا میں تو وہ مزے سے گھومتے رہے۔ وہ اس وقت لالو کھیت کے علاقے میں تھے۔ وہ خریداری کرنے والوں کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ وہاں ان کی عمر کے بچے بھی تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بچے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ تھے۔

"مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ شہر میں اتنے لوگ رہتے ہیں۔" اصغر نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" اختر بولا "سب گھروں سے نکل آئیں تو چلا بھی نہیں جاسکتا۔"

"مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" اصغر ذرا دیر بعد منمنایا۔

یہ سنتے ہی اختر کی بھوک بھی جاگ اٹھی۔ دوپہر کے قریب چائے کے ساتھ پاپے کھائے تھے۔ اس کے بعد انہیں کچھ بھی نہیں ملا تھا "بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" وہ بولا۔

"کھانا کہاں سے ملے گا؟"

"ملنے کی جگہیں تو بہت ہیں مگر ہمارے پاس پیسے بھی تو نہیں ہیں۔"

"اسی لیے کہتا تھا' سوچ لے۔ یتیم خانے میں پتلی دال ملتی تھی مگر پیٹ تو بھر جاتا تھا۔"

"یہ سوچ کہ ہم زندہ ہیں۔ وہاں شاہ جی ہمیں مار ڈالتا۔"

"یہاں ہم بھوکے مرجائیں گے۔"

"نہیں مریں گے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" اختر نے کہا لیکن اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا۔

انہوں نے سڑک پار کی۔ سامنے ہی بکرا منڈی لگی تھی۔ وہاں دن کا سا سماں تھا۔ جانوروں کے بیوپاریوں نے جگہ جگہ گیس کی لالٹینیں جلائی ہوئی تھیں۔ وہاں ہجوم بھی بہت تھا۔ وہ اس ہجوم میں گھس گئے۔ وہاں جانوروں کے پیشاب اور گوبر کی بو بہت تیز تھی لیکن لوگ مزے سے خریداری کر رہے تھے۔

"نہیں بابو جی۔ گھر کا پلا ہوا جانور ہے۔ چار ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں کروں گا۔" مویشیوں کا ایک آڑھتی خریدار سے کہہ رہا تھا۔

خریدار نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر آڑھتی کو دے دیے "بس اڑتیس سو سے اوپر نہیں دوں گا۔"

دونوں لڑکوں نے زندگی میں صرف ایک بار پانچ کا ایک نوٹ دیکھا تھا.... وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ یتیم خانے میں عید میلادالنبی کا جلسہ ہوا تھا۔ اس میں ایک بڑا سیٹھ مہمان آیا تھا۔ اس نے سب بچوں کو پانچ پانچ کا ایک نوٹ دیا تھا۔ وہ دونوں اس نوٹ کو پڑھتے رہے تھے۔ ایک ایک لفظ.... بینک دولت پاکستان.... پانچ روپے اور پھر عین اس وقت جب وہ یہ سوچنا شروع کر رہے تھے کہ اس سے کیا کیا خریدیں گے' ان سے نوٹ چھین لیے گئے تھے۔

اختر کو وہ نوٹ یاد آیا پھر خیال آیا کہ کھانا پیسوں سے ملتا ہے۔ اس نے بڑی لجاجت سے خریدار سے کہا "ایک نوٹ ہمیں دے دیں صاحب۔"

خریدار نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا "دماغ خراب ہے۔ سو روپے دے دوں۔"

آڑھتی نے ان دونوں پر آنکھیں نکالیں "بھاگو یہاں سے.... ورنہ چھینٹی لگاؤں گا۔ سالو' دھندا خراب کرتے ہو۔"

"ہم بھوکے ہیں۔" اختر نے کہا لیکن آڑھتی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ واقعی مرمت کر دے گا۔ وہ اصغر کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ بکرا منڈی میں ہی گھوم رہے تھے۔ اختر جانوروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا "تجھے پتا ہے' یہ سب جانور بک جائیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔" اس نے اصغر سے کہا۔

"اور سب کی قربانی ہوگی۔" اصغر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "کتنا گوشت نکلے گا ان میں سے۔"

اتنا کہ پورا شہر.... ایک ایک بچہ جی بھر کے کھالے۔ پھر بھی بچ جائے گا۔" اختر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"ہمیں بھی ملے گا نا؟"

"ہاں۔" اختر نے عالمانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"بقرعید کے دنوں میں ہر شخص کو گوشت ملتا ہے۔" پھر اس نے توقف کیا

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی ایک بکری پکڑ کر کھا جاؤں.... کچا ہی کھا جاؤں۔"

"تیرے گوشت کے شوق نے ہی تو مصیبت میں پھنسایا ہے۔" اصغر جھنجلا گیا۔

"سچ کہتا ہوں' ایک بار جی بھر کے گوشت کھالوں' پھر کبھی گوشت کی ضد نہیں کروں گا۔"

وہ یوں ہی گھوم رہے تھے کہ ایک پولیس والے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ زمین نے جیسے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اختر نے حوصلہ افزائی کے انداز میں سرہلایا۔ دونوں وہیں کھڑے پولیس والے کی آڑھتی سے گفتگو سنتے رہے۔

"سرجی' یہ تو بڑی زیادتی ہے جناب۔" آڑھتی فریاد کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا "پانچ ہزار میں سات بکرے اس موسم میں کہاں ملتے ہیں۔ چلو' میں کر بھی دوں مگر آپ کہتے ہو کہ جانور بھی اچھا اور تگڑا ہو۔"

"تم جانتے ہو' میں نے کبھی تم لوگوں کو تنگ نہیں کیا۔" پولیس والے نے عاجزی سے کہا۔

"وہی تو میں حیران ہوں انسپکٹر صاحب! آپ تو بندے ہی اور طرح کے ہو۔ ہم خوشی سے بھی کچھ دیں تو آپ نہیں لیتے ہو۔"

"یہ اوپر والے کا معاملہ ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے' قربانی ...."

"میں سب کے اوپر والے کی نہیں' اپنے اوپر والے کی بات کر رہا ہوں۔"

انسپکٹر کا لہجہ تلخ ہوگیا "اس نے پانچ ہزار مجھے دیئے اور بولا' مجھے سات اچھے اور تگڑے بکرے چاہئیں۔ بس کل تک لا دو۔ میں نے کہا کہ سر' یہ کیسے ممکن ہے۔ بولا' بکرا منڈی تو تمہارے ہی علاقے میں لگتی ہے۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ وہ تو کچھ نہیں سنے گا۔"

آڑھتی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "پانچ ہزار میں تو بات بنتی مشکل ہے سرجی۔"

"میں کیا کروں۔ میں تو غلط کام کرتا نہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو صاحب سے پانچ ہزار بھی نہ لیتا۔ اور بنگلے پر سات بکرے بھی پہنچا دیتا۔ میرے پاس کچھ ہوتا تو میں رقم بڑھا سکتا تھا۔"

آڑھتی نے اس بار ذرا زیادہ سوچا "پر سات بکروں کا وہ کیا کریں گے سرجی؟"

"ارے .... ملنے والوں کی' رشتے داروں کی فرمائشیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

"ایسی قربانی قبول ہو جائے گی انسپکٹر صاحب؟"

"یہ اوپر والا جانے۔" انسپکٹر نے دکھ سے کہا "یہ تو قربانی کرنے والوں کو سوچنا چاہیے۔"

آڑھتی نے اس بار اور زیادہ سوچ بچار کیا "اب آپ کی بات ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا سرجی...."

"میری خاطر مت کرو۔" انسپکٹر نے تلخی سے کہا "اپنی سوچو۔ میرا صاحب اس علاقے کا انچارج ہے۔ میرا تو صرف ٹرانسفر ہوگا اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ مال پانی تو کماتا نہیں ہوں کہ فکر کروں۔ ہاں وہ تمہیں بہت تنگ کریں گے۔ تمہارا دھندا خراب ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سرجی۔ میں دوسروں سے بات کرتا ہوں۔ بڑی منڈی ہے۔ ہمیں مل جل کر ہی یہ بوجھ اٹھانا ہوگا۔ آپ رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اختر اور اصغر آگے بڑھ گئے۔ دونوں کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ منڈی سے

نکلے اور الکرم اسکوائر کی طرف چل دیے۔ بلڈنگ کے باہر ہی ایک بڑا ریسٹورنٹ تھا۔ باہر بڑا سا توا چڑھا تھا اور کٹاکٹ بنایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ تکے کباب اور بوٹیاں سیخ پر بھونی جا رہی تھیں۔ وہ دھواں اور گوشت کی وہ خوشبو پاگل کر دینے والی تھی۔ دونوں اس طرف بڑھ گئے اور دیر تک بھنتے ہوئے گوشت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اختر کے تو حلق میں گولے سے پھنس رہے تھے۔ منہ میں پانی بھرتا اور وہ اسے نگلنے کی کوشش کرتا تو حلق دکھنے لگتا۔

"بڑی بھوک لگی ہے۔" اصغر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مگر اپنے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔"

"میں کچھ کرتا ہوں۔ آ میرے ساتھ۔"

وہ دونوں ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے۔ دروازے کے پاس ہی کاؤنٹر تھا۔ اختر اسے وہاں لے گیا "سیٹھ .... ہم بہت بھوکے ہیں۔" اختر نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے شخص سے فریاد کی۔ "ہمیں کھانا کھلا دو۔"

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟" سیٹھ نے انہیں ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیسے ہوتے تو تم سے کیوں کہتے سیٹھ۔ اندر جا کر بیٹھتے اور کھانا منگا لیتے۔"

سیٹھ کی تیوریاں چڑھ گئیں "زبان کا تیز معلوم ہوتا ہے تو۔ ابے بھیک ایسے مانگتے ہیں۔"

اصغر نے جلدی سے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے "ہم بھکاری نہیں ہیں سیٹھ' یتیم ہیں۔" اس نے بے حد عاجزی سے کہا۔

سیٹھ نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا "او فضلو!" اس نے بیرے کو آواز دی "ان بچوں کو دال اور روٹی لا کر دے جلدی سے۔"

"سیٹھ میں گوشت کھاؤں گا۔" اختر نے کہا۔

"ابے' ہوش میں تو ہے۔" اس بار سیٹھ کو غصہ آگیا "کھانا ہے تو کھا۔ نہیں تو راستہ ناپ۔"

"سیٹھ اتنا گوشت ہے۔ مجھے تھوڑا سا دے دو گے تو تمہارا کیا جائے گا۔" اختر

نے عاجزی سے کہا "تمہیں اللہ بہت دے گا۔ مجھے خوش کر دو۔"

سیٹھ دل کا برا بھی نہیں تھا۔ وہ انہیں گوشت بھی کھلا دیتا لیکن اختر سے وہ چڑ گیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی تھی ہی چڑا دینے والی۔ پہلا تاثر ہی خراب ہوگیا تھا "تو گوشت کا حساب کتاب نہ کر۔ دال کھانی ہے تو بتا ورنہ کوئی اور دروازہ دیکھ۔" سیٹھ نے رکھائی سے کہا۔

"شکریہ سیٹھ لیکن میں دال نہیں کھاؤں گا۔"

اتنی دیر میں فضلو ایک پلیٹ میں دال اور چند روٹیاں لے آیا تھا۔ سیٹھ نے کہا "واپس لے جا بھئی۔ ان لوگوں کے تو نخرے ہیں۔ کسی بڑے گھر کے بھکاری لگتے ہیں۔ پیٹ بھرے ہیں شاید۔"

فضلو واپس جانے کے لئے پلٹا بھی نہیں تھا کہ اصغر نے جلدی سے کہا "مجھے تو جو مل جائے گا، کھالوں گا سیٹھ"

سیٹھ نے کہا "ٹھیک ہے فضلو! یہ کھانا اس لڑکے کو دے دے۔"

اصغر باہر زمین پر بیٹھ گیا "تو بھی آجا یار۔ ضد نہ کر۔" اس نے اختر سے کہا۔

اختر نے اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا "اگر دال کھانی ہوتی تو اتنی مار کیوں کھاتا۔ یوں دربدر کیوں پھرتا تو کھالے۔"

اصغر کو مایوسی ہوئی لیکن اس کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے سیٹھ نے کن انکھیوں سے اختر کو دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے اپنے ساتھی کو کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق کا کنٹھا بار بار گروش کر رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس کے منہ میں پانی بھرا آرہا ہے، جسے وہ بار بار نگل رہا ہے۔ یہ بات طے تھی کہ لڑکا بہت بھوکا تھا۔ سیٹھ کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے تھوڑا سا گوشت دلوا دے۔

"کچھ فائدہ نہیں۔ عادت ہی بگڑے گی سالے کی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اسٹائل تو دیکھو۔ دھونس جماتا ہے سالا۔ میں تو گوشت کھاؤں گا۔ جیسے اپنے باپ کے گھر میں بیٹھا ہو۔" اس نے بے زاری سے منہ پھیرلیا۔

○

باجی کو حیرت ہوئی کہ چندو اکیلا واپس آیا ہے" تیرے ابو کہاں ہیں رے چندو؟" انہوں نے پوچھا۔

چندو جواب نہیں دے سکتا تھا مگر اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے شیڈ میں چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ جگالی کرنے لگا۔ باجی کو جو تشویش تھی، وہ دور ہوگئی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو چندو یوں سکون سے آکر نہ بیٹھتا۔ انہوں نے جاکر چائے کا پانی رکھ دیا۔

پانچ منٹ بعد بھائی جان گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے کو ایک نظر دیکھ کر باجی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ غصے میں ہیں۔

بھائی جان کمرے میں چلے گئے۔ باجی نے چائے نکالی اور دونوں پیالیاں چھوٹی ٹرے پر رکھ کر کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے چائے کی پیالی شوہر کو دیتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ غصہ کیوں آرہا ہے آپ کو.... اور کس پر آرہا ہے؟"

بھائی جان نے چونک کر انہیں دیکھا "نہیں ..... غصہ تو نہیں آرہا ہے۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"مجھ سے آپ کچھ نہیں چھپا سکتے۔" باجی مسکرائیں۔

"آپ بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔ آج آپ پریشان ہیں؟"

"نہیں لیکن صبح سے جھنجلا رہی ہوں۔"

"کوئی وجہ بھی ہوگی؟"

"ہے۔ بتا بھی دوں گی مگر پہلے آپ بتائیں۔"

بھائی جان نے انہیں پورا واقعہ سنایا پھر بولے "میں تو اس کا سر پھاڑ دیتا۔ بڑا آیا شیخ کہیں کا۔"

"پھر بھی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" باجی نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"کیسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ میں نے کیا کیا ہے؟" بھائی جان جھنجلا گئے۔

"آپ کو اس کے بچے کے متعلق ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بری بات ہے۔"

"یہ بات آپ کہہ رہی ہیں۔" بھائی جان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ دیکھیں نا ' دنیا میں سب سے بڑی محبت اولاد کی ہوتی ہے۔ سب سے عزیز چیز اولاد ہوتی ہے۔" باجی کی سماعت میں نعمت کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"تو چندو ہماری اولاد نہیں ..... ہمارا بیٹا نہیں۔"

"ہے۔ لیکن دوسرے اس بات کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تو یہی کہیں گے۔" باجی نے آہ سرد بھر کے کہا "آج کسی اور نے بھی مجھ سے یہی بات کی .... مذاق میں نہیں۔ بہت سنجیدگی اور خلوص سے۔"

"کس نے ....؟"

"نعمت نے اور میں اس پر خفا ہوئی مگر میں نے اس کے بچوں کو کچھ نہیں کہا۔"

"کیوں؟ جب کہ آپ چندو کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔"

"میں آپ سے زیادہ چاہتی ہوں اسے لیکن عورت حقیقت پسند ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ چندو میرا بیٹا ہے ..... مگر دنبہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے' جو بدل نہیں سکتی اور دوسرے تو اسے دنبہ سمجھ کر ہی بات کریں گے۔ کتنی ہی تکلیف دہ سہی' مگر ان کی بات ناروا نہیں۔ دیکھیں نا' کوئی کسی دشمن کی اولاد کے لئے بھی ایسے نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے اسے دنبہ ہی سمجھ کر تو کہا۔ وہ ہمارا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتے۔ حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔"

"میں تو خون پی جاؤں ایسا کہنے والے کا۔" بھائی جان بپھر گئے۔

اس لیے کہ آپ حقیقت پسند نہیں۔ آپ کی محبت میں گہرائی نہیں۔ آپ چندو کو دنبہ نہیں' اپنا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔ جس لمحے آپ اسے دنبہ تسلیم کرلیں گے' اسے بیٹا سمجھنا چھوڑ دیں گے .... اور آپ کی محبت بھی کم ہو جائے گی۔"

"بس شمسہ بیگم! نہ آپ اس وقت کلاس میں ہیں۔ نہ میں آپ کا اسٹوڈنٹ ہوں۔" بھائی جان ہنس دیے۔

باجی بھی ہنس دیں۔ دل کا غبار نکل گیا تھا۔ دونوں ہلکے پھلکے ہوگئے۔ دونوں نے سوچا .... کہنے دو۔ کسی کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔



کھانے کے بعد دونوں لڑکے پھر چل دیے۔ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ دونوں خاموش تھے .... اور دونوں کی خاموشی کا سبب شرمندگی تھی۔ اصغر شرمندہ تھا کہ بھوک نے اسے .... خود غرض بنا دیا۔ اس نے اکیلے ہی اکیلے کھانا کھالیا جب کہ اختر بھوکا ہے۔ اختر کو یہ شرمندگی تھی کہ وہ اصغر کو یتیم خانے سے نکال لایا ہے اور اب سونے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ اب اصغر کہے گا کہ نیند آرہی ہے تو وہ کیا کرے گا۔ اس شرمندگی سے اختر کو ایک بہت بڑا فائدہ ہوا تھا۔ وہ اپنی بھوک بھول گیا تھا۔

دونوں بہت سارے بچوں کے درمیان سونے کے عادی تھے۔ اور یہ وہ رات تھی' جب ان کے سر پر چھت نہیں' نیلا آسمان تھا۔ انہیں اگر سونا تھا تو تنہا ہی سونا تھا۔ اب تک سونے کے لئے انہیں فٹ پاتھ کے سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی مگر روشن سے روشن فٹ پاتھ بھی انہیں اندھیرا ہی لگا تھا۔ جب کہ وہ خوب تیز روشنی میں سونا چاہتا تھا۔

دور سے اسے بہت تیز روشنی نظر آئی۔ روشنی خاصی بلندی پر تھی اور ان کے اندازے سے کافی دور تھی۔ وہ اس طرف بڑھتے رہے۔ وہ اب تک بہت زیادہ پیدل چل چکے تھے۔ تھکن سے ان کا برا حال تھا۔ خاص طور پر اختر کی حالت بہت ابتر تھی۔ پہلے تو اتنی مار اور اس کے نتیجے میں جسمانی اذیت۔ پھر دیوار توڑنے کی مشقت اور اب یہ پیدل چلنا۔ اب تو اس کے زخموں اور چوٹوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

وہ روشنیاں عائشہ منزل کی چورنگی کی تھیں۔ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ روشنیاں ایک چھوٹے سے پارک کے بیچ میں نصب ہیں۔ وہاں ایک فوارہ بھی چل رہا

تھا۔ وہ مسحور ہو کر رہ گئے۔ "بس ہم یہاں سوئیں گے۔" اختر نے خوش ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اصغر نے تائید کی۔ وہ بھی خوش نظر آرہا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ شاپنگ سینٹرز پر تو اب بھی رش ہوگا مگر اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا اور راہ گیر تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے سڑک پار کی اور اس چھوٹے سے پارک میں گھس گئے۔ روشنی انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی مگر اسی لمحے فوارہ بند ہوگیا۔

"یہاں سوئیں گے۔ کیسا مزہ آئے گا۔" اختر نے کہا۔

"واقعی ....." اصغر نے تائید کی "گھاس کیسی اچھی لگ رہی ہے .... ٹھنڈی ٹھنڈی۔"

دونوں ننگے پاؤں تھے اور خوب پیدل چلے تھے۔ ان کے تلوے بری طرح جل رہے تھے۔ ایسے میں گھاس کی ٹھنڈک ان کیلئے بہت بڑی نعمت تھی۔ ادھر سے ادھر گھاس پر چکر لگاتے رہے۔ وہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ وہ پارک نہیں تھا۔ چھوٹی سی چورنگی تھی' جہاں گھاس لگا کر درمیان میں فوارہ لگا دیا گیا تھا۔

"بس یہاں دری بچھائیں گے اور سو جائیں گے۔" اختر نے کہا۔

"دری بچھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" اصغر بولا "گھاس پر ہی سو جائیں گے۔"

"کیا پتا' کیڑے مکوڑے ہوں۔ دری بچھانا ہی ٹھیک ہے۔"

انہوں نے دری بچھائی اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اصغر تو فوراً ہی سو گیا لیکن اختر کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے لئے رات آسان نہیں ہے۔ جسم کی چوٹیں اور اذیتیں' مشقت کی دکھن اور پھر آج کا پیدل چلنا۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مگر پھر بھوک نے ہر تکلیف کا احساس مٹا دیا۔ پیٹ میں جیسے کوئی جانور گھسا بیٹھا تھا' جو اپنے تیز پنجوں سے جسم کی دیوار کو کھرچ رہا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں پچھتاوا ابھرا۔ اگر وہ بھی اصغر کے ساتھ بیٹھ کر کھالیتا تو .... مگر فوراً ہی ضد نے اس پچھتاوے کو مٹا دیا۔ گوشت کی خاطر اس نے اتنی اذیت جھیلی تھی۔ اب وہ اس پر سمجھوتا کیسے کرتا۔

اسے پہلے مولوی صاحب کی یاد آئی اور پھر اللہ میاں کا خیال آیا۔ مولوی صاحب کہتے تھے .... جو مانگنا ہے' اللہ سے مانگا کرو۔ وہ سب کچھ دیتا ہے۔ کل جہانوں کا مالک ہے اور اسے بندے کا عاجزی سے مانگنا بہت پسند ہے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔

اس نے آسمان کی طرف منہ کیا اور بڑبڑایا "پیارے اللہ میاں' دیکھیے ..... آپ تو جانتے ہیں کہ میرا گوشت کھانے کو کیسا جی چاہتا تھا۔ میں نے گوشت مانگا تو کیا برا کیا۔ شاہ جی مجھے گوشت دے سکتا تھا لیکن نہیں دیا۔ الٹا مجھے مارا۔ اب مجھے کوئی بھی گوشت نہیں دیتا۔ آپ مجھے گوشت بھیج دیں۔ میں بہت شکر ادا کروں گا۔ دیکھیں ..... اب تو بقر عید آرہی ہے۔ مجھے خوب سارا گوشت ملنا چاہیے۔ اتنا کہ میں جی بھر کے کھاؤں پھر میں کبھی پتلی دال سے بھی انکار نہیں کروں گا۔"

وہ دعا کرتا رہا ..... دعا کیا' وہ تو اللہ میاں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہی سب کچھ دہراتا رہا۔ اچانک ہی اس کے پیٹ کی بے قراری کو جیسے قرار آگیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ سو گیا۔ خواب میں اس نے خود کو ایک ایسے دسترخوان پر پایا' جہاں گوشت ہی گوشت تھا۔ سیخ کباب' بوٹیاں' بھنا ہوا قیمہ' بھنا ہوا گوشت اور وہ جی بھر کے کھا رہا تھا۔ خوب سیر ہو کے کھانے کے بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس لمحے کسی نے جھنجوڑ کر اسے جگایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا دم نکل گیا۔ وہ ایک پولیس والا تھا اور وہ ان دونوں کو باری باری جھنجوڑ رہا تھا۔

اصغر بھی اٹھ بیٹھا "کیوں بھئی' تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟" پولیس والے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اصغر کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔ وہ تو ویسے بھی ڈرپوک تھا اور اس وقت گہری نیند سے اٹھا تھا۔

"بولتے کیوں نہیں۔"

"ہم سو رہے ہیں جی۔" اختر نے دل کڑا کر کے کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر یہاں کیوں سو رہے ہو؟"

"فٹ پاتھ پر اندھیرا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ابے آلو' میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔" پولیس والے نے کہا "کیا گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"ہمارا گھر نہیں ہے جی۔" "مگر اس سے پہلے کہیں تو رہتے ہو گے؟"

اختر جھوٹ گھڑنے والا تھا پھر نجانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا "ہم یتیم خانے میں تھے جناب۔"

"تو یتیم خانے سے بھاگے ہو۔ کیوں؟"

اختر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ پولیس والا بڑے غور سے سنتا رہا پھر سرہلا کر بولا "ہم پولیس والے تو بدنام ہیں۔ تمہارے شاہ جی جیسے لٹیروں کی یہاں عزت ہوتی ہے۔ انہیں سوشل ورکر کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ ہمارے مقابلے میں بہت بڑے مجرم ہیں مگر انہیں تو حکومت سے تمغا ملتا ہے۔ ہم پبلک کی گالیاں بھی کھاتے ہیں اور حکومت کی بھی۔ کیسا اندھیر ہے۔ حرامی کہیں کے .... یتیموں کا مال بھی کھا جاتے ہیں اور ظلم الگ توڑتے ہیں۔"

اختر کو نہ تو سوشل ورکر کا مطلب معلوم تھا۔ نہ ہی اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی تھی۔ پولیس والے کی باتوں سے اصغر کا بھی حوصلہ بڑھا۔ اس نے کہا "اس اختر نے پورے دن کچھ نہیں کھایا ہے انسپکٹر صاحب!"

پولیس والا ہنسنے لگا "میں انسپکٹر نہیں ہوں پگلے۔ میں تو معمولی کانسٹیبل ہوں۔" پھر وہ اختر کی طرف مڑا "ایسی ضد کرکے اپنی جان پر ظلم نہیں کرتے بیٹے۔ کل جو بھی ملے' کھالینا۔ پرسوں بقرعید ہے۔ گوشت مل ہی جائے گا۔"

"میں نے تو اللہ میاں سے گوشت مانگ لیا ہے کانسٹیبل صاحب! وہ مجھے دے دیں گے۔"

"اللہ تو اپنے بندوں کو وسیلہ بناتا ہے مگر آج کل بندوں کے دل بہت سخت ہوگئے ہیں۔" پولیس والے نے سرد آہ بھر کر کہا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا اور اصغر کو دیا۔ "اس وقت تو میرے پاس یہی ہے۔ رکھ لو۔ صبح ناشتا پانی کرلینا۔"

"شکریہ کانسٹیبل صاحب!"

"مگر آج کل یہاں سونا خطرے سے خالی نہیں۔" کانسٹیبل بولا۔

"کیوں .....؟"

"دہشت گردی کی وجہ سے۔ دہشت گرد کسی کو بھی نہیں بخشتے۔ خیر صبح چھ بجے تک تو میری ڈیوٹی ہے۔ میں تمہارا خیال رکھوں گا۔ سو جاؤ لیکن سنو' تم ہمیشہ تو یہاں نہیں سوسکتے۔ کیا کرو گے آگے؟"

لڑکے ٹکر ٹکر اسے دیکھتے رہے۔ وہ خود اس سوال کا جواب تلاش کر رہے تھے مگر وہ مل نہیں رہا تھا۔

"ایسا کرو' عید کی تیسری رات مجھے یہیں ملنا۔ میں تمہیں ایک ہوٹل میں رکھوا دوں گا۔ اس کا مالک میرا جاننے والا ہے۔"

"شکریہ کانسٹیبل صاحب!"

پولیس والا چلا گیا۔ اصغر سو گیا مگر اختر کو نیند نہیں آئی۔ حالانکہ .... اب بھوک اسے نہیں ستا رہی تھی۔ جیسے گوشت کھانے کا وہ خواب' خواب نہیں' حقیقت ہو۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے بھی نیند آگئی۔



چندو بے خبر سو رہا تھا لیکن باجی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ا احساس ہوا کہ ان کے شوہر بھی جاگ رہے ہیں "کیا بات ہے۔ آپ سوئے نہ" انہوں نے پوچھا۔

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" بھائی جان نے جواب دیا۔

"کیوں بھئی۔ سر میں تیل لگا دوں؟"

"ارے نہیں' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دراصل بے فکری ہے نا۔ ص میں تو جانا نہیں ہے۔ اطمینان سے دیر تک سوؤں گا۔"

پریشانی کی بات تو ہے۔؟باجی کے لہجے میں تشویش تھی "بنا بنایا معمول نہیں ہونا چاہیے۔ جو ایک دن ہو سکتا ہے' وہ کسی بھی دن ہو سکتا ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ ابھی سو جاؤں گا ذرا دیر میں۔"

باجی جانتی تھیں کہ وہ ابھی تک شیخ صاحب کی بات پر جل کڑھ رہے ہیں تیل کی شیشی لائیں اور شوہر کے سر میں تیل ملنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ذکریا ص کو نیند آ گئی۔ وہ سو گئے لیکن باجی کی آنکھوں میں اب بھی نیند نہیں تھی۔



شبیر شاہ کو اختر کی طرف سے پریشانی تھی۔ وہ اس سلسلے میں غور کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس طرح انہوں نے اختر کو مارا ہے' کوئی اور ہوتا اس ک تو ہمیشہ کے لئے سیدھا ہو جاتا لیکن اس لڑکے کی اکڑ دیکھو۔ پٹنے کے دوران اس اف بھی نہیں کی۔ معافی تک نہیں مانگی۔ یہ کیسی گوشت کی خواہش ہے؟ بہت ڈھیٹ ہے۔ انہوں نے غصے اور نفرت سے سوچا۔ ضرور کسی حرا

حرام کی اولاد ہو گا۔

انہوں نے آواز دے کر اسلام الدین کو بلایا۔ وہ آیا تو انہوں نے پوچھا "اس حرام زادے اختر کا کیا حال ہے؟"

"کیا پتا شاہ صاحب۔ آپ کے حکم کے مطابق اسے کوٹھری میں اکیلا پھینک دیا گیا ہے۔"

"ارے تو کسی نے اس کی خبر بھی نہیں لی؟"

"آپ نے منع کیا تھا جناب عالی۔"

"وہ تو بہت زخمی تھا۔ کہیں مر ہی نہ گیا ہو۔"

"یہ حرامی بہت سخت جان ہوتے ہیں شاہ صاحب۔"

"اچھا چل' مجھے نہ پڑھایا کر۔" شاہ صاحب نے غصے سے کہا۔ "جا نظام کو بلا کر لے آ۔"

اسلام الدین چلا گیا۔ شاہ صاحب سوچ رہے تھے کہ جو کچھ انہوں نے سوچا ہے' اس سے کم سے کم لوگ واقف ہوں تو بہتر ہے۔ اسلام الدین کو بھی بے خبر ہی رہنا چاہیے۔ بس بات ان کے اور نظام کے درمیان ہی رہے۔

اختر کو مارنے کے بعد سے وہ اس سلسلے میں غور کر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اختر کو منظور نظر لوگوں میں شامل کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب کہ شامل نہ کرنے میں وہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بس ایک رکاوٹ تھی ان کے ذہن میں۔ یہ سمجھوتا تھا اور انہیں کمزوری کے احساس میں مبتلا کرتا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ کیا اس طرح ہر کس و ناکس انہیں بلیک میل کرے گا۔

"یہاں عقل کے بجائے جذبات سے کام لیا تو یہ اختر اپنی سوچ' اپنی زبان پورے یتیم خانے کو دے دے گا۔" انہوں نے خود کو سمجھایا "پھر سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

چناں چہ انہوں نے حتمی فیصلہ کر لیا۔ نظام آیا تو انہوں نے اس سے اختر کے متعلق پوچھا۔ نظام نے بھی وہی جواب دیا' جو اسلام الدین نے دیا تھا "ارے ..... وہ تو میں غصے میں تھا ورنہ وہ تو بچہ ہے اور پھر یتیم بچہ۔ مجھے تو اپنی زیادتی کا شدید احساس

ہو رہا ہے۔ اس شام سے اب تک نہ میں ٹھیک طرح سے سوسکا ہوں۔ نہ میں ڈھنگ سے کھانا کھایا ہے۔" شاہ صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں آ آگئے۔

نظام نے شاہ صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ نیند کے بارے میں تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے تندروی روٹیوں کے ساتھ آدھا کلو بھنا ہوا گوشت سونتا تھا۔

"دیکھو نظام' اب جو بات میں کہہ رہا ہوں' وہ میرے اور تیرے درمیان رہے۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ صاحب۔"

"جو کچھ تو کھائے' وہی اختر کو دے دیا کر مگر سب سے چھپا کر۔ سمجھ گیا۔؟"

"سمجھ گیا شاہ صاحب۔"

"اور نیفو کے ساتھ جاکر اختر کو کوٹھری سے نکال لا۔ اس کی دوا دارو بھی ک یتیم بچہ ہے۔ دعا دے گا۔ اللہ نے یتیموں کے ساتھ نرمی کا حکم دیا ہے۔"

بید مار مار کر غریب کی کھال ادھیڑ دی اور اب اللہ کا حکم یاد دلاتا ہے ڈرا نظام نے دل ہی دل میں کہا پھر زبان سے بولا۔ "جی شاہ صاحب! یہ فرمائیں کہ ا آپ کے پاس لاؤں یا نہیں۔"

"نہیں۔ مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جائے گی۔" شاہ صاحب نے "بس اب تو جا۔"



یتیم خانے میں کھانا کھایا جا چکا تو نیفو کوٹھری کی طرف گیا۔ اس نے تالا کھ کر دیکھا تو ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آئی۔ دونوں لڑکے غائب تھے۔ وہ مسکرایا۔ اسے لڑ کی عقل مندی میں کوئی شبہ نہ تھا مگر اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنے عقل م ثابت ہوں گے۔ فرار ہوتے وقت انہیں اس کا خیال تھا۔ لہٰذا کدال' دری اور لا سب غائب تھیں۔ وہ برتن وہ البتہ چھوڑ گئے تھے' جن میں وہ گرم پانی اور ہلد

لیپ لایا تھا۔ کدال کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہ موجود ہوتی تو اسے کہانی گھڑنا پڑتی۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اس نے دونوں برتن اٹھائے' کوٹھری کو تالا لگایا اور واپس چل دیا۔ برتن اس نے دھو دھلا کر کچن میں رکھ دیے۔ پھر وہ ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد نظام اس کے پاس آیا "نیفو .... چل کر کوٹھری کھول۔"

"کیوں؟"

"اختر کو نکالنا ہے۔ یہ شاہ صاحب کا حکم ہے۔"

"خیر تو ہے۔ کیا پھر ماریں گے اسے؟"

"نہیں۔" نظام مسکرایا "شاہ جی نے اسے ہم میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب جو ہم کھائیں گے' وہ اسے بھی دیں گے لیکن چپکے سے۔" وہ کہتے کہتے رکا اور نیفو کو بہت غور سے دیکھا۔ "سن .... یہ بات بس تیرے اور میرے درمیان ہے۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

نیفو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ نظام کو لے کر کوٹھری کی طرف چل دیا۔

کوٹھری کا منظر دیکھ کر نظام کو سکتہ ہوگیا۔ نیفو نے بھی اداکاری کی "ارے .... یہ کیا۔ وہ دونوں کہاں گئے؟"

"ابے وہ اتنا بڑا سوراخ نظر نہیں آرہا ہے۔ ایسے گئے۔" نظام نے بھنا کر کہا "مگر ہوا کیسے؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔ میں تو ایک بار ہلدی اور گرم پانی لایا تھا پھر دوسری بار آیا تو اصغر کو یہاں سے لے گیا اور برتن بھی لے گیا۔ اس کے بعد سے تو میں اب آیا ہوں۔"

"تو نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔ تجھے تو بڑی فکر تھی اس کی۔" نظام نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی کا حکم اتنا سخت تھا۔ مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی اس کی دیکھ بھال کی۔"

"مگر یہ دیوار اس نے توڑی کیسے؟"

"یہ باہر کا کام ہے۔ پہلے چل کر اصغر کو دیکھو پھر بتاؤں گا۔"

انہوں نے جاکر چیک کیا تو اصغر موجود نہیں تھا "وہ کہیں سے کدال لے گیا ہوگا اور دیوار توڑی ہوگی۔" فیضو نے کہا۔

نظام بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

"دونوں بڑے پکے دوست تھے۔" فیضو نے وضاحت کی۔

"اب تو ہی شاہ جی کے سامنے جواب دینا۔ وہ تیری ذمے داری تھے۔"

"تو میں ڈرتا ہوں کیا۔" فیضو نے سینہ تان کر کہا "ڈروں تو جب کہ میں چور ہوں۔" "لیکن مجھے لگتا ہے کہ تو اس کے پاس جاتا رہا ہے۔" نظام نے کہا پھر راز داری کے انداز میں بولا "ہلدی تو تو مجھ سے ہی لے کر گیا تھا۔"

"مگر میں یہ بات شاہ جی کو نہیں بتا سکتا۔ تو میرا دوست ہے۔" فیضو کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"تو شاہ جی کو یہ پتا کیسے چلے گا۔ بس تو جانتا ہے اور میں جانتا ہوں۔" نظام سیدھا ہوگیا "چل شاہ جی کے پاس۔"



شبیر شاہ تو دونوں لڑکوں کے فرار کی خبر سن کر آپے سے باہر ہوگئے "میں نے اسے تیری ذمے داری بنایا تھا۔ انہوں نے فیضو پر آنکھیں نکالیں۔

"تو شاہ جی' میں نے تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔" فیضو نے مسمی سی شکل بنا کر کہا۔

"تو نے خبر تک نہیں لی اس معصوم کی۔"

"آپ کا حکم تھا شاہ جی!"

"وہ میں نے غصے میں دیا تھا۔"

"اور کیا۔" نظام نے ٹکڑا لگایا "شاہ جی سے تو اس کے غم میں سویا جا رہا ہے نہ کھانا کھایا جارہا ہے۔"

شاہ جی نے اسے گھور کر دیکھا مگر بات آگے نہیں بڑھائی۔ "حیرت ہے' وہ نکل

کیسے گئے۔"

"بہت تیز لڑکے تھے شاہ جی!" فیضو بولا "اصغر نے اسٹور سے کدال نکالی اور کام دکھا دیا۔"

"مجھے یہ بات اتنی سادہ نہیں لگتی۔ خیر...." شاہ جی نے گہری سانس لی "کچھ بھی ہو' انہیں ڈھونڈ کر لانا ہے۔"

"ہونا تو یہی چاہیے شاہ جی۔ واپس آئیں تو مار مار کے کھال گرا دیجئے گا سسروں کی۔

"بے وقوف' میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔" شاہ جی نے غصے سے کہا "ہم انہیں پہلے سے زیادہ اچھا رکھیں گے۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگتے پھریں گے کم بخت۔ بدنامی ہماری ہوگی۔ میری ایک ساکھ ہے شہر میں۔ ہم کتنے ہی خراب سہی۔ ہم نے بھیک نہیں منگوائی اپنے بچوں سے۔ بے چارے ...." شاہ جی پر رقت طاری ہونے لگی "فیضو ...... انہیں واپس لانا بھی تیری ذمے داری ہے۔"

فیضو ہکا بکا رہ گیا "یہ کیسے ممکن ہے شاہ جی! آپ سوچیں تو میں اتنے بڑے شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔"

شاہ جی نے چند لمحے سوچا' پھر سرہلا دیا "بات تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے آواز دے کر اسلام الدین کو بھی بلالیا "اسلام الدین' اختر اور اصغر بھاگ گئے ہیں۔ ان کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرانی ہے پولیس میں۔"

"ہائیں .... وہ بھاگ گئے۔ وہ تو کوٹھری میں تھا .... اختر۔"

"میں نے بتایا ناکہ وہ بھاگ گئے۔" شاہ جی نے اس پر آنکھیں نکالیں "تم میری بات سنو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"رپورٹ درج ہو جائے گی شاہ جی!" اسلام الدین نے فیضو کو گھورتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے پھر کچھ غور و فکر کیا "اور وہ آفس سے ایک ہزار روپے لے کر بھاگے ہیں۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

"لیکن شاہ جی' یہ سچ نہیں ہے" فیضو نے احتجاج کیا۔

"تو چپ رہ۔" شاہ جی نے اسے ڈانٹا پھر کچھ سوچ کر نرم پڑ گئے۔

"یہ اس لیے ضروری ہے کہ پولیس جب انہیں پکڑے گی تو وہ ہمیں بدنا[م] کرنے والی باتیں کریں گے۔ اس کا توڑ یہی ہے اور پولیس کیا کرے گی۔ وہ انہیں ہماری تحویل میں دے گی نا۔"

"میری مانیں تو شاہ جی' خاک ڈالیں اس معاملے پر۔ انہیں ان کے حال [پر] چھوڑ دیں۔" نظام نے رائے دی۔

"تاکہ وہ ہمیں شہر بھر میں بدنام کرتے پھریں۔"

"ان کی کون سنے گا شاہ جی! آپ کی تو بڑی عزت ہے۔"

"بے اثر کوئی بات نہیں ہوتی اور عزت خراب ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ تم دونوں جاؤ اب۔" شاہ جی اسلام الدین کی طرف مڑے "تم سمجھ گئے ہو نا؟"

"جی شاہ جی! آپ بے فکر ہو جائیں۔" اسلام الدین نے کہا۔ نظام اور فیضو کمرے سے نکل آئے۔

فیضو اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ اسے احساس جرم ستا رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں بھلائی کی تھی لیکن وہ دونوں بچوں کے ساتھ زیادتی بن گئی۔ اگر وہ فرار نہ ہوئے ہوتے تو اب یتیم خانے میں زیادہ بہتر رہتے۔ شاہ جی نے اپنا رویہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر اب بچے دہری مصیبت میں تھے۔ ایک طرف تو ان کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا .... کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ جانے کہاں کہاں پھر رہے ہوں گے بے چارے ..... کھائیں گے کہاں سے .... سوئیں گے کہاں؟ اور اب پولیس کی مصیبت بھی گلے پڑ گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ اس نے انہیں بھاگنے کا موقع دیا تھا۔

بے چارے .... اس وقت نجانے کہاں سو رہے ہوں گے۔ اس نے سوچا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔



نیند باجی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چندو کو خود سے لپٹائے ہوئے وہ

چندو ہی کے بارے میں سوچے جا رہی تھیں۔ ذہن کے پردے پر فلم سی چل رہی تھی۔

ذکریا صاحب سے ان کی شادی کو چودہ برس ہو چکے تھے۔ وہ بہت اچھے انسان اور بہت اچھے شوہر تھے۔ چند مہینوں میں ہی باجی کو اندازہ ہوا کہ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔ لگتا تھا' اللہ نے انہیں بنایا ہی ایک دوسرے کے لئے ہے۔ ان کے درمیان کبھی تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے۔

باجی نے شادی سے پہلے کبھی بچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی .... بچوں سے پیار ہی نہیں کیا تھا مگر شادی کے بعد انہیں بچوں پر پیار آنے لگا۔ ممتا کا خزانہ ان کے سینے میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ وہ بتدریج سامنے آتا گیا۔

شادی کو ایک سال ہوا پھر دو ..... اور پھر تین سال ہو گئے۔ ان کی گود ہری نہیں ہوئی۔ اب انہیں تشویش شروع ہوئی۔ پہلے علاج پر اور پھر فقیروں پر روپیہ خرچ ہونے لگا۔ باجی کو دو طرف کی فکر تھی۔ ایک تو یہ کہ خود انہیں اولاد کی آرزو تھی۔ دوسرے وہ عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو گئیں۔ مرد کی دوسری شادی کی تلوار یوں تو اس معاشرے میں عورت کے سر پر لٹکی ہی رہتی ہے مگر اولاد نہ ہو تو اس تلوار کے سر پر گرنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے' ان کی مایوسی اور پریشانی بھی بڑھتی ہی گئی۔

ذکریا صاحب سمجھ دار آدمی تھے۔ انہوں نے اس مسئلے کو سمجھ لیا۔ ایک دن وہ خود باجی کو سمجھانے بیٹھ گئے "دیکھو شمسہ' تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ میں یہ بات کہنے والا نہیں لیکن تمہیں یقین دلانے کے لئے کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔"

"میں یہ بات جانتی ہوں۔" باجی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اب یہ بھی سن لو کہ مجھے اولاد کی خواہش تو ہے مگر تم جانتی ہو' میں شاکر آدمی ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ اللہ کو منظور ہو گا تو ہماری خواہش پوری ہو گی ورنہ نہیں ہو گی اور میں اس سلسلے میں نہ تمہیں قصور وار سمجھوں گا نہ خود کو۔ دیکھو نا' دنیا میں کسی کو بھی سب کچھ تو نہیں ملتا۔ ہر خواہش تو کسی کی بھی پوری

نہیں ہوتی۔ ہمیں تو اس پر خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔ میرے لیے تم بہت بڑی نعمت ہو ..... اور میں کفران نعمت کرنے والا آدمی نہیں۔"

باجی انہیں حیرت سے دیکھتی رہیں "لیکن آرزو تو مجھے بھی ہے اور ..... بہت زیادہ ....."

"اس میں کوئی حرج نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اسے مسئلہ نہ بناؤ۔ خوف زدہ نہ ہو۔"

یوں باجی قدرے مطمئن ہوگئیں۔ ان کا ایک مسئلہ حل ہوا ..... عدم تحفظ کا ..... تو وہ دوسرے مسئلے میں الجھ گئیں۔ پیروں فقیروں کے' ڈاکٹروں اور حکیموں کے چکر لگتے رہے لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ شادی کو سات سال ہوگئے تو وہ مایوس ہوگئیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اب وہ دعا کے سوا کچھ نہیں کریں گی۔

باجی کے گھر کے سامنے ایک مکان چھوڑ کر اماں رہتی تھیں۔ وہ بہت نیک اور پابند شرع خاتون تھیں۔ نہ ان کی کبھی نماز قضا ہوئی تھی اور نہ ہی کبھی روزہ چھوٹا تھا۔ یہی نہیں' کسی حد تک وہ صاحب حال بھی تھیں۔ ان پر اکثر و بیشتر ایک ایسی بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اس کیفیت میں جو ان کے منہ سے نکل جاتا' اللہ کی مہربانی سے پورا ہوجاتا۔

اماں ماشاء اللہ کنبے والی تھیں۔ بیٹا بیٹی' پوتا پوتی' نواسہ نواسی ۔ اللہ نے انہیں ہر رشتہ عطا کیا تھا۔ بھرا ہوا گھر تھا۔ بس ایک کمی تھی' جس کی اللہ نے خوب اچھی طرح تلافی کی تھی۔ اماں جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں اور جب وہ بیوہ ہوئیں تو ان کے بچے بہت چھوٹے تھے۔ اماں خانہ دار خاتون تھیں۔ شوہر کی چھوڑی ہوئی زمین اور جائداد ان کے لئے مسئلہ بن گئی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہیں اور بچوں کو فاقے کرنے پڑے۔ جائداد کا تصفیہ کرانے والے انصاف نہ کرسکے۔ کمزور کے ساتھ انصاف کرنا ہوتا ہی مشکل ہے۔ بہرکیف جیسے تیسے گزارہ ہوتا رہا۔ اماں نے وہ کڑا وقت بڑی خود داری اور سربلندی سے گزارا۔ پھر انہیں ان کا حق تو نہیں' حق کا ایک معمولی سا حصہ ملا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اسے بھی کسی کو سونپ کر اپنے بچوں کو سمیٹ پاکستان

آگئیں۔ یہاں ان کے بچوں نے بڑی محنت سے اپنا مقام بنایا۔ اللہ نے ہر اعتبار سے ان کے گھر کو برکت کا گہوارہ بنا دیا ..... روپے پیسے کے معاملے میں بھی اور اولاد کے معاملے میں بھی۔

پڑوس کا معاملہ تھا۔ ملنا جلنا ہوا تو باجی اماں کی گرویدہ ہوگئیں۔ پھر یہ گرویدگی ایسی بڑھی کہ اماں باجی کے لئے پیرانی کا روپ دھار گئیں۔ اماں کی کوئی بات باجی کبھی نہیں ٹالتی تھیں اور اپنا ہر دکھ' ہر پریشانی اماں ہی کو بتاتی تھیں۔

باجی کی شادی کو گیارہ سال ہوچکے تھے اور وہ اب بھی بے اولاد تھیں۔ ایسے میں ایک دن اماں نے اپنی مخصوص کیفیت میں انہیں مشورہ دیا "شمسہ' تم ایسا کرو کہ کوئی جانور پال لو۔ دکھ بٹ جائے گا۔ اولاد اللہ کی مرضی نہ سہی۔ اللہ کی کوئی مخلوق ہی اپنالو۔"

باجی نے سوال کیا بھی تو کیا ..... "اماں ..... کون سا جانور پالوں؟"

"جو تمہیں بھلا لگے۔ جس پر تم اپنی ممتا لٹا سکو۔"

"اچھا اماں۔"

"مگر یاد رکھنا۔ جانور پالنا بچے پالنے سے مشکل کام ہے۔ ماں بن کر ہی دکھانا ہوگا۔"

"بہت بہتر اماں۔"

باجی نے ایسے ہی کہہ دیا تھا ..... ارادے کے بغیر۔ صرف اس لیے کہ اماں کی بات وہ ٹال نہیں سکتی تھیں مگر انہوں نے اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں۔ کچھ دیر غور ضرور کیا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا پالیں۔ کسی جانور پر دل ہی نہیں ٹھکتا تھا۔

شادی کے بعد باجی کے سینے میں ممتا کا جو چشمہ پھوٹا تھا' بارہ سال کے عرصے میں وہ بپھرا ہوا سمندر بن چکا تھا۔ اس کی وجہ سے ان پر کبھی کبھی عجیب کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ دکھ کی' محرومی کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی خوشی کی وجہ سے۔ بس انہیں ایسا لگتا کہ ان کے سینے میں موجود دل پگھل رہا ہے۔ وہ دیر تک روتیں۔ ہچکیاں بندھ جاتیں۔ اس کے بعد وہ کئی

دن تک ہلکی پھلکی رہتیں۔

اس روز ان پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی لیکن وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھیں۔ وہ اماں کے گھر جانے کے ارادے سے چلیں مگر اپنے دروازے سے نکلتے ہی ٹھٹک گئیں۔ ایک بکریاں چرانے والا گزر رہا تھا۔ اس نے بھیڑ کے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں بھرا ہوا تھا۔ وہ میمنا باجی کو اتنا اچھا لگا کہ گویا آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا۔

"اے بھیا ....؟" انہوں نے اسے پکارا۔

"جی باجی!"

"یہ میمنا کس کا ہے؟"

"میرا ہے باجی!"

"بیچو گے؟"

"جی باجی۔ مگر کچھ بڑا ہونے پر لے لیجئے گا۔"

"کیوں؟"

"ابھی یہ صرف تین دن کا ہے۔ ان کے بہت نخرے ہوتے ہیں باجی۔ ابھی یہ کچھ کھا بھی نہیں سکتا نا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ بیچنا ہو تو بتاؤ۔"

"یہ تو ہے ہی بیچنے کے لیے۔"

باجی نے میمنے کو گود میں لے کر دیکھا۔ وہ درحقیقت بہت حسین تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں مگر اس کا سب سے بڑا حسن اس کے ہاتھ پیروں پر' کھروں سے ذرا اوپر سیاہ دائرے تھے۔ ایک سیاہ دائرہ پیشانی پر بھی تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

"کتنے کا دو گے؟" باجی نے پوچھا۔

"جو جی چاہے' دے دیں۔"

"نہیں بھیا۔ منہ مانگی قیمت دوں گی۔ یہ تو میرا بیٹا ہے نا۔"

"اچھا بیس روپے دے دیں۔"

باجی نے جھٹ بیس روپے لا اسے دیے اور میمنے کو گھر میں لے گئیں۔ انہوں نے اسے سینے سے لپٹایا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا "میرا بیٹا بنے گا؟"

اب نجانے وہ ان کا خیال تھا یا سچ مچ ننھے سے میمنے کی آنکھوں کی چمک ان کے لئے جواب بن گئی۔ کیفیت تو ان پر پہلے ہی طاری تھی۔ ان کی آنکھیں برسیں اور ایسی برسیں کہ ان کے آنسوؤں نے چھوٹے سے میمنے کو سچ مچ نہلا دیا۔ اس دوران وہ اسے دیوانہ وار پیار کئے جا رہی تھیں .... چوم رہی تھیں۔

آنسو تھمے تو باجی کو احساس ہوا کہ ان کا وجود ایک ایسی خوشی سے سرشار ہو گیا ہے' جس سے وہ متعارف ہی نہیں تھیں۔ ان کا وجود بیٹے کی محبت اور اللہ کی شکر گزاری سے لبالب بھر گیا تھا۔ وہ تو اس وقت ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ بادلوں پر تیر رہی تھیں۔

محبت کی وہ بارش رکی تو وہ میمنے کو گود میں لیے اماں کے پاس چلی گئیں۔ اماں اس وقت عصر کی نماز پڑھنے کے بعد دعا کر رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں "کیسی ہو شمسہ؟ بہت خوش نظر آ رہی ہو۔"

باجی نے میمنے کو آنچل میں چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے آنچل ہٹا کر اماں کو دکھاتے ہوئے کہا "اماں ..... یہ میرا بیٹا ہے۔"

اماں نے بہت غور سے میمنے کو دیکھا "ماشاء اللہ .... بہت پیارا ہے۔" انہوں نے کہا "نام کیا رکھا ہے اس کا؟"

"اماں ..... یہ تو میری اندھیری رات کا چاند ہے۔" باجی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں نام سوجھ گیا "اس کا نام چندو ہے اماں۔"

"پیارا نام ہے۔ اللہ تمہیں ماں بننے کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔"

باجی چندو کے لیے فیڈر خرید کر لائیں اور دودھ کا بندوبست کیا۔ وہ بوتل سے اسے دودھ پلا رہی تھیں کہ بھائی جان دفتر سے آ گئے "یہ کیا بھئی شمسہ؟"

"یہ میرا .... ہمارا بیٹا ہے چندو۔"

بھائی جان نے انہیں ایسی نظروں سے دیکھا' جیسے ان کے خیال میں باجی کا دماغ چل گیا ہو "یہ کیا حماقت ہے ...."

"آگے کچھ نہ کہئے گا۔" باجی نے تیز لہجے میں کہا "میں آپ کو بتا چکی ہوں' یہ میرا بیٹا چندو ہے۔"

معاملہ فہم بھائی جان سمجھ گئے کہ احتیاط سے کام نہ لیا تو تلخ کلامی اور لڑائی جھگڑے کا صاف ستھرا ریکارڈ خراب ہو سکتا ہے۔ "ٹھیک ہے بھئی۔ ویسے ہے بہت پیارا۔"

باجی یوں کھل اٹھیں جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کی تعریف پر کھلتی ہے "گود میں نہیں لیجئے گا؟"

"لوں گا مگر پہلے تو اسے نیچے چھوڑ کر دکھائیں۔ چلتا بھی ہے یا نہیں۔"

باجی نے چندو کو نیچے چھوڑا۔ چندو نے تو ایسی قلانچیں بھریں' ایسے کرتب دکھائے کہ باجی تو باجی' ان کے شوہر کا دل بھی لوٹ پوٹ ہو گیا۔

یوں چندو بیٹے کی حیثیت سے اس گھر میں پرورش پانے لگا۔ ابتدائی کچھ عرصہ تو بہت سخت تھا۔ باجی چندو کو ساتھ سلاتی تھیں .... اور یہ بھائی جان کو گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ الگ سونے لگے۔ باجی خود بھی بہت صفائی پسند تھیں لیکن ماں ان باتوں کو اہمیت دینے لگے تو بچے نہیں پال سکتی۔ وہ اس کا گوں موت بھی برداشت کرتی رہیں مگر جب چندو بڑا ہو گیا تو انہوں نے اس کی تربیت شروع کر دی۔ دیکھو چندو ..... ہر جگہ پیشاب پاخانہ نہیں کرتے۔ لیٹرین میں جاتے ہیں۔ چندو' ہر چیز میں منہ نہیں ڈالتے .... وغیرہ وغیرہ۔

جانور انسان کی گود میں آنکھیں کھولے اور اسے ایسی اور اتنی محبت ملے تو وہ جانور نہیں رہتا۔ وہ اپنے مالک کی فطرت اور عادات اپناتا ہے۔ اس کی ہر بات سمجھتا ہے۔ بس ایک مجبوری ہے۔ وہ انسان سے اس کی زبان میں بات نہیں کر سکتا اور چندو عام جانوروں سے بھی بڑھ کر تھا۔ وہ باجی کی ہر بات سمجھتا تھا۔

پھر بھی جانور تو جانور ہی ہے۔ تربیت کے دوران تو انسان کے بچے بھی پٹتے ہیں۔ باجی کا دل تو بہت دکھتا تھا مگر مارنا ضروری ہو جاتا تھا۔ پھر بھی اسے مار کر وہ

گھنٹوں اداس رہتیں۔ خود سے بھی منہ چھپائے پھرتیں۔ خود پر بھی غصہ آتا اور ہر بار وہ روتی بھی تھیں۔ ایسے میں چندو ہی انہیں مناتا۔ وہ آ کر ان کی ٹانگوں سے سر رگڑتا اور باریک سی ..... میں کی آواز نکال کر ان کے چہرے کو تکتا جیسے پوچھ رہا ہو .... ناراض ہیں؟ اور باجی اٹھا کر اسے گود میں بھر لیتیں۔

ایک بار وہ چندو کی پٹائی کر رہی تھیں کہ ان کی پڑوسن صفیہ آ گئیں "اے ہے شمسہ' پاگل ہوئی ہو۔ بے زبان جانور کو ایسے مار رہی ہو۔"

"جانور ہوں گے آپ کے بچے۔" باجی نے غضب ناک ہو کر کہا "یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کی بھلائی کے لئے اسے مار رہی ہوں۔ اچھے ماں باپ بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ محبت کو بھی آڑے نہیں آنے دیتے۔"

صفیہ کھسیا گئیں "سچ مچ سرک گئی ہو۔"

"تو آپ کو کیا۔"

چندو کی وجہ سے باجی کی سوشل لائف ختم ہو گئی۔ اسکول میں بھی وہ مشکل ہی سے وقت گزارتی تھیں۔ وہ اسکول میں ہوتیں تو چندو گھر میں کھلا پھرتا مگر مجال ہے جو اس نے کبھی لیٹرین کے سوا کہیں پیشاب اور مینگنیاں کی ہوں۔ بہرحال باجی نے اس کی خاطر ہر تعلق توڑ لیا اور ماں سے بڑھ کر ماں بن گئیں۔ کوئی خود ہی ملنے آ جاتا تو مل لیتیں۔

یوں بڑا ہوتے ہوتے خوش اطوار چندو پورے محلے کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔

باجی نے گہری سانس لی اور بے حد خوشی سے چندو کو دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ ان کے گلے میں تھا۔ یہ کتنا پہلے کی بات ہے؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔ پھر مسکرائیں۔ اس بات کو دو سال کے لگ بھگ ہو گئے تھے۔

اچانک انہیں سردی کا احساس ہوا۔ صبح ہوتے ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے پیروں کے پاس پڑا ہوا لحاف کھولتے ہوئے سوچا۔ پھر انہوں نے سوتے ہوئے چندو پر لحاف ڈال دیا۔ نیند اب بھی ان کی آنکھوں سے خفا تھی۔

اختر جانے کتنی دیر سویا ہوگا پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ یتیم خانے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی آنکھ سردی کی وجہ سے کھلی ہے۔ اس نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس کے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ سے جڑے ہیں' وہ سمٹا ہوا لیٹا ہے اور سردی اس کے وجود کے اندر تک تھرتھراہٹ پیدا کر رہی ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لیے۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ ٹھنڈ تو اسے نیچے سے چڑھ رہی ہے۔ تفتیش پر پتا چلا کہ وہ گھاس پر سو رہا تھا۔ اس کے نیچے دری بھی نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اصغر کو سردی لگی ہوگی تو اس نے دری کھینچ کر اوڑھنے کی کوشش کی' جو کامیاب بھی رہی۔ اس کے نتیجے میں اصغر نے اس کے نیچے سے دری کھینچ لی۔ اب اصغر مزے سے آدھی دری بچھائے' آدھی اوڑھے رہا تھا۔

ایک لمحے کو اختر کے جی میں آئی کہ اصغر سے دری چھین کر خود کو اس میں لپیٹ لے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ اچانک ہی بھوک کا احساس ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی نیند غائب ہوگئی تھی۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دبے ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔

اس چہل قدمی کے نتیجے میں اس کے جسم میں گرمی آگئی۔ سردی کا احساس تو دور ہوگیا مگر معدے میں بھوک کے پنجوں کی چبھن اور بڑھ گئی۔ وہ بے چین ہونے لگا۔

تھوڑی دیر گزری تو روشنیاں خودبخود بجھ گئیں پھر پرندوں کے چہچہے شروع ہوگئے۔ پرندوں کے غول کے غول نکلے اور رزق کی جستجو میں ادھر ادھر پرواز کرنے لگے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اختر یتیم خانے کی چار دیواری سے باہر بیٹھ کر صبح کا مشاہدہ کر رہا تھا مگر اس مشاہدے میں ارتکاز نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھوک تھی۔ وہ رہ رہ کر ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ اگر وہ پرندہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ مزے سے اڑتا پھرتا اور جہاں کہیں دانہ دنکا نظر آتا' چگنے کے لئے اتر جاتا اور وہ گوشت کی ضد سے بھی محفوظ

رہتا۔

اور کچھ دیر گزری۔ سورج طلوع ہوگیا۔ سورج کی ننھی منی کرنوں نے جسم کو چھوا تو سردی کا احساس دور ہوگیا۔ اصغر بھی جاگ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی نگاہوں میں بھی حیرت جھلکی پھر اس نے کہا "صبح ہوگئی۔"

دونوں وہیں گھاس پر بیٹھے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ چڑیوں کے چہکنے اور ہوا کی سرگوشیاں بتا رہی تھیں کہ کائنات جاگ اٹھی ہے لیکن انسان نہیں جاگے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی .... سوائے پرندوں کی آوازوں کے۔ کبھی کوئی گاڑی گزرتی تو سناٹا ایک لمحے کو ٹوٹتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

یتیم خانے میں تمام بچوں کو صبح سویرے جگایا جاتا تھا۔ وہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر میں صبح اسی وقت ہوتی ہے' جب وہ جاگتے ہیں' اسی لیے انہیں حیرت ہو رہی تھی۔

"یار اختر.... سب لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔" اصغر نے کہا۔

"ہاں۔ لگتا تو یہی ہے۔"

دونوں نے فوارے کے پانی سے منہ دھویا پھر وہ بیٹھ گئے۔ سڑکوں پر اب بھی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ انہیں گھبراہٹ ہونے لگی "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" اصغر نے اچانک کہا۔

اختر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنی بھوک کے متعلق اسے کیا بتاتا۔ گزشتہ روز دوپہر کے قریب جو اس نے چائے پاپے کا ناشتا کیا تھا' اس کے بعد سے اب تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس کی ضد اور پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ اب وہ بس گوشت ہی کھائے گا۔

"یہ مجھے بھوک اتنی کیوں لگتی ہے؟" اصغر نے سوال اٹھایا۔

"مجھے بھی لگتی ہے۔" اختر نے کہا پھر کچھ دیر سوچتا رہا "شاید ہمیں اس لیے زیادہ بھوک لگتی ہے کہ ہماری بھوک مٹ نہیں پاتی اور شاید اس لیے کہ ہم یتیم ہیں۔"

دونوں اداس ہوگئے۔ اصغر سوچ رہا تھا کہ یتیم خانے میں یہ فائدہ تو تھا کہ ا
وقت چائے اور اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو رات کی بچی ہو
روٹی ہی مل جاتی لیکن یہاں تو وہ بے یار و مددگار تھا۔

اس وقت انہیں سڑک پر ایک چائے والا جاتا نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ م
بڑی سی کیتلی اور پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھینکا تھا، ج
پر پیالیاں لٹک رہی تھیں۔

دونوں تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے سڑک پار کرتے کرتے ا
آواز دی۔ وہ رک گیا۔ اس نے دیوار کے قریب اپنی کیتلی اور دوسری چیزیں رکھ
اور ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں پہنچے تو چائے والے نے دو پیالیوں میں گرما گرم بھاپ اڑاتی ہو
چائے انڈیلی اور پیالیاں ان کی طرف بڑھائیں۔ دونوں نے پیالیاں لے لیں۔

"کچھ کھاؤ گے؟" چائے والے نے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"باقر خانی ہے، بسکٹ ہیں، پاپڑی ہے۔" چائے والے نے پلاسٹک کے تھیلے ک
طرف اشارہ کیا۔

"چائے کتنے کی ہے؟" اصغر نے تفتیش شروع کی۔ اسے یاد آیا کہ رات پولیس
والے نے اسے دس روپے دیے تھے۔

"دو روپے کی ہے۔"

اصغر حساب لگانے لگا۔ چائے کے بعد چھ روپے بچتے تھے "چھ روپے میں ج
آئے، دے دو۔" اس نے دس کا نوٹ نکال کر چائے والے کی طرف بڑھا دیا۔

چائے والے نے آٹھ باقر خانیاں اور بسکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

"کھاؤ یار۔" اصغر نے اختر سے کہا۔

"تو کھا۔ میں صرف چائے پیوں گا۔"

"ناشتے میں تو ضد نہ کر، ناشتے میں کوئی گوشت نہیں کھاتا۔"
اصغر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تو کھاؤں گا۔ گوشت ہی کھاؤں گا۔"

"تو چائے کیوں پی رہا ہے۔" اصغر نے جل کر کہا۔

"پینے کی بات اور ہے۔ گوشت پینے کی چیز تو نہیں ہے۔"

"میری مان تو بسکٹ اور باقر خانی کھا لے۔ ضد کھانے کے وقت کرلینا۔"

"مجھے نہیں کھانا۔"

"تیری مرضی!"

چائے والا ان کی گفتگو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اسے یہ بات عجیب لگی "تم لوگ کرتے کیا ہو؟" اس نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ ہم یتیم ہیں۔" اصغر نے جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"کل تک یتیم خانے میں رہتے تھے۔ رات ہم وہاں سوئے تھے۔" اصغر نے چورنگی کی طرف اشارہ کیا۔

چائے والے کو اپنے بچوں کا خیال آگیا۔ وہ بھی ایسے ہی گوشت کی ضد کرتے تھے۔ ابھی صبح بھی کررہے تھے۔ اس نے جیسے اپنے بچوں کو سمجھایا تھا، ویسے ہی اختر کو بھی سمجھانے لگا "آج تو جو مل جائے، کھالو۔" اس نے کہا "کل بقرعید ہے۔ پھر تین دن تک گوشت ہی گوشت ملے گا۔"

"میں تو اب بس گوشت ہی کھاؤں گا۔ بقرعید پر تو مل ہی جائے گا۔ مجھے تو آج چاہیے۔"

چائے والا کہنا چاہتا تھا کہ بہت سے لوگوں کو بقرعید کے دن بھی گوشت نصیب نہیں ہوتا لیکن اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے خالی پیالیاں اس کی طرف بڑھائیں تو اس نے ان میں مزید چائے انڈیل دی "میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں۔" اصغر نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" چائے والا بولا "یہ میری طرف سے ہے۔"



باجی کو صبح ہوتے نیند آئی تھی مگر چندو تو اپنے معمول کے مطابق اٹھنے کا عادی

تھا۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی پڑا رہا۔ باجی اور بھائی جان دونوں سو رہے تھے۔ ایسا کبھار ہی ہوتا تھا لیکن اس پر وہ وقت بہت سخت ہوتا تھا اور وہ اسے بھی زیادہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ بھائی جان کو تو وہ نہیں جگاتا تھا۔ البتہ باجی کو جگا دیتا تھا۔

وہ اٹھا اور باجی کو پیار کرنے لگا۔ باجی کسمسائیں اور اٹھ بیٹھیں۔ کبھی ان نیند گہری ہوتی تو چندو پیار کرتے کرتے زبان سے انہیں چاٹنے لگتا تھا۔

باجی نے اٹھ کر چندو کو دیکھا "تو اٹھ گیا رے چندو۔"

چندو نے مخصوص انداز میں دھیمی سی آواز نکالی۔ باجی سمجھ گئیں۔ وہ با مانگ رہا تھا۔ باجی نے اٹھ کر سب سے پہلے اسے نہار منہ بادام پستے اور اخرو کھلائے پھر خود باتھ روم میں گئیں اور ناشتے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئیں۔

دن کے معمولات کا آغاز ہوگیا تھا لیکن باجی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی عا دن نہیں ہے۔

انہوں نے چندو کو نہلایا' ناشتا کرایا۔ خود ناشتا کرنے کے بعد وہ شوہر کے جا کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ اٹھے تو انہوں نے انہیں ناشتا دیا پھر وہ چائے پی ہی رہی تھ کہ پڑوس کی ایک بچی آگئی۔ "باجی ..... آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔"

"آتی ہوں۔" باجی نے کہا۔ چائے کی پیالی دھو کر انہوں نے شوہر کو پکارا "سُ ہیں۔ اماں نے بلایا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ آپ چندو کا خیال رکھیے گا۔"



اس روز اماں پر کیفیت طاری تھی!

جب بھی ایسا ہوتا' پاس پڑوس کی عورتیں ان کے گھر آجاتیں اور اپنے اپنے مسائل لے کر بیٹھ جاتیں۔ اماں سے مشورے لیے جاتے۔ سوال کئے جاتے۔ ایسے میں اماں کی ہر بات درست ثابت ہوتی تھی۔

اس روز اماں نے کیفیت طاری ہوتے ہی سب سے پہلے حکم دیا "شمسہ کو بلا کر لاؤ۔"

باجی آئیں۔ انہوں نے بڑے ادب سے اماں کو سلام کیا۔ اماں نے جواب دینے کے بعد کہا "شمسہ کے سوا سب لوگ چلے جائیں۔"

اس پر وہاں موجود عورتوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ گھر کے تمام لوگ تو کمرے سے چلے گئے۔ پڑوس کی عورتوں میں سے کوئی نہیں اٹھی۔

"میں نے کہا ہے کہ شمسہ کے سوا سب لوگ چلے جائیں۔" اماں نے اپنی بات دہرائی۔

اس کے بعد کسی کی رکنے کی مجال نہیں تھی۔ اس کیفیت میں اماں کی آواز اور ان کا لہجہ ایسا بارعب ہو جاتا تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی تھی کہ نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ خود بھی نظر نہیں اٹھاتی تھیں۔

"یہاں ..... میرے پاس بیٹھ جاؤ شمسہ۔" اماں نے تخت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

باجی اماں کے پاس ..... بہت قریب بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ گھبرا رہی تھیں۔ ایسا تخلیہ اماں نے پہلے کبھی طلب نہیں کیا تھا "جی اماں؟"

"شمسہ .... میں جو کہوں گی' مانو گی؟"
"آپ کی کوئی بات کبھی ٹالی ہے اماں؟"
"لیکن جو میں آج کہنے والی ہوں' پہلے کبھی کہا بھی نہیں۔"
"آپ کہہ کر تو دیکھیں اماں۔"
"دیکھیں گے۔" اماں نے کہا پھر جیسے موضوع بدل دیا "شمسہ' تم قربانی کیوں نہیں کرتیں؟"
"ہم صاحب نصاب نہیں ہیں اماں۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانور تمہارے پاس موجود ہے۔ پھر قربانی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔"
ایک لمحے کو باجی کی رنگت متغیر ہوئی مگر انہوں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ اماں' آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے پاس جانور کہاں ہے۔ جو اماں کہہ رہی تھیں' وہ اسے سمجھ رہی تھیں۔ وہ بولیں "اماں' میں چندو کو جانور کب سمجھتی ہوں۔ وہ تو میرا بیٹا ہے۔"
"میں جانتی ہوں مگر وہ ہے تو جانور ہی نا۔"
باجی خاموش رہیں۔ کوئی اور یہ بات کہتا تو وہ لڑ پڑتیں۔
"یہ اور اچھی بات ہے کہ تم نے اسے بیٹے کی طرح پالا ہے' بیٹے کی طرح چاہتی ہو اور بیٹا ہی سمجھتی ہو مگر ہے تو وہ جانور ہی۔"
"جی اماں۔" باجی نے بمشکل کہا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائیں لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔
"تم میری بات سمجھ رہی ہو نا شمسہ؟"
"جی اماں۔"
"تو کیا خیال ہے؟" اماں نے کہا "چندو کی قربانی کرو گی؟"
باجی نے چند لمحے سوچا پھر اچانک ہی رونے لگیں "اماں ..... مشکل .... بہت مشکل بات ہے۔"
اماں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں کہا "قربانی آسان کب ہوتی ہے۔ وہ تو مشکل ہی ہوتی ہے۔ آسان ہو تو قربانی تو نہ ہوئی۔"

باجی بدستور رو رہی تھیں۔ ان کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ "اماں .... چندو میرے جگر کا ٹکڑا ہے .... میری جان ہے۔"
"تو اللہ کے حضور کوئی گری پڑی چیز پیش کی جاتی ہے۔" اماں کا لہجہ سخت ہوگیا "جس چیز سے محبت نہ ہو' جسے قربان کرکے دل دکھ سے بوجھل نہ ہو' آنکھیں آنسو ضبط کرنے سے نہ جلیں' جسے کھونے کا آپ کو ملال نہ ہو' وہ چیز تو قربانی کے لائق ہی نہیں ہوتی۔ اللہ کو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ یہ تو بندے ہی کی بہتری کے لئے ہے۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں لیکن میرا گھر' میرا دل اجڑ جائے گا۔"
"جنت میں گھر انہی کے آباد ہوتے ہیں جو یہاں اللہ کی راہ میں گھر اجاڑ دیں اور دل وہی آباد ہوتے ہیں شمسہ' جن میں اللہ کی محبت ہو اور جس دل میں ماسوا کی محبت ہو' وہ تو ہوتا ہی اجڑنے کے لئے ہے۔"
باجی پر لرزہ چڑھ گیا۔ اماں نے وہ حقیقت بیان کر دی تھی۔ جو ہر ایک کو یاد ہونی چاہیے لیکن جو یاد کسی کو نہیں رہتی۔
"قربانی کیا ہے شمسہ۔ یہ تو بندگی کا عہد ہے۔ قربانی کریں تو یہ یاد رہے کہ ہمارا سب کچھ اللہ کا دیا ہوا اور اللہ ہی کے لئے ہے۔ ہمارا اپنا کچھ بھی نہیں۔ اپنے اعمال اور آخرت کے سوا۔ نعوذ باللہ' اللہ کو ہماری کسی چیز کی ضرورت نہیں مگر وہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہماری بہتری چاہتا ہے۔ جانتا ہے کہ ہم عہد بندگی بھول جاتے ہیں' بھولتے رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں سال میں ایک بار یہ یاد دلانے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر ہم ایک بار ایسی سچی قربانی کر دیں تو شاید عہد بندگی کبھی نہ بھولیں۔"
باجی روئے جا رہی تھیں "وہ میری جان ہے اماں۔"
"جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی۔" اماں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"
ایک پل میں جیسے باجی کی کایا پلٹ ہوگئی۔ ان کے اندر ایک لہر سی اٹھی اور سب کچھ بہا کر لے گئی۔ انہوں نے ایک عزم سے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے

اور بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔ "اماں .... ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ حق تو ادا ہو ہی نہ سکتا۔ اللہ کی خاطر چندو بھی قربان اور میں بھی۔ اس لیے کہ سب اسی کا دیا ہے۔"

"شاباش شمسہ، اللہ تمہارا گھر آباد رکھے گا۔" اماں نے ان کے سر پر ہاتھ ر ہوئے کہا۔

"میں کل چندو کو قربان کر دوں گی اماں۔"

"قربانی کے آداب بھی معلوم ہیں شمسہ؟"

"آپ بتائیے اماں۔"

"کلیجی گھر والوں کے لیے ہوتی ہے۔ گوشت کے تین حصے ہوتے ہیں۔ اک اپنے .... گھر کے لیے۔ دوسرا رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لیے اور ایک غریبوں ا مسکینوں کے لئے۔ یہ آپ کا حق ہے کہ اپنا حصہ بھی دوسروں کو دے دیں۔"

"اماں .... ہم چندو کا گوشت کیسے کھاسکتے ہیں۔" باجی پر پھر رقت طاری ہو گئی۔ یہ خیال ہی ان کے لئے سوہان روح تھا کہ ان کا چہیتا چندو ذبح کیا جائے گا ا اس کے حصے بخرے ہوں گے۔ کجا یہ کہ وہ اسے کھائیں بھی ....

"دیکھو شمسہ، دکھ تو فطری ہے۔" اماں نے انہیں سمجھایا۔ "اس کے بدلے اللہ سکون قلب عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ دکھ کے ساتھ کم ظرفی ہو بات گستاخی تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمیں تو یہ تسلیم کرنا ہے کہ اللہ کی رضا ہر چیز پر مقد ہے۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑا بہت گوشت تو تمہیں کھانا ہوگا۔"

"اتنا حوصلہ کہاں سے لاؤں گی اماں؟"

"شمسہ، اگر تم کبھی میرے ہاں مٹھائی لے کر آؤ تو میں تواضع کرتے ہو مٹھائی تمہارے سامنے رکھوں گی نا۔ تمہیں وہ کھانی ہوگی۔ اگر اکراہ کرو گی تو میں سوچوں گی ناکہ یا تو شمسہ شرما حضوری میں یہ مٹھائی لائی ہیں یا پھر وہ مٹھائی لائی ہیں خود انہیں پسند نہیں اور دونوں باتیں اچھی نہیں۔ جب کہ قربانی تو ہم اللہ کے حضو پیش کر رہے ہیں۔ اب وہ حکم دے کہ تم بھی کھاؤ تو انکار کا .... اکراہ کا مطلب سمجھ ہو؟"

باجی پر پھر لرزہ چڑھ گیا "اماں .... میرے لیے حوصلے کی دعا بھی تو کریں۔"

"جاؤ شمسہ، اللہ بڑا کارساز ہے۔"

باجی اماں کے کمرے سے نکلیں تو بید مجنوں کی طرح لرز رہی تھیں۔



اس صبح ریاض صاحب بہت دیر سے سو کر اٹھے۔ بہت دنوں کے بعد ایسی پرسکون نیند آئی تھی۔ اٹھ کر انہوں نے ناشتا کیا اور کمال یہ ہوا کہ انہیں پھر سے نیند آنے لگی۔ وہ نہ سوتے لیکن سلمیٰ بیگم نے اصرار کرکے انہیں مزید سونے پر مجبور کر دیا۔

دوسری بار سلمیٰ بیگم نے ہی انہیں جگایا "اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔"

ایک عرصے کے بعد وہ دوپہر کے وقت بچوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ چھوٹا فیاض اترا گیا اور دوبارہ سے گوشت کی ضد کرنے لگا۔

"دیکھو، میں نے کتنے مزے کا لوبیا پکایا ہے۔" سلمیٰ بیگم نے اسے سمجھایا "یہ گوشت سے زیادہ مزے دار ہے۔"

"لیکن گوشت تو نہیں ہے۔" فیاض نے دلیل دی۔

"ابو اتنے دن ہوگئے، ہم نے گوشت نہیں کھایا۔" اشعر نے شکایت کی۔

"بیٹے، کل جی بھر کے کھا لینا۔"

"ابو.... آج بہت جی چاہ رہا ہے گوشت کو۔" اس بار میمونہ بولی۔

سلمیٰ بیگم تڑپ گئیں۔ بیٹی نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی "ایک دن صبر کرلو مونا۔" انہوں نے محبت سے کہا۔

"ٹھیک ہے امی۔"

بیٹی کی یہ تسلیم کی ادا سلمیٰ بیگم کو اور زخمی کر گئی۔ ان سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ حالاں کہ لوبیا بہت اچھا پکا تھا۔ بچوں نے گوشت کی ضد کے باوجود ڈٹ کر کھانا کھایا۔ ریاض احمد نے بھی طبیعت سے کھانا کھایا۔ پچھلے عرصے میں

انہوں نے دوپہر کا کھانا ایک دن بھی نہیں کھایا تھا۔

کھانے کے بعد بچے ریاض احمد کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ اس روز ریاض احمد بھی مطمئن اور خوش تھے۔ میمونہ اور اشعر کے اسکول کی کاپیاں دیکھتے رہے۔ انہیں خوشی ہوئی کہ بچوں کی پڑھائی بالکل متاثر نہیں ہوئی ہے ورنہ وہ تو سمجھے تھے کہ اس عرصہ بحران میں سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔

"ابو' میں اسکول کب جاؤں گا؟" فیاض نے پوچھا۔

"انشاء اللہ اس بار تمہیں بھی اسکول میں داخل کرا دیں گے۔"

فیاض خوش ہو گیا "ابو' اس بار آپ بکرا نہیں لائے۔" اس نے کہا۔

"عید کے تیسرے دن لائیں گے بیٹے اور قربانی کریں گے۔"

یہ سن کر تو تینوں بچے خوش ہو گئے "سچ ابو' پھر ہم خوب گوشت کھائیں گے۔" اشعر بولا۔

"گوشت تو تم انشاء اللہ کل بھی خوب کھاؤ گے۔" ریاض احمد نے کہا۔

اس دوران ریاض احمد کو ہر پل یہ احساس رہا تھا کہ سلمیٰ بیگم کھانے کے وقت سے اداس اور چپ چپ ہو گئی ہیں۔ بچے ان کے پاس گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا بیٹھے۔ پھر اشعر اور فیاض آنگن میں کھیلنے چلے گئے اور میمونہ کمرے میں جاکر سو گئی۔

ریاض احمد سلمیٰ بیگم کے پاس جا بیٹھے "کیا بات ہے؟ آپ کو کیا ہوا؟" انہوں نے بیوی سے پوچھا۔

"ہماری بیٹی بہت صابر ہے۔" سلمیٰ بیگم نے آہ بھر کر کہا "لیکن آج اس کا صبر جواب دے گیا ہے۔"

"ہاں' اس بات سے مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی۔"

"ایک بات کہوں۔ میرے پاس پچاس روپے ہیں۔ آپ جاکر گوشت لے آئیں تو ہم رات کے کھانے پر بچوں کو سرپرائز دیں گے۔"

ریاض احمد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ "اب اس وقت گوشت ملنا مشکل ہے۔ خیر' آپ پیسے دیں' میں دیکھتا ہوں۔"

سلمیٰ بیگم نے پیسے لاکر انہیں دیے۔ وہ گھر سے نکل آئے۔



دونوں لڑکوں کو پھرتے پھرتے دوپہر ہو گئی۔ اصغر ایک بار پھر بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ اختر کا تو حال ہی ابتر تھا لیکن اب وہ بھوک کے متعلق بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلتے چلتے دوبارہ لالو کھیت پہنچ گئے تھے۔

"دیکھو اختر بھائی' اب جو بھی ملے' کھا لینا۔ گوشت کل مل جائے گا۔" اصغر نے اختر کو سمجھایا۔

"تو میری فکر نہ کر' مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔" اختر نے بھنا کر کہا۔

بازاروں میں اس روز بھی بہت رش تھا۔ ظاہر ہے۔ اگلے روز عید جو تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے رہے۔ سامنے انہیں ایک ہوٹل نظر آیا۔ انہوں نے سڑک پار کی اور ہوٹل کی طرف چل دیے۔

ہوٹل میں بھی رش تھا۔ وقت بھی کھانے کا تھا۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ دونوں للچائی ہوئی نظروں سے کھانے والوں کو دیکھتے رہے۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دونوں کا بھوک سے برا حال تھا لیکن انہیں کسی سے سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ دیر تک کھڑے رہے۔ ہوٹل سے دو جوان آدمی کھانا کھا کر نکلے۔ ان میں سے ایک کی نظر ان پر پڑ گئی۔ بھوکے کے سامنے کھانا ہو' مگر پہنچ سے دور تو اس کا حال کسی سے چھپا نہیں رہتا۔ اس جوان آدمی نے بھی سمجھ لیا کہ وہ بھوکے ہیں "کھانا کھاؤ گے؟" اس نے ان سے پوچھا۔

اصغر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اختر کو یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔

"ٹھہرو' میں ابھی باہر والے سے بات کرتا ہوں۔ وہ تمہیں کھانا لا دے گا۔ پیسے میں دے دوں گا۔"

جوان آدمی ہوٹل کی طرف جانے کے لئے پلٹ ہی رہا تھا کہ اختر نے کہا "میں تو گوشت کھاؤں گا۔"

جوان آدمی بے حد غصہ ور تھا۔ اس نے کہا "کیا کہا بھئی تو نے؟"

اختر نے اپنی بات دہرا دی۔

"ابے میں تجھے کھانا کھلا رہا ہوں۔ جو میں کھلاؤں گا' کھانا پڑے گا۔"

"میں تو گوشت ہی کھاؤں گا۔"

"بھکاری ہو کر اتنے نخرے ...."

"ہم بھکاری نہیں ہیں ...." اختر کو لفظ بھکاری گالی کی طرح لگا۔

"بھکاری نہیں تو اور کیا ہے بے۔" جوان آدمی کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہم نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں۔ آپ نے خود ہی پوچھا تھا کھانے کو۔"

"غلطی ہوئی مجھ سے۔ اب ہٹ جا سامنے سے۔ نہیں تو ایک دوں گا ...."

"یہ زمین تو اللہ کی ہے ...."

جوان آدمی نے پوری قوت سے اختر کے رخسار پر تھپڑ رسید کیا۔ اس کا ساتھی اسے کھینچتا ہوا لے گیا ورنہ شاید وہ اختر کو اور مارتا۔

"تکلیف سے زیادہ ذلت کا احساس تھا کہ اختر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

"ہم نے کسی سے کچھ مانگا تو نہیں تھا۔" وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا "ہم بھیک مانگنے والے تو نہیں ہیں۔"

"تو اور تیری ضد مجھے بھی بھوکا مار دے گی۔" اصغر نے غصے سے کہا۔ وہ بھوک سے پاگل ہو رہا تھا۔

شاہ جی کے ہاتھوں بری طرح پٹ کر اف نہ کرنے والا باہر ایک اجنبی کے تھپڑ پر بلک کر رو رہا تھا۔ ایسے میں اپنے ساتھی اور دوست کا یہ جملہ اسے ہنٹر کی طرح لگا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اصغر کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شکایت' ملامت اور جانے کیا کیا تھا۔ دکھ اس بات کا بھی تھا کہ اصغر نے پہلے کبھی اس کی زیادتی پر چوں بھی نہیں کی تھی۔ اس نے اصغر کو دیکھا ضرور لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔

اصغر کو فوراً ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا۔ کچھ تو اسے اختر کی نگاہوں نے... اور اس کی خاموشی نے مارا۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے رات پیٹ بھر کر کھانا بھی کھایا تھا اور صبح کو ناشتا بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے ایسی پاگل کر دینے والی

بھوک لگ رہی ہے تو اختر کا کیا حال ہوگا' جس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور صبح کا ناشتا بھی نہیں کیا۔ کوٹھری میں چائے اور پاپے کھائے ہوئے ایک دن اور ایک رات ہو چکی تھی۔

وہ اختر سے محبت کرتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا۔

دونوں وہیں ہوٹل کے سامنے بیٹھے تھے۔ تھپڑ والے واقعے کے بعد وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا۔ ایک تماشائی ان سب کو تفصیل بتا رہا تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ان میں سے کسی کے پاس ہمدردی کے دو بول نہیں تھے۔ کوئی طنز کر رہا تھا۔ کوئی ملامت ' ہاں میاں' یہ آج کل کے بھکاری ہیں۔ بھیک دینے والے کو بھی ذلیل کر دیں۔ پیٹ بھرے ہیں میاں۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ بھلائی کرو تو برائی ملتی ہے۔ اچھا کیا جو مارا بھائی۔

یہ تبصرے روح کو اور تڑپا رہے تھے۔ اختر کو لگ رہا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی ٹھوس چیز ہے جو نرم ہوتے ہوتے پگھلنے کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کا سینہ آنسوؤں سے بھر گیا ہے اور آنسوؤں کو روکنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر اور گھٹ گھٹ کر' سر جھکائے روتا رہا۔

تبصرے جاری رہے۔ پھر ایک خوف ناک جملہ سامنے آیا "یہ چھوٹا اچھا ہے لیکن اس کے ساتھ رہنے کی سزا بھگت رہا ہے۔ سچ تو کہا ہے۔ اس کے ساتھ رہے گا تو بھوکا ہی مرے گا۔"

اصغر نے سر اٹھا کر کہنے والے کو دیکھنا چاہا مگر وہاں اتنے لوگ تھے۔ کون جانے' کس نے یہ بات کہی تھی۔ اصغر ڈرپوک اور صلح جو تھا مگر اس وقت اس کے اندر وحشت امنڈنے لگی۔ کاش وہ ان سب کا کچھ بگاڑ سکتا۔ اس ایک جملے نے اسے اس کی نظروں میں گرا دیا تھا۔ اختر کی نظروں میں تو وہ پہلے ہی گر چکا تھا اور اختر وہ تھا' جو یتیم خانے میں اسے ہر مصیبت سے بچاتا تھا۔ کوئی شریر لڑکا اس کے درپے ہوتا تو ہمیشہ اختر ہی بیچ میں آتا اور آج اس کی وجہ سے اختر کے ساتھ یہ ہو رہا تھا۔

اصغر کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس نے اختر کا ہاتھ تھاما اور بولا "چل یہاں سے۔"

اختر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اختر کمزور تھا اور اصغر طاقت ور

"اب ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے' کچھ نہیں مانگیں گے۔ بس اللہ سے مانگیں گے۔ وہ سب کچھ دے سکتا ہے۔ مولوی صاحب یہی بتاتے تھے نا۔" اصغر نے کہا۔

اختر خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"تیری بھوک تو مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ تو صبر کرسکتا ہے۔ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔" اصغر بولے جا رہا تھا۔

آگے بھیڑ بہت تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے رہے مگر ایک جگہ خریداروں کے ریلے میں ان کے ہاتھ چھوٹ گئے۔ قدم روکنا اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ اتنے ہجوم میں آدمی خود کہاں چلتا ہے۔ دوسرے اسے چلاتے ہیں۔ پھر دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ریت تھی۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں تھا کہ وہ مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں۔ ہر بڑھتا ہوا قدم انہیں ایک دوسرے سے دور کر رہا ہے۔

اختر کو سنبھلنے کا موقع ملا تو وہ لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ کے سامنے تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اصغر کہیں نہیں تھا۔ وہ تڑپ کر اسے پکارتا رہا۔ بھوک اور پھر ذہنی اذیت اور رونے کے نتیجے میں وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ جاکر مارکیٹ کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھ گیا۔

اس کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ وہ دو تھے تو طاقت تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ اب وہ اکیلا کیا کرے گا۔ پھر اسے اصغر کی بات یاد آئی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا۔ وہ اور اس کی ضد اصغر کو بھی بھوکا مروا دیتی۔ اچھا ہی ہوا' وہ الگ ہوگئے۔ اب اصغر بھوکا تو نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی جارحیت ختم ہوگئی۔ اس پر سپردگی طاری ہونے لگی۔ اچھا ہے' میں مرہی جاؤں۔

دوسری طرف اصغر اس سے زیادہ پریشان تھا۔ وہ دس نمبر پہنچ گیا تھا اور بے تابانہ اختر کو تلاش کرتا پھرا تھا لیکن اختر ہوتا تو ملتا۔ کوئی مشکل آپڑے تو آدمی بے حد خود غرض ہو جاتا ہے۔ وہ اختر کی فکر کر رہا تھا تو وہ بھی اپنے حوالے سے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کا کیا بنے گا۔ اختر سب کچھ سوچ سکتا تھا' سب کچھ کرسکتا تھا۔ اب وہ کہاں سوئے گا.... کیا کرے گا؟ وہ روتا اور اختر کو پکارتا رہا....

○

باجی پریشان تھیں کہ شوہر سے کس طرح بات کریں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ بہت سخت مرحلہ ہے۔ وہ اس کے لئے خود کو تیار کر رہی تھیں۔ اس مرحلے کے لئے ان کا مضبوط ہونا ضروری تھا۔ لیکن وہ اس معاملے میں الٹی کمزور تھیں۔ انہوں نے اماں کی بات مان لی تھی۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ چندو دنبہ ہے' جسے قربان کیا جاسکتا ہے مگر اندر کی آواز کہتی تھی کہ چندو دنبہ ہے لیکن ان کا بیٹا ہے اور اسے قربان نہیں کیا جاسکتا۔

وہ بیٹھی یہی کچھ سوچے جا رہی تھیں کہ چندو آگیا اور ان کی ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں لیکن وہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں "چندو...... تو میرا بیٹا ہے نا؟"

چندو اور شدت سے ان کی ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا "دیکھو بیٹا' اللہ کی خوشی کے لئے تو سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ ہے نا؟"

چندو نے سر اٹھایا اور انہیں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معصومیت تھی۔

"اس پر تو میں خود کو بھی قربان کرسکتی ہوں۔" باجی نے .... خود کلامی کے انداز میں کہا "اور چندو' میں نے تجھ سے بہت محبت کی ہے نا .... ماں جیسی ؟"

چندو نے اپنی مخصوص اور مختصر سی آواز نکالی' جیسے کہہ رہا ہو .... ہاں ماں ....

"تو بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟"

چندو نے پھر وہی آواز نکالی۔

"بس تو بیٹا' ہنسی خوشی قربان ہو جانا۔" باجی کی آواز رندھنے لگی۔

چندو ان کے پیروں میں یوں لیٹ گیا' جیسے قربان ہو رہا ہو۔ اس انداز میں بس گلے پر چھری پھیرنے کی کسر تھی۔

باجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تو مجھے برا اور ظالم تو نہیں سمجھے گا؟"

چندو نے اور باریک اور مختصر آواز نکالی۔

"بس اب جا۔ کھیل جاکر۔"

چندو چلا گیا۔ باجی روتی رہیں مگر یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کے اندر مضبوطی آگئی ہے۔ چندو انہیں حوصلہ دے کر گیا تھا لیکن سخت مرحلہ ابھی باقی تھا۔ اپنے شوہر کو وہ کیسے قائل کریں؟ ان سے کیسے بات کریں؟

یہ مشکل بھائی جان نے آسان کر دی۔ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئے "کیا بات ہے شمسہ؟ کچھ پریشان ہیں آپ؟"

"نہیں تو۔" باجی نے کہا "میں نے ایک مشکل فیصلہ کیا ہے۔ کل ہم چندو کی قربانی کریں گے۔"

پہلے تو بھائی جان کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا پھر ان کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا "کس خبیث نے کہا ہے۔ مجھے نام بتاؤ۔ میں خون پی جاؤں گا اس کا۔"

"میں حاضر ہوں۔ پی جائیے خون۔"

بھائی جان سناٹے میں آگئے "یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے شمسہ بیگم؟" انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔"

"مگر کیوں۔ بیٹا تو وہ ہم دونوں کا ہے۔ میرا بھی اور آپ کا بھی۔"

باجی نے اس لمحے ایک اور فیصلہ کیا۔ انہیں جارحانہ طرز عمل اختیار کرنا تھا ورنہ معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ بے شک' شوہر کا دل دکھتا لیکن بعد میں وہ تلافی کر سکتی تھیں ..... انہیں سمجھا سکتی تھیں۔ "بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہیں آپ۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور آپ کی یادداشت بھی شاید کمزوری ہوگئی ہے۔ اس کے تو موت سے ایسا گھبراتے تھے آپ کہ ساتھ سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب کچھ میں کرتی رہی۔ اسے لپٹا کر سلاتی رہی۔ صبح اٹھتی تھی تو اس کے پیشاب میں نہائی ہوئی ہوتی

تھی۔ بو میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ میرے سوا کون یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے زیادہ دکھ ہوگا اس قربانی کا۔"

بھائی جان کا چہرہ فق ہوگیا "باپ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔" انہوں نے مدافعانہ لہجے میں کہا "اسی لیے ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔"

"تو پھر ماں سے بڑھ کر بات بھی نہ کریں۔"

"باپ تو کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ نہیں مانتے تو کل میں چندو کی جگہ خود کو قربان کر دوں گی۔"

بھائی جان تھرا کر رہ گئے۔ سب کچھ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا "ٹھیک ہے شمسہ بیگم! آپ جیت گئیں۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

باجی کھل اٹھیں "بس تو جاکر چندو کے لئے بادام' پستے اور اخروٹ لے آئیں ..... آج اسے جی بھر کے کھلائیں گے۔"

بھائی جان میں دم مارنے کا یارا بھی نہیں تھا!



اختر کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیا بنے گا۔ وہ مایوس تھا۔ مایوس اور امید سے محروم۔ اصغر اس سے بچھڑ گیا تھا۔ بھوک اس کے لئے ایک بپھری ہوئی موج بن گئی تھی' جو کسی بھی لمحے اسے نگل سکتی تھی۔ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک اس کے وجود میں جیسے روشنی سی ہوگئی۔ کرامت بابا کی آواز اس کی سماعت میں گونجنے لگی "صرف اللہ ہی ضرورت مندوں کے کام آتا ہے۔ جس کی کوئی مدد نہیں کرتا' اس کی مدد اللہ کرتا ہے۔ وہ ایسا رزق دینے والا ہے کہ پتھر میں رہنے والے کیڑے کو پتھر میں ہی رزق پہنچاتا ہے۔ وہ کسی کو بھوکا نہیں رہنے دیتا۔ آدمی کو اس کے آگے ہاتھ اور جھولی پھیلانی چاہیے۔ وہی دینے والا ہے ....."

اختر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین ہوگیا کہ نہ وہ بھوکا رہے گا اور نہ ہی مرے گا۔ اس کے جسم میں طاقت سی آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھوپ کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ سورج نے مغرب کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔

اختر کے قدم خود بخود اٹھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی اس کے اندر بیٹھا اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ایک طاقت تھی جو اس کی ٹانگوں میں سما گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن یہ یقین تھا کہ وہ بہتری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ا اس کی مدد کر رہا ہے۔

وہ چلتا رہا .... چلتا چلا گیا۔ اسے احساس تھا کہ اندھیرا ہو گیا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک ٹانگوں میں طاقت ہے' وہ چلتا رہے گا۔

اسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں جا پہنچا ہے۔ اس نے تو بس یہ دیکھا کہ ایک بڑا بس اسٹاپ ہے' جہاں بسیں ترتیب سے قطار لگائے کھڑی ہیں۔ ایک طرف ایک ٹھیلے والا کھیر بیچ رہا ہے۔ ایک جانب بن کباب بک رہے ہیں۔ وہ سیدھی سڑک پر چلتا رہا۔ وہ بازار تھا .... اور وہاں ہجوم بہت تھا۔

اچانک اس پر کمزوری کا ایسا حملہ ہوا کہ ٹانگیں جیسے پانی ہو گئیں۔ وہ گرتا چلا گیا۔ اس کے حواس بھی جواب دے رہے تھے۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔



ریاض احمد کو مایوسی ہوئی۔ گوشت کی کوئی دکان کھلی نہیں تھی۔ گوشت ختم ہو چکا تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ گوشت ملنا اب ناممکن ہے۔ جس کے ہاں قربانی نہیں ہوتی' وہ احتیاطاً" عید سے ایک دن پہلے گوشت خریدتے ہیں اور زیادہ خریدتے ہیں تاکہ گوشت آنے سے پہلے ہی گھر میں مہمانوں کی تواضع کے لئے کچھ پکایا جا سکے۔ اس لیے عید اور بقرعید سے ایک دن پہلے دودھ اور گوشت عنقا ہو جاتا ہے۔

وہ مایوس ہوئے لیکن بچوں کا خیال آیا تو انہوں نے سوچا کہ آخری حد تک کوشش کر لی جائے۔ وہ بس میں بیٹھے اور لیاقت آباد مارکیٹ چلے گئے۔ وہاں صرف دو دکانیں ایسی تھیں' جن پر گوشت موجود تھا' اور گاہک اتنے تھے کہ گوشت والا پاگل ہوا جا رہا تھا۔

وہ بھی امید باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں صرف آوازوں سے کام چل رہا تھا۔

دو کلو گوشت پہلوان بغیر ہڈی کا۔ ہاں بھئی' چار کلو میرا ہے۔ ڈیڑھ کلو اس ران میں سے نکال دے یار۔ گوشت والا بہت تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔

ریاض احمد بھی گوشت کے اس اسٹاک ایکسچینج میں اپنی آواز لے کر شامل ہو گئے۔ بھائی ..... آدھا کلو گوشت دے دیجئے ان کی آواز اور لہجہ سب سے جدا تھا مگر جہاں دو کلو اور چار کلو کے مطالبے ہوں' وہاں آدھا کلو کی آواز کون سنتا ہے۔ ریاض احمد کو خود بھی شرمندگی ہونے لگی۔ بچوں کی محبت نہ ہوتی تو وہ کان دبا کر وہاں سے نکل لیتے لیکن بچوں کی خاطر وہ ..... بھائی' ایک آدھا کلو گوشت مجھے دے دیجئے کی صدائیں لگاتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گوشت ختم ہو گیا۔

وہ دوسری دکان کی طرف لپکے لیکن وہاں گوشت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

انہیں مایوسی ہوئی لیکن انہوں نے خود کو دلاسا دیا کہ اگلے روز تو بقرعید ہے ہی۔ گوشت ہی گوشت ہوگا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ بچوں کو سرپرائز دینے کی نیت کی گئی تھی۔ انہیں بتایا نہیں گیا تھا ورنہ انہیں مایوسی ہوتی۔

وہ بس میں بیٹھے اور پی آئی بی کالونی پہنچے۔ مغرب ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ بس اسٹاپ سے گھر کی طرف چل دیے۔ ہجوم بہت زیادہ تھا۔ بازار میں شاپنگ، زوروں پر تھی۔

اچانک دو قدم آگے انہوں نے ایک بچے کو یوں ڈھیر ہوتے دیکھا جیسے اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہوں۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے اسے سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ انہیں فوراً" ہی اندازہ ہو گیا کہ بچہ بے ہوش ہو گیا ہے۔

اتنے میں لوگ جمع ہونے لگے "کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ چلتے چلتے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔" ریاض احمد نے بتایا "ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ریاض احمد نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں وہ سات سال کا بچہ لگتا تھا لیکن چہرے سے زیادہ عمر لگتی تھی۔ البتہ وزن سات سال کے بچے جتنا بھی نہیں تھا۔

سامنے ہی ڈاکٹر اسد کا مطب تھا۔ ریاض احمد اسے وہاں لے گئے۔ وہاں خاصا رش تھا۔ ان کے کہنے پر ڈاکٹر نے ایمرجنسی سمجھ کر بچے کا معائنہ کیا۔ اس نے بچے کا

پیٹ دیکھا "یہ بیمار نہیں ہے۔"

"جی؟" ریاض احمد کو حیرت ہوئی۔

ڈاکٹر نے قمیض اٹھا کر بچے کا پیٹ انہیں دکھایا "یہ نجانے کب سے بھوکا ہے کمزوری سے بے ہوش ہوگیا ہے۔"

"اوہ!"

"اسے کھلائیں پلائیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے ...... پرخیال لہجے میں "مگر احتیاط کیجئے گا۔ ایک دم سے کھانا کھلایا تو طبیعت بگڑ بھی سکتی ہے۔ بہتر ہے پہلے دودھ میں گلوکوز یا کمپلان ملا کر دیجئے۔"

"بہت بہتر ڈاکٹر صاحب۔ کیا پیش کروں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے کہ کچھ لوں۔ ویسے یہ بچہ آپ کا تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ سڑک پر چلتے چلتے گر گیا تھا۔"

"بس میری ہدایت پر عمل کیجئے۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔"

وہ اسے گود میں اٹھائے مطب سے نکلے ہی تھے کہ بچے کو ہوش آگیا۔ خود کو ریاض احمد کی گود میں پا کر وہ حیران ہوا اور کسمسانے لگا۔ "اتار دوں تمہیں؟ چلو گے؟" ریاض احمد نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

بچے نے نقاہت سے سر ہلا دیا۔

ریاض احمد نے اسے گود سے اتار دیا "بیٹے ..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"اختر!"

"کہاں رہتے ہو؟"

اختر کی آنکھوں میں آنسو آگئے "یتیم خانے میں رہتا تھا جی۔ اب بے گھر ہوں۔"

"میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

اختر نے ممنونیت سے انہیں دیکھا اور سر ہلایا۔ اللہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ کرامت بابا کی بات ٹھیک تھی۔

اب ریاض احمد کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ ان کے پاس پچاس روپے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ سیخ کباب اور بوٹیاں گھر لے جائیں گے تاکہ بچے خوش ہو جائیں مگر اب اصولاً انہیں دودھ اور گلوکوز کا ڈبا لینا تھا۔ کمپلان کی تو گنجائش نہیں تھی۔ ایک لمحے کو انہوں نے سوچا کہ بچے کو کھانا بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ کباب اور بوٹیاں بھی لے لی جائیں پھر انہیں ڈاکٹر کی تنبیہہ یاد آئی۔ ان کے قدم دودھ کی دکان کی طرف اٹھ گئے۔ آگے جنرل اسٹور سے انہوں نے گلوکوز کا ڈبا خرید لیا۔

وہ گھر پہنچے تو سلمیٰ بیگم ان کے ساتھ اختر کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ریاض احمد نے انہیں دودھ میں گلوکوز ملا کر لانے کی ہدایت کی۔ بچے کے پیٹ میں کچھ پڑنے سے پہلے وہ اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے تھے۔

اختر نے دودھ بے حد شکر گزاری سے پیا۔ اس دوران ریاض احمد نے بیوی کو اس کے بارے میں بتایا۔



باجی نے حساب سے مہینے بھر کے بادام، پستے اور اخروٹ کی گری چندو کے سامنے رکھ دی۔ چندو نے بڑی رغبت سے منہ مارا پھر منہ چلاتے ہوئے اس نے ہلکی سی "میں" کی جیسے اس عنایت خسروانہ کا سبب جاننا چاہتا ہو۔

باجی نے اسے لپٹا لیا "جی بھر کے کھاؤ چندو بیٹے۔ آج ماں تیری تواضع کر سکتی ہے۔ یہ سب تیرا ہی ہے۔ مہینے بھر کا ایک دن میں کھالے۔"

لیکن چندو زیادہ کھانے پر آمادہ نہیں تھا۔ شاید اسے پچھلی سزا یاد آرہی تھی۔

باجی رونے لگیں "کھالے بیٹے! اب میں تجھے کبھی نہیں ماروں گی۔"

چندو انہیں پیار کرنے لگا پھر ان کے کہنے پر وہ اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے پر تیار ہوگیا۔

"چندو .... کل تو مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی میری جان؟" باجی کے لئے آنسو روکنا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

چندو نے کھاتے کھاتے سر اٹھا کر باجی کی آنکھوں میں دیکھا۔ باجی کو اس کی

آنکھوں میں اداسی نظر آئی۔ اس لمحے باجی کو یقین ہوگیا کہ سمجھ دار چندو یہ بھی سمجھ گیا ہے کہ اسے قربان کیا جانے والا ہے اور یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

"ہاں چندو ..... میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں اللہ سے جنت مانگوں گی اور اس کے کرم سے جنت مل گئی تو تجھے بھی مانگوں گی۔"

اس بار چندو نے ڈرائی فروٹ سے منہ پھیرلیا۔ وہ باجی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کی نمی بے حد واضح تھی۔ پھر اس نے آنکھیں موندلیں۔

بھائی جان کمرے سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ ان کا دل بوجھل تھا۔ یہ سچ ہے کہ بیوی کے مقابلے میں ان کی محبت کمتر تھی مگر پھر بھی انہوں نے چندو کو بیٹے ہی کی طرح چاہا تھا۔ اب بیوی نے اسے قربانی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ کس دل سے کیا ہے' تو وہ رکاوٹ بننا نہیں چاہتے تھے۔ حالاں کہ ایک بار ان کے جی میں آئی تھی کہ چندو کو لے کر کہیں دور بھاگ جائیں۔

بھائی جان دکھی تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ یہ دکھ روگ نہ بن جائے۔ مردوں کا دکھ سے لڑنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ بھائی جان کا دفاع یہ تھا کہ چندو کی قربانی کے خیال کو تسلیم کرنے کے بعد وہ اس سے دور ہوگئے تھے۔ انہوں نے بے تعلقی اختیار کرلی تھی۔ باجی جیسے چندو کو لپٹائے بیٹھی تھیں' یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو چندو کے جانے سے پہلے ہی اسے بھول جانے کی کوششوں میں معروف ہوگئے تھے۔

وہ کمرے کے دروازے سے ہٹ آئے اور کرسی پر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالاں کہ ان سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد باجی کمرے میں آئیں "چندو کو سب پتا ہے۔ وہ بادام پستے بھی نہیں کھا رہا تھا۔ اس نے سر ڈال دیا ہے۔"

"ہاں شمسہ بیگم' جانوروں کو سب معلوم ہوتا ہے۔ اسے تو رات بھر قصائی اور چھری نظر آئیں گے۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا لیکن چندو کو جانور کہتے ہوئے ان کے دل پر گھونسا سا لگا تھا مگر وہ اس کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

باجی انہیں شکایتی نظروں سے دیکھتی رہیں لیکن ان کی نظریں کتاب سے نہیں ہٹیں۔



سلمیٰ بیگم تو اختر سے پوچھ گچھ کرنا چاہتی تھیں لیکن ریاض احمد نے انہیں منع کردیا۔ بچے کا پیٹ بھرنے سے پہلے وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس دوران بچے اختر سے مانوس ہونے کے مرحلے میں داخل ہوگئے تھے۔ اشعر تو اسے اپنے برابر کا ہی سمجھ رہا تھا۔ ویسے قد کاٹھ میں وہ تھا بھی اختر جتنا۔ اختر سائیکل کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "چلیں .... سائیکل سے کھیلیں؟" اشعر نے اختر کو دعوت دی۔

اختر کے لئے تو وہ بڑی نعمت تھی۔ وہ فوراً" رضا مند ہوگیا "پہلی باری میری۔" فیاض نے کہا۔ چھوٹا ہونے کے ناتے یہ اس کا حق تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے بعد اختر سائیکل چلائے گا۔"

اختر نے پہلی بار سائیکل چلائی۔ اسے ایسا لطف آیا کہ سائیکل چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا مگر کچھ دیر بعد سلمیٰ بیگم نے آواز لگائی "میز پر آجاؤ۔ کھانا لگ گیا ہے۔"

بچوں نے ہاتھ دھوئے تو اختر نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کئے۔ کرسی پر بیٹھنا بھی اس کے لئے نئی بات تھی مگر ریاض احمد کے بچوں سے اسے حوصلہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

وہاں ہر چیز اسے نرالی لگی۔ سالن دو بڑی قابوں میں رکھا تھا۔ پتلی نفیس چپاتیاں دستر خوان میں لپٹی تھیں۔ تو ایسا ہوتا ہے گھر؟ اس نے سوچا' اور دل ہی دل میں اللہ سے شکوہ کیا "مجھے کیوں ایسا گھر نہیں ملا؟"

"لو بیٹے' سالن نکالو۔" سلمیٰ بیگم نے اس کی طرف قاب بڑھائی۔ اس میں سالن نکالنے والا چمچہ بھی تھا۔

اختر نے سالن کو دیکھا۔ وہ دال کی طرح کی چاکلیٹی رنگ کی کوئی چیز تھی۔ گوشت بہرحال نہیں تھا۔ اسے اپنا عہد یاد آگیا "میں تو گوشت کھاؤں گا۔" اس نے کہا۔

فیاض نے فوراً تائید کی ''میں بھی ....''

سلمیٰ بیگم اور ریاض احمد نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب کیا کریں؟ یہ ا
والا بچہ بھی ...... بچے اب اختر کو اور زیادہ اپنائیت سے دیکھ رہے تھے۔

''اختر..... کھا کر تو دیکھو۔ بہت مزے کا سالن ہے۔'' میمونہ بولی۔ سلمیٰ
نگاہوں سے فخر جھلکنے لگا۔

''ہاں۔ یہ لوبیا ہے۔'' اشعر نے کہا ''اس میں پروٹین گوشت سے بھی زیا
ہوتے ہیں۔''

''کل جی بھر کے گوشت کھالینا۔'' میمونہ نے کہا۔

اختر پہلے ہی شرمندہ ہورہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ ایسی اپنائیت
برتاؤ کیا گیا تھا اور وہ یہ کر رہا تھا۔ اس نے پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا۔ سب
لوگ کھانا کھانے لگے۔ اختر پہلے ہی نوالے پر حیران رہ گیا۔ اتنے مزے کا تو اس نے
کبھی گوشت بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے بہت اچھی طرح کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد ریاض احمد آنگن میں چہل قدمی کرتے رہے۔ بچے کھیلنے لگے۔
سونے کا وقت آیا تو بچوں نے ریاض احمد کو گھیر لیا۔ ''ابو' کہانی سنائیں۔''

''بھئی آج اختر سے اس کی کہانی سنیں گے۔'' ریاض احمد نے کہا۔

بچوں کو مایوسی ہوئی لیکن انہوں نے ضد نہیں کی۔

''ہاں بھئی اختر' اب اپنے متعلق بتاؤ۔''

اختر نے انہیں سب کچھ سنا ڈالا۔ بچے حیرت سے سن رہے تھے۔ شاہ جی کی ما
کے متعلق سن کر وہ سہم گئے۔ وہ ان کے لئے ایسا ایڈونچر تھا جو جنوں اور پریوں کی
کہانی سے کم نہیں تھا۔ ریاض احمد اور سلمیٰ بیگم کن انکھیوں سے اپنے بچوں کو دیکھ
رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بچے یہ کہانی کبھی نہیں بھولیں گے۔

''اور یہ سب کچھ گوشت کی وجہ سے ہوا؟'' سلمیٰ بیگم نے تبصرہ کیا۔

''میں صرف ایک بوٹی مانگ رہا تھا باجی۔'' اختر نے صفائی پیش کی۔

''دنیا بڑی ظالم ہے۔'' ریاض احمد بولے۔

''تم نے کب سے گوشت نہیں کھایا ہے اختر؟'' سلمیٰ بیگم نے خاص طور پر

اپنے بچوں کو سنوانے کی غرض سے پوچھا۔

''باجی' میں نے پچھلے سال بقر عید سے بھی پہلے گوشت کھایا تھا۔ اس کے بعد
سے اب تک نہیں کھایا۔'' اختر نے بتایا۔

''دیکھا تم لوگوں نے۔'' سلمیٰ بیگم اپنے بچوں کی طرف مڑیں۔ ''تمہیں تو اتنے
دن ہوئے تھے۔ اس بے چارے کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے گوشت کھائے
ہوئے۔''

بچوں کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے۔

ریاض احمد کے اشارے پر سلمیٰ بیگم بچوں کو سلانے کے لئے لے گئیں۔

ریاض احمد نے اختر سے پوچھا ''اب تم کیا کرو گے بیٹے؟''

''میں کیا کروں گا۔ میں یتیم ہوں جناب ....''

''تم یتیم کو کیا سمجھتے ہو۔'' ریاض احمد نے اس کی بات کاٹ دی ''تمہیں پتا ہے
ہمارے پیارے نبی بھی یتیم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا میں اجالا کر
دیا۔ دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا آپ نے۔ جانتے ہو' اللہ یتیموں سے بہت محبت
کرتے ہیں۔ وہ ان کی مدد کرتے ہیں .....''

''میں جانتا ہوں جناب! اللہ نے میری مدد کی ہے ورنہ میں مرجاتا۔ مگر میں
بھیک مانگنے کے سوا کیا کرسکتا ہوں اور میں بھیک نہیں مانگنا چاہتا۔''

''تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ سب کچھ کرسکتے ہو اور انشاء اللہ کرو گے۔ دیکھو بیٹے'
ہم کچھ دنوں میں اپنے گھر جائیں گے۔ یہ گھر ہمارا نہیں۔'' ریاض احمد نے اسے اپنے
متعلق بتایا ''میں تمہیں اپنے گھر میں ایک علیحدہ کوارٹر دوں گا۔ تم اسکول میں داخلہ لینا
اور پڑھنا۔ میرے زور پر نہیں اپنے زور پر۔ ہم کوشش کریں گے کہ تم ادھر ادھر کے
گھروں میں اخبار ڈال کر خود پیسہ کماؤ۔ خود اپنی تعلیم کا خرچ اٹھاؤ۔ کھانا تمہیں گھر
سے مل جائے گا۔ اخبار والی بات نہ بنی تو تم اسکول سے واپس آنے کے بعد دکان پر
میرا ہاتھ بٹا دینا۔ تمہیں اس کی تنخواہ ملے گی۔ پھر دیکھنا' تمہارے پاس پیسے جمع ہوتے
رہیں گے۔ تم ایک دن بڑے آدمی بنو گے۔''

اختر کی آنکھیں امید کے ستاروں سے بھر گئیں۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ

کچھ ہے... اور بہت کچھ بن سکتا ہے۔

"اس وقت تک تم یہیں رہو۔"

اختر کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اسے اصغر کا خیال آگیا۔ پتا نہیں، وہ کہاں ہوگا۔ اس نے کھانا بھی کھایا ہوگا یا نہیں۔

"کیا بات ہے؟" ریاض احمد نے تبدیلی نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب، آپ اس کوارٹر میں اصغر کو بھی جگہ دے دیں گے نا؟"

"لیکن اصغر تو تم سے بچھڑ گیا ہے.... کھو گیا ہے۔"

"وہ مل جائے گا صاحب۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ریاض احمد سمجھ رہے تھے۔ دنیا میں اختر کا اب تک ایک ہی رشتہ تھا.... اصغر۔ وہ واقعی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا "کیسے ملے گا اصغر تمہیں؟ اتنے بڑے شہر میں...."

"صاحب، وہ عید کی تیسری رات اس فوارے اور روشنیوں والی چورنگی پر ضرور آئے گا۔ کانسٹیبل نے ہم سے کہا تھا...."

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ چلو، اب سو جاؤ۔"

سلمیٰ بیگم نے اسے لے جاکر سونے کی جگہ دکھا دی۔ اختر کو کبھی بستر نہیں ملا تھا۔ کہاں ایسا نرم گرم اور آرام دہ بستر۔ طویل جسمانی تکلیفوں، بے آرامی اور تھکن کے بعد آرام ملا تو اس کی آنکھوں میں نیند ہی نہیں، خواب بھی اتر آئے۔ لمحوں کے اندر وہ ایسا بے خبر سویا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ سلمیٰ بیگم نے اس کا ناپ لیا تھا۔

ریاض احمد نے بیوی کو کپڑے پھیلائے بیٹھے دیکھا تو بولے "یہ آدھی رات کو کیا لے بیٹھیں آپ؟"

"اشعر کی پینٹ ذرا سی کھول لوں تو اختر کو آجائے گی۔ جوتے بھی موجود ہیں۔ یتیم بچہ عید کے دن کپڑوں سے تو محروم نہ رہے۔"

ریاض احمد مسکرا دیے "سلمیٰ بیگم، آپ بہت اچھی ہیں۔"



رات ہوئی تو اصغر کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ بھوک الگ بے چین کر رہی تھی۔ وہ

پھرتا پھرا۔ اختر اسے کہیں نہ ملا۔ بھوک سے بے تاب ہوکر جب بھی وہ کسی سے سوال کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے خیال آجاتا کہ انہوں نے کسی سے کچھ نہ مانگنے کا ارادہ کیا ہے۔

اس کے قدم خودبخود اس ریسٹورنٹ کی طرف اٹھ گئے، جہاں گزشتہ رات اس نے کھانا کھایا تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے سیٹھ سے سوال نہیں کیا۔ بس سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس بار اس نے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا لیکن سیخوں پر بھنتے ہوئے گوشت اور کبابوں کی بو اسے پاگل کئے دے رہی تھی۔

سیٹھ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اسے پکارا "اے لڑکے... ادھر آ۔"

اصغر اس کے پاس چلا گیا۔

"کھانا کھائے گا؟"

اصغر نے سر جھکائے جھکائے اثبات میں ہلایا۔

"وہ دوسرا لڑکا جو تیرے ساتھ تھا، جو گوشت مانگ رہا تھا، وہ کہاں گیا؟"

"بھیڑ میں گم ہوگیا۔" اصغر کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز رندھ گئی۔

"رات اس نے کھانا کھایا تھا؟ گوشت ملا اسے؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"نہیں سیٹھ۔ گوشت نہیں ملا اسے اور وہ بہت ضدی ہے۔ دوپہر تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔"

سیٹھ کو پچھتاوا ہونے لگا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ اس نے فضلو کو بلایا "اسے سبزی اور روٹی لاکر دے بیٹا!" اس نے سوچا، دوسرا لڑکا ہوتا تو آج انہیں گوشت ہی کھلا دیتا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ لڑکے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ انہیں گوشت کھلا دیتا تو اس کا کیا جاتا۔ مگر لڑکے نے مانگا کتنی دھونس سے تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ اس سے کیا ہوتا ہے، دل نے کہا۔ اس کے باوجود اسے گوشت مل جاتا تو اللہ کتنا خوش ہوتا۔ سیٹھ جھنجھلا رہا تھا۔ اس جھنجھلاہٹ میں اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سبزی کا سن کر لڑکے کی آنکھیں بجھ گئی ہیں۔ سیٹھ تو اس لڑکے کا تصور کر رہا تھا، جو اتنے بڑے شہر میں گوشت مانگتا پھر رہا ہوگا۔ کیا سب لوگ وہی کریں گے، جو اس نے کیا

تھا۔ یا کوئی اللہ کا بندہ اس بے سہارا یتیم کی خواہش پوری کر دے گا؟ یہ سوال اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔

اصغر نے کھانا کھایا اور اسی طرف چل دیا' جہاں گزشتہ رات وہ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں دری تھی۔

چورنگی پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اختر اسے بہت یاد آرہا تھا۔ اس نے دری بچھائی اور لیٹ گیا مگر نیند آنے کے باوجود اس سے سویا نہیں جا رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ پولیس والے نے دہشت گردوں کی بات کی تھی۔ اسے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ دہشت گرد کیا ہوتے ہیں۔

اسے امید تھی کہ پولیس والا آئے گا۔ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ خیال اسے دھیرے دھیرے تھپک کر سلانے لگا۔ سونے سے پہلے ایک بے حد خوش کن خیال نے اسے چونکا دیا۔ اختر اسے دوبارہ مل سکتا تھا ...... اسی جگہ ...... عید کی تیسری رات۔ ہاں ...... وہ دونوں مل جائیں گے مگر اس وقت تک وہ کیا کرے گا؟ پھر نیند نے اسے ہر فکر سے بے نیاز کر دیا ...... نیند جو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے!



کسی بہت پیارے کی جدائی کا مرحلہ درپیش ہو اور اس کے ساتھ آخری رات رہ گئی ہو تو نیند نرم گرم بستر پر بھی نہیں آتی۔ باجی کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ چندو ہمیشہ کی طرح ان سے لپٹ کر سو رہا تھا مگر وہ جاگ رہی تھیں۔ انہیں چندو کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ جب سے چندو ان کے پاس تھا' اس وقت سے اب تک کا ایک ایک دن ان کی نظروں میں پھر گیا۔ آنکھوں سے برسات ہوتی رہی۔ دل میں ایک ایسا درد تھا' جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی تو انہیں لگتا کہ ان کا دم گھٹ جائے گا اور وہ مر جائیں گی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس رات کی صبح کم از کم وہ نہیں دیکھ سکیں گی۔

صبح ہوگئی اور ان کی پلک تک نہیں جھپکی لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھیں۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ سو رہی ہیں۔ وہ اٹھنا ہی نہیں چاہتی تھیں لیکن چندو اس روز خلاف معمول ذرا جلدی اٹھ گیا اور اس نے تکلف بھی نہیں کیا۔ وہ معمول کے مطابق انہیں جگانے کی کوششوں میں مصروف ہوگیا مگر اس صبح وہ اٹھنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ چندو کچھ زیادہ ہی بے صبرا ہو رہا تھا۔ ...... نجانے کیوں؟"

"ارے چندو' آج سو اور جتنا ہوسکتا ہے سو۔" باجی نے جھنجھلا کر کہا "اور مجھے بھی سونے دے۔ تجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"اسے سب معلوم ہے۔" بھائی جان بولے۔ باجی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی نجانے کب سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر باجی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔

چندو پیچھے پڑگیا تھا۔ باجی کو اٹھنا ہی پڑا۔

زندگی کا معمول شروع ہوگیا مگر کچھ معمولات ایسے تھے' جو آخری بار ادا کیے جا رہے تھے ..... اور وہ سب چندو سے متعلق تھے۔ باجی نے بادام پستے اور اخروٹ چندو کے سامنے رکھ دیئے' جن سے اس نے گزشتہ روز منہ پھیرلیا تھا۔ اس نے اب بھی منہ پھیرلیا۔

"کھالے رے چندو۔ کھالے میرے بیٹے۔"

لیکن چندو نے ان چیزوں کو منہ بھی نہیں لگایا۔ وہ باریک آواز میں چھوٹی سی میں میں کرتے ہوئے ان کے گھٹنوں سے سر رگڑ رہا تھا۔

"شمسہ' آپ کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔" بھائی جان نے تلخ لہجے میں مداخلت کی "چندو ہر چیز اس طرح چاہتا ہے' جیسے روز ہوتی ہے۔"

باجی نے سات بادام' سات پستے اور اخروٹ کی گری کے تین دانے چندو کے سامنے رکھے۔ چندو نے کھالیے۔ باجی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

باجی نے شوہر کے نہانے کے لئے گرم پانی دیا اور پھر چندو کے نہانے کا اہتمام کرنے لگیں۔ انہوں نے پانی کی بالٹی میں عرق گلاب ملایا اور اس سے چندو کو اچھی طرح نہلایا۔ اس روز چندو صرف عرق گلاب ملے پانی سے نہیں نہایا تھا۔ اس کے جسم پر باجی کے آنسوؤں کی دھاریں بھی پڑی تھیں۔

چندو کو نہلا کر باجی نے اس کا جسم تولیے سے اچھی طرح خشک کیا پھر انہوں نے اس کے جسم اور سینگوں پر اچھی طرح عطر ملا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے واسکٹ پہنائی۔ وہ بھی عطر میں بسی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کے لئے خاص طور پر سرخ ٹوپی سی تھی۔ وہ انہوں نے اس کے سر پر رکھ دی۔

اس روز چندو کی سج دھج دیکھنے والی تھی اور شاید چندو کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس کی چال میں اس روز وہ بانکپن اور مستی تھی' جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ باجی نے اس کی بلائیں لیں اور لپٹا کر رونے لگیں "چندو خدا کی قسم' میں خود غرض نہیں میرے بیٹے .... یہ سب اللہ کے لیے ہے .... ہے نا؟"

چندو نے اوپر نیچے سر ہلایا اور انہیں پیار کرنے لگا۔

بھائی جان باتھ روم سے تیار ہوکر نکلے تو اسے دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے

آنسو ضبط کیے "میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" انہوں نے کہا پھر منہ پھیر کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ باجی اٹھ کر ان کے پیچھے دروازے تک آئیں "سنیں .... ذرا قسائی کو کہہ دیجئے گا۔" انہوں نے لجاجت سے کہا۔

"میں نہیں کہوں گا۔ یہ کھیل آپ کا ہے۔ آپ ہی کھیلیں۔" بھائی جان کو غصہ آرہا تھا۔

"کیوں میرا دل چھیدتے ہیں۔ یہ کھیل نہیں۔ اللہ کے حضور قربانی پیش کی جا رہی ہے۔" باجی نے گلوگیر لہجے میں کہا "ٹھیک ہے۔ میں گلی میں کسی سے کہہ دوں گی۔"

بھائی جان کو یہ بھی گوارا نہیں تھا "اچھا .... کہہ دوں گا۔" انہوں نے کہا اور باہر نکل گئے۔

باجی نے واپس آکر چندو کو محبت سے لپٹایا "جاؤ بیٹے' اب جا کر سب لوگوں سے عید مل آؤ۔ خدا حافظ کہہ دو سب کو۔"

چندو ہٹنا نہیں چاہ رہا تھا مگر باجی نے دوبارہ کہا تو وہ باہر چلا گیا۔

چندو باہر نکلا تو سب سے پہلے حسینہ کے گھر گیا۔ ہر جگہ مرد اور بچے اس سے عید ملے۔ عورتوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ عیدی کے پیسوں سے اس کی واسکٹ کی جیبیں بھر گئیں۔ عید مبارک چندو .... کیسے ہو۔ آؤ' عید مل لو .... ہر طرف یہی صدائیں تھیں۔

یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ چندو کی قربانی ہونے والی ہے!



اصغر کی رات جیسے تیسے گزر گئی۔ سوتے جاگتے۔ وہ کچھ دیر سوتا اور پھر چونک کر جاگ اٹھتا۔ ہر بار اسے لگتا کہ کوئی دہشت گرد اسے ختم کرنے کے لئے آگیا ہے اور اس کے سر پر کھڑا ہے۔ ایک بار وہ سردی کے احساس کی وجہ سے اٹھا۔ وہ صبح کے قریب کا وقت تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے بچھی ہوئی دری کا ایک حصہ اوڑھ لیا اور دوبارہ سونے سے پہلے اسے یہ خیال ضرور آیا کہ اختر کو بھی ایسے ہی سر[illegible] دی گئی

ہوگی۔

فجر کے ذرا بعد وہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اس نے فوارے کے پانی سے کلیاں کیں اور منہ دھویا پھر وہ دری اوڑھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی پورا شہر دیر تک سوئے گا۔ وہ چائے والے کا منتظر تھا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے وہ بغیر مانگے اسے چائے ..... بلکہ بسکٹ بھی کھلا دے۔ یہ وقت بہرحال اس کے لئے کوفت کا تھا۔

اصغر کو یاد ہی نہیں تھا کہ وہ بقر عید کا دن ہے!

اچانک نہائے دھوئے ہوئے، نئے کپڑے پہنے ہوئے، اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے لوگ جوق در جوق سڑک پر آئے تو پہلے تو اصغر کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی مگر چند لمحوں میں ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ بقر عید کا دن ہے۔

اس نے سڑک پار کی اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ بچوں کو وہ خاص طور پر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا لیکن جلد ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے احساس ہوگیا کہ وہ شامل ہوکر بھی اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوسکا ہے۔ وہ سب سے الگ اور نمایاں نظر آرہا ہے۔ اور وہ بھی اچھے معنوں میں نہیں، برے معنوں میں۔ تمام بچوں نے نئے خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پیروں میں چمچماتے نئے جوتے چپلیں اور سینڈل تھے۔ سب خوشبو میں نہائے ہوئے تھے۔ اتنے لوگوں کی خوشبوئیں مل جل کر ہوا میں شامل ہو رہی تھیں۔ پوری فضا مہک رہی تھی۔ لگتا تھا، خوشبو لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

ضرورت تو نہیں تھی کہ وہ اپنے کپڑوں کو دیکھتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پیوند لگے کپڑے بہت میلے ہوگئے ہیں۔ دو دن دو رات سے تو وہ شہر میں آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس سے بھی کئی دن پہلے یتیم خانے میں اس نے وہ کپڑے پہنے تھے۔

پھر بھی اس نے سر جھکا کر خود کو دیکھا۔ کپڑے بے حد میلے تھے۔ کسی کسی جگہ سے تو چیکٹ ہو رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے بدبو بھی آرہی ہوگی مگر اس بدبو کا پردہ دوسروں کی خوشبو نے رکھ لیا ہے اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ پاؤں ابھی کچھ دیر پہلے اس نے فوارے کے پانی میں رگڑ رگڑ کر دھوئے تھے لیکن اتنی ہی سی دیر میں ان پر پھر میل جمنے لگی تھی۔

اصغر کو اچانک احساس ہوا کہ ہر شخص اسے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اسے اس بھیڑ میں شامل ہونے کا، ان لوگوں کے ساتھ چلنے کا کوئی حق نہیں۔ شرمندگی اور کم تری کے احساس نے اس کے جسم کو شل کرکے رکھ دیا۔ اس کے قدم پہلے بوجھل ہوئے، پھر سست اور وہ ایک طرف ہوگیا۔ سمٹ گیا۔ چند لمحوں میں اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔

لوگ آگے نکلے جا رہے تھے۔ قدموں کی رفتار تیز تر ہو رہی تھی۔ مسجد یا عید گاہ سے اعلان ہو رہا تھا کہ نماز ہونے والی ہے۔ اصغر چاہتا تھا کہ وہ ان سب سے پیچھے ..... اور اکیلا رہ جائے لیکن وہ ہجوم تو بہتا دریا تھا ..... موج در موج.....

"ابو بھئی، میں تو عیدی لوں گا ..... دس روپے۔" اس کے کان میں ایک بچے کی آواز پڑی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور اپنے باپ کی انگلی تھامے چلا جا رہا تھا "دیں نا ابو۔"

"دس نہیں، میں بیس دوں گا اپنے بیٹے کو۔" بچے کے باپ نے کہا "لیکن نماز کے بعد۔ عیدی نماز کے بعد ملتی ہے بیٹے۔"

اصغر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس حقیر کر دینے والے ہجوم سے کیسے جان چھڑائے۔ اسی وقت ایک ویگن وہاں آکر رکی "آؤ بھئی، نیو کراچی۔ گودھرا، نالہ، مدینہ کالونی، پانچ نمبر، سندھی ہوٹل کالا اسکول ..... آؤ بھئی۔" کنڈیکٹر آواز لگا رہا تھا۔

اصغر کو کسی جگہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس وہ اس وقت اس بھیڑ سے نکل لینا چاہتا تھا۔ وہ ویگن کی طرف بڑھا مگر فوراً ہی اس کے پاؤں رک گئے۔

"جائے گا بھئی؟؟" کنڈیکٹر نے پوچھا۔

اصغر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آجانا۔"

"پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔"

کنڈیکٹر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا "آجا ..... آج تو عید کا دن ہے۔ نماز کے بعد سواریاں ملیں گی تو تلافی ہو جائے گی۔"

اصغر ویگن میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں صرف دو مسافر تھے۔ اس لیے وہ اسے

آغوش مادر کی طرح مہربان لگی ..... وہاں سر جھکانے' نظر چرانے اور شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی اور یہاں بیٹھ کر وہ سکون سے سوچ سکتا تھا۔

تو یہ ہوتی ہے عید! اس نے سوچا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے' میری عید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یتیم خانے میں بڑی عافیت تھی۔ ان باتوں کا پتا نہیں چلتا تھا۔ یتیموں کی عید یتیم خانے ہی میں بھلی۔ اس نے سوچا۔ یہاں تو عید کے لئے بہت کچھ چاہیے جو یتیموں کے پاس نہیں ہوتا۔ ایک گھر ہو' جہاں آدمی نماز پڑھ سکے اور سو سکے۔ آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر سونے والے کی کیا عید۔ پھر ماں ہو' کپڑے سیئے۔ بابا انگلی پکڑ کر عید کے کپڑے اور دوسری چیزیں دلائے۔ باپ ہو' جو انگلی پکڑ کر عید کی نماز کے لئے لے جائے۔ پھر نماز کے بعد عیدی دے۔ جس کے پاس سب کچھ نہ ہو' وہ یتیم خانے چلا جائے۔

وہ سوچے چلا جا رہا تھا!



اختر بے سدھ سویا ہوا تھا۔ اسے ریاض احمد نے جگایا۔ ان کے بچے بھی اس وقت سو کر اٹھے تھے۔ اختر نے اٹھنے میں ذرا سستی کی۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اسے سلمیٰ بیگم کی آواز سنائی دی "اشعر بیٹے' آپ بھول گئے کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے بڑوں کو سلام کرتے ہیں" اس کے بعد اس نے اشعر کو شرمندگی بھرے لہجے میں سلام کرتے سنا۔

اختر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "سلام علیکم بیگم صاحب!" سلمیٰ بیگم کپڑوں پر استری کر رہی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائیں "ماشاء اللہ ..... بڑے تمیزدار بچے ہو۔"

اختر کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ پہلی بار کسی نے یوں اس کی تعریف کی تھی۔

"تمہیں نہانا آتا ہے؟"

"جی بیگم صاحبہ!"

وہ اسے باتھ روم میں لے گئیں۔ وہاں انہوں نے اسے نہانے والا فوارہ چلا کر

دکھایا۔ وہاں صاف ستھرا تولیا بھی تھا اور خوشبو دار صابن بھی لیکن یہ سب دیکھ کر اختر افسردہ ہو گیا۔ اس کے کپڑے بہت میلے' بہت گندے ہو رہے تھے۔

"یہ تمہارے کپڑے ٹنگے ہیں۔" سلمیٰ بیگم نے کھونٹی کی طرف اشارہ کیا "نہا کر پہن لینا۔"

اختر نے صرف ایک نظر کپڑوں کو دیکھا اور پھر حیرت سے سلمیٰ بیگم کو۔

"دروازہ بند کر لو۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

نہانے کے بجائے اختر دیر تک ان کپڑوں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ یہ کپڑے اس کے ہیں ..... وہ پہنے گا؟ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اتنے پیارے کپڑے' وہ نہایا اور خوب جی بھر کے نہایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بدن ذرا بھی میلا ہو۔ پہلی بار اسے اتنے پیارے کپڑے ملے تھے۔

وہ نہا کر کپڑے بدل کر نکلا تو ریاض احمد اور دونوں لڑکے تیار ہو چکے تھے "ابھی یہ چپل پہن جاؤ۔" سلمیٰ بیگم نے اختر سے کہا "واپس آ کر پینٹ شرٹ پہنو گے تو میں تمہیں جوتے موزے دوں گی۔ ہاں' یہ ٹوپی رکھو سر پر۔"

وہ ریاض احمد اور ان کے بچوں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا تو سلمیٰ بیگم کچھ مسالے کوٹ رہی تھیں "میں نے سب تیاری کر لی ہے۔ گوشت آتے ہی بھون دوں گی۔"

گوشت کا سنتے ہی اختر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ریاض احمد کے بچوں کا بھی یہی حال ہے "ہم کہاں جا رہے ہیں صاحب؟" اس نے ریاض احمد سے پوچھا۔

"مسجد ..... عید کی نماز پڑھنے۔" ریاض احمد نے کہا "اور تم مجھے انکل اور ان کی امی کو آنٹی کہا کرو۔"

"جی اچھا انکل!"

صاف ستھری قمیض شلوار پہن کر یوں چلنا اختر کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی۔

مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ..... اتنے لوگ ... وہاں بازار سے بھی زیادہ ہجوم

تھا۔ مولوی صاحب وعظ دے رہے تھے" اس شخص کو کچھ دینے کا ...... مدد کر اجر زیادہ ہے جو ضرورت مند ہو۔ لیکن شرم کی وجہ سے سوال نہ کرسکے۔ جے عزت کا خیال ہو اور اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا ہو۔ اس لیئے کہ سوال کرنے وا کسی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلا دے گا ..... اور اسے مل بھی بہت جائے گا۔ یاد رکھ جو دوسروں کا پردہ رکھتا ہے' اللہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔

"قربانی کے گوشت میں پڑوسیوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ آپ اپنا حصہ کس بھی دے سکتے ہیں مگر آپ کو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ کسی کا حصہ روک کر کس کو دینے کا کوئی حق نہیں۔ پڑوسی کا حق ایسا ہے کہ اگر پڑوسی بھوکا سوگیا اور آپ کھانا کھالیا تو اللہ آپ سے جواب طلب کرے گا اور یہ عذر قبول نہیں فرمائے گا اس نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔ پڑوسی کے حال کی خبر رکھنا آپ کی ذمے داری ..... تجسس کئے بغیر۔ صرف مشاہدے کے زور پر۔ اس لئے کہ نہ بتانے پر بھی کچھ کھل جاتا ہے۔ صرف احساس بیدار ہونا چاہیے۔

"غریب وہ نہیں ہوتا' جو جان بوجھ کر اپنا حلیہ غریبوں کا سا رکھے' غربت اعلان کرے۔ غریب وہ ہے جو اپنی محرومی چھپا کر رکھے۔ کوشش کرے کہ اس حال کا کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ ایسے لوگوں کو تلاش کرکے ان کی مدد کیا کریں ...."

نماز سے فارغ ہوکر سب ایک دوسرے سے عید ملنے لگے۔

واپس آتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ گلی میں دو ایک گھروں میں قربانی ہو ہے۔ باقی لوگ قربانی کا اہتمام کر رہے ہیں۔ وہ گھر آگئے۔ اب وہ سب گوشت کی کے منتظر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گوشت بس اب آنے ہی والا ہے۔



بھائی جان نماز پڑھ کر واپس آئے تو انہوں نے بیوی کو بتایا کہ انہوں نے ق سے بات کرلی ہے مگر وہ کہہ رہا تھا کہ آنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ باجی یہ سن پریشان ہوگئیں۔ وہ اس مرحلے سے جلد از جلد گزر جانا چاہتی تھیں۔ انہیں ڈر تھ دیر لگے گی تو ان کی ہمت جواب دے جائے گی۔

"آپ قربانی تک کہیں جائیے گا نہیں۔" باجی نے کہا۔ شوہر کی سوالیہ نظروں کے جواب میں انہوں نے وضاحت کی "چھری تو آپ کو پھیرنی ہے نا۔"

"یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔" بھائی جان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"تو پھر قربانی کیا ہوئی۔ یہ تو آپ کا کام ہے۔"

"مجھ سے نہیں ہوگا۔" اس بار بھائی جان کے لہجے میں فریاد تھی "آپ سوچیں کہ اگر آپ کو یہ کام کرنا ہوتا تو کیا ہوتا۔"

"عورت کے لئے اللہ کا حکم نہیں ہے۔ لیکن اللہ جانتا ہے کہ اس کی خاطر میں یہ بھی کرگزرتی۔ اگرچہ دل خون ہو جاتا۔" باجی رونے لگیں۔

بھائی جان کو ان پر ترس آنے لگا "اچھا شمسہ بیگم! میں حوصلہ کرلوں گا۔ آپ دعا کریں۔"

اسی وقت چندو گھر میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا باجی کے پاس آیا۔ اس کے آتے ہی بھائی جان اندر چلے گئے۔ ان میں اب چندو کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

چندو آیا اور باجی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔ باجی کو اس کی واسکٹ سے نوٹ جھانکتے نظر آئے۔ انہوں نے نوٹ نکالے "ہوں .... تو تم عیدی سمیٹے پھر رہے ہو۔ کھایا پیا بھی خوب ہوگا۔" باجی جانتی تھیں کہ گلی کے سب لوگ عید اور بقرعید پر چندو کو خاص طور پر ڈرائی فروٹ کھلاتے ہیں۔

باجی نے نوٹ گنے "خوب کمائی کی ہے مگر چندو' یہ تمہارے کام کے نہیں۔ انہیں میں صدقہ کردوں گی۔"

چندو کی آنکھوں کی نمی افسانہ نہیں تھی۔

اس کے بعد چندو باہر نہیں گیا۔ وہ باجی کی گود میں سر رکھے لیٹا رہا۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہو جاتیں اور باجی اپنے آنچل کے کنارے سے پونچھ دیتیں پھر باجی نے کہا "اٹھ چندو بیٹے' ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نماز پڑھ لوں۔"

وہ نماز پڑھ کر آئیں تو دیکھا کہ چندو بے حد مضطربانہ انداز میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ ان کے پاس آیا اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ

گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ باجی بھی رونے لگیں۔

وہ عید کا دن تھا مگر صرف گھر کے لوگوں پر ہی نہیں، در و دیوار پر بھی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔



ویگن والے نے اصغر کو کالے اسکول پر اتار دیا۔ اصغر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں نماز ہو رہی تھی۔ مسجد کے باہر بھیک مانگنے والے جمع تھے۔ اصغر ان سے ذرا ہٹ کر سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

لوگ نماز پڑھ کر نکلے اور حسب توفیق خیرات کرنے لگے۔ ایک صاحب نے اصغر کے پاس سے گزرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا "نہیں جی ..... میں بھیک نہیں مانگتا صاحب!" اصغر نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"لے لو بیٹے۔ آج عید کا دن ہے اور یہ میں بھیک نہیں دے رہا ہوں۔"

لفظ بیٹے سن کر اصغر کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اسے وہ بیٹا یاد آیا، جو باپ سے عیدی مانگ رہا تھا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟ ماں باپ ہیں؟" ان صاحب نے پوچھا۔

"میں کہیں نہیں رہتا صاحب! ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔"

"یہ پیسے رکھ لو۔"

"صاحب، ایک بات مانیں گے۔" اصغر نے گھگیا کر کہا "آپ مجھے پانچ روپے دے دیں ..... دو دے دیں مگر عیدی کہہ کر دیں۔"

اس کے لہجے میں کوئی چیز تھی، جس نے ان صاحب کے دل کو چھولیا۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا اور بیس روپے اصغر کی طرف بڑھائے "لو بیٹے، یہ تمہاری عیدی ہے۔"

اصغر نے بے حد شکر گزاری سے وہ پیسے یوں لیے، جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"بیٹے، عیدی لے کر سلام بھی تو کرتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

اصغر نے نفی میں سرہلایا۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی عیدی تھی۔ اسے واقعی نہیں معلوم تھا۔ اس نے سلام کیا۔ وہ صاحب بولے۔ "جیتے رہو بیٹے۔" پھر وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ نواب صاحب تھے۔ ان کی بیوی بہت چڑچڑی خاتون تھیں۔ ان کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اسے نہلاتے دھلاتے، اپنے بیٹے کے صاف ستھرے کپڑے پہناتے اور ساتھ بٹھا کر اسے ناشتا کراتے مگر وہ جانتے تھے کہ بیوی ان کے تو لتے لیں گی اور اس لڑکے کو تو شاید مار مار کر اللہ کی راہ میں قربان ہی کر دیں۔ چناں چہ وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ پھر بھی جاتے جاتے انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں محبت، عقیدت، شکر گزاری اور نجانے کیا کیا تھا۔ انہوں نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکالیں پھر وہ پلٹے اور گھر کی طرف چل دیے۔

اصغر انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ میں موجود نوٹوں کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی بھوک کا احساس جاگ اٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک ٹھیلے پر چھولے بک رہے تھے۔ وہ اس طرف چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا آج کے دن بھی گوشت نہیں ملے گا۔



امداد صاحب کے ہاں قربانی ہو گئی تھی۔ ان کی بیوی نے ایک حصہ گوشت فریزر میں رکھا اور باقی گوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ندی والوں میں دے آئیں۔"

ندی کے اردگرد ایک کچی بستی تھی۔ وہاں کے باسی پیر کالونی میں ندی والے کہلاتے تھے۔ وہ بہت غریب لوگ تھے۔ مرد گھر بیٹھ کر چھوٹے موٹے کام کرتے یا خالی بیٹھتے۔ عورتیں گھروں کے کام کاج کر کے گھر چلاتیں۔ پیر کالونی میں تمام گوشت ندی والوں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔

امداد صاحب پر مولوی صاحب کے صبح کے وعظ کا گہرا اثر ہوا تھا۔ انہوں نے کہا "پڑوس میں تو گوشت بھجوا دیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ سب کے ہاں قربانی ہوتی ہے۔ بعض گھروں میں تو دو تین ہوتی ہیں۔ یہ انہیں دے کر آئیں، جن کا حق ہے۔"

"مستحق کا تو بعض اوقات پتا بھی نہیں چلتا...." امداد صاحب نے کہا اور مولوی صاحب کے وعظ کا خلاصہ بیگم کے گوش گزار کر دیا۔

"ہٹیں ...... یہاں کوئی ایسا نہیں۔ کھاتے پیتے لوگوں کی بستی ہے۔ جیسا میں کہتی ہوں، وہی کریں۔" بیگم نے انہیں جھڑک دیا۔

امداد صاحب کو غصہ تو بہت آیا لیکن بیوی سے دبتے تھے، خاموش ہو گئے۔ اسی وقت پڑوس کا ایک بچہ آگیا "انکل، امی کہہ رہی ہیں، اپنا گوشت لے کر جائیں تو ہمارا گوشت بھی لیتے جائیں۔ ندی والوں کو دینا ہے۔"

بیگم نے امداد صاحب کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھا "دیکھا آپ نے؟" ان کے ان تین لفظوں میں بہت کچھ تھا۔

امداد صاحب نے کندھے جھکائے اور سوزوکی کی چابی اٹھالی۔



بچوں کو سلمی بیگم اور ریاض احمد نے الگ الگ دس دس روپے عیدی دی تھی۔ نماز سے آنے کے بعد انہوں نے بچوں کو کپڑے بدلوا دیے تھے۔ اختر نے پہلی بار پینٹ قمیص پہنی تھی۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا اور باہر نکلتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کچھ فرق جوتوں اور موزوں سے بھی پڑا تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلنے والا جوتے پہن کر پریشان ہو رہا تھا مگر پھر اشعر کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ یقیناً" اچھا لگ رہا ہوگا۔ کیوں کہ اشعر اچھا لگ رہا ہے وہ اشعر اور فیاض کے ساتھ باہر چلا گیا۔ انہوں نے جھولا جھولا اور بوتل پی۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے اچانک اسے بھوک لگنے لگی۔

ادھر گھر میں سلمی بیگم پریشان تھیں۔ ان کی گوشت بھوننے کی سب تیاریاں مکمل تھیں مگر ساڑھے گیارہ بجے کے باوجود اب تک کہیں سے گوشت نہیں آیا۔ وہ

اس لئے اور زیادہ فکر مند تھیں کہ بچوں نے ناشتا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب گوشت ہی کھائیں گے اور ڈٹ کر کھائیں گے۔

ریاض احمد باہر سے آئے تو سلمی بیگم نے ان پر پریشانی ظاہر کی۔ "سلمی بیگم، یہ امید چھوڑ دیں۔" ریاض احمد نے افسردگی سے کہا۔ "یہاں پڑوسیوں کے ہاں گوشت بھجوانے کا رواج نہیں ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"دیکھ کر آرہا ہوں۔" ریاض احمد بولے "ابھی امداد صاحب ملے۔ وہ کئی گھروں کا قربانی کا گوشت لاد کر ندی والی بستی میں لے جا رہے تھے ..... مستحقین میں بانٹنے کے لیے۔ بتا رہے تھے کہ یہاں ایک ایک گھر میں کئی کئی قربانیاں ہوتی ہیں۔ رشتے داروں کا بھی یہی حال ہے اس لیے گوشت غریبوں اور مستحق لوگوں کو بھجوا دیا جاتا ہے۔"

"عجیب فلسفہ ہے۔" سلمی بیگم جھنجلا گئیں۔

ریاض احمد کو حیرت ہوئی "عجیب نہیں۔ فطری بات ہے۔" وہ انہیں سمجھانے لگے "آدمی کو اپنے اسٹیٹس کے مطابق اقامت اختیار کرنی چاہیے۔ آدمی غریب ہو جائے تو اسے متمول لوگوں کے درمیان رہنے کا کوئی حق نہیں بلکہ وہ اس کے لئے مضر اور نقصان دہ ہی ثابت ہوگا۔"

"آپ کا مطلب ہے، ہمیں ان حالات میں ندی میں رہنا چاہیے۔" سلمی بیگم کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"اب جب سخت وقت گزر چکا ہے۔ صرف دو دن گزارنے ہیں ہمیں تو آپ اپنے صبر کو کیوں رائگاں کرتی ہیں سلمی بیگم۔ پرسوں انشاء اللہ ہم قربانی کریں گے۔"

"مجھے آج اور کل کی فکر ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ آج میں بچوں کو کسی طور پر بہلا نہیں سکتی اور پھر یہ زیادتی ہے کہ گلی کے ہر گھر میں قربانی ہو اور میرے بچے گوشت کو ترسیں۔" سلمی بیگم کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔" ریاض احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سلمی بیگم حقیقت پسند تھیں۔ انہوں نے پہلی فرصت میں دال چڑھالی لیکن یہ

سوچ کر وہ لرز رہی تھیں کہ بچوں کو کیسے قائل کر سکیں گی۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی آگئے۔ حسب توقع انہوں نے آتے ہی کہا "گوشت کھلائیں امی! بہت بھوک لگی ہے۔"

"اس وقت تو میں دال پکا رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سلمیٰ بیگم اتنی شرمندہ تھیں کہ کبھی زندگی میں نہیں ہوئی تھیں "گوشت ابھی آیا نہیں۔ آئے گا تو گوشت دوں گی۔"

"میں گوشت کے سوا کچھ نہیں کھاؤں گا۔" ننھے فیاض نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"جی امی! اتنے دن سے آپ آج کے لئے کہہ رہی تھیں' اب تو میں گوشت ہی کھاؤں گا۔" یہ اشعر تھا۔

اختر نے حیرت سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کی طرح گوشت کو ترس رہے ہیں۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس افسردہ ہوگیا۔

ایک بجا ..... ڈیڑھ بج گیا۔ کہیں سے گوشت نہیں آیا۔ فیاض اب بھوک سے بلک رہا تھا' لیکن دال کھانے کو تیار نہیں تھا۔ یہی حال اشعر کا بھی تھا۔ میمونہ بھی ایک طرف سر ڈالے پڑی تھی۔ سلمیٰ بیگم کا چہرہ یوں سپید ہو رہا تھا' جیسے کسی نے ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو "تم تو کھالو میمونہ بیٹی۔" انہوں نے کہا۔

میمونہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی نگاہوں کی شکایت سلمیٰ بیگم کا دل کاٹ گئی "امی ..... مجھے بھوک نہیں ہے۔" میمونہ نے آہستہ سے کہا۔

سلمیٰ بیگم کے لئے آنسو روکنا مشکل ہوگیا۔

یہ سب دیکھنے کے بعد اختر ریاض احمد کے پاس چلا گیا "انکل' ہر گھر میں قربانی ہوئی ہے پھر آپ کے گھر گوشت کیوں نہیں آیا؟"

"بیٹے' میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔" ریاض احمد نے بے بسی سے کہا پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انکل ..... کوئی بھی کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ چھوٹا فیاض رو رہا ہے۔"

"میں کچھ بھی نہیں کر سکتا بیٹے۔"

"میں تو کر سکتا ہوں انکل۔ میں گوشت مانگ لاؤں گا۔"

"نہیں اختر۔ مانگنا کبھی نہیں۔" ریاض احمد نے سخت لہجے میں کہا "میں تمہیں سکھا رہا ہوں کہ دنیا میں ترقی وہی لوگ کرتے ہیں' جو اللہ سے مانگتے ہیں اور اپنی عقل اور زور بازو پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں بھی مدد کی پیشکش نہیں کی۔ میں نے تم سے یہی کہا نا کہ تم گھروں میں اخبار ڈالنا اور دکان میں میری مدد کرنا یعنی خود کمانا۔ پھر پڑھنا اور پیسے بچانا بھی۔ اس کے بعد دیکھنا' انشاء اللہ ایک دن تم بہت بڑے آدمی بنو گے۔ میں تمہاری مدد کروں گا تو تم خود کچھ نہیں کر سکو گے۔ چھوٹے ہی رہ جاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی انکل! میں سمجھ گیا۔"

"وعدہ کرو' کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگو گے۔ ہاں کوئی خود سے کچھ دے اور وہ بھی شدید ضرورت میں' تو الگ بات ہے۔ اس سے بھی بچنے کی کوشش کرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں انکل!"

اختر اندر چلا گیا۔ تین بج رہے تھے۔ بھوکے بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ آنٹی بھی بستر پر لیٹی تھیں۔ وہ شاید رو رہی تھیں۔ اختر بے تابانہ ٹہلتا رہا۔ انکل نے کہا تھا' اللہ سے مانگو اور اپنی عقل اور زور بازو سے کام لو۔ یہ معاملہ زور بازو کا نہیں تھا کہ وہ کسی سے گوشت چھین لاتا۔ اسے عقل سے کام لینا تھا۔

اس نے افسردگی سے سوتے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ یہ ان لوگوں کے بچے تھے' جنہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ محبت دی تھی۔ عید کی خوشی دی تھی جب کہ وہ اپنے بچوں کے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسے ان کے لئے کچھ کرنا تھا۔

ایک دن اور ایک رات میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ یتیم خانے میں بھی وہ تیز و طرار اور جارحیت پسند تھا مگر اب اس کے پاس خود اعتمادی بھی تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔ وہ اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔



ساڑھے تین بجے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ امداد صاحب نے خود جاکر

دروازہ کھولا۔ ایک خوش شکل اور خوش پوش لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ایک ٹرے تھی۔ ٹرے میں ایک برتن تھا' جس پر کپڑا پڑا تھا۔

امداد صاحب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "کہاں سے آئے ہو بیٹے؟"

"میں آپ کے برابر والے گھر سے آیا ہوں ..... ریاض صاحب کے ہاں سے۔"

"تم ان کے بچے تو نہیں۔"

"جی' میں یتیم ہوں۔ کل میں بھوک سے بے ہوش ہوگیا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے آئے۔ سونے کا بستر دیا' کھانا کھلایا اور صبح نئے کپڑے دیئے۔"

"ریاض صاحب بلاشبہ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"یہ میں ان کے گھر سے لایا ہوں لیکن انہیں پتا نہیں ہے۔ آپ یہ برتن انہیں واپس بھی نہیں بھیجئے گا۔ انہیں پتا نہ چلے کہ میں یہ لایا تھا۔"

امداد صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا معما ہے۔ عجیب پراسرار معاملہ تھا۔ انہیں گڑبڑ کا احساس ہونے لگا "نہیں بھئی' میں تو نہیں لیتا۔"

"دیکھئے کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کو یہ سب بتاتا ہی کیوں۔ کہتا کہ آنٹی نے بجھوایا ہے اور آپ لے لیتے۔"

لڑکے کی دلیل دل کو لگنے والی تھی "مگر بات تو پتا چلے ....."

"آپ اندر جاکر دیکھیں گے تو سب سمجھ جائیں گے۔" لڑکے نے کہا "خدا کے لیے' آپ یہ اندر لے جائیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی امداد صاحب نے ٹرے لے لی۔ وہ اندر گئے "کیا ہے؟" ان کی بیگم نے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں۔" امداد صاحب نے کہا اور قاب پر سے خوان ہٹایا۔ وہ سناٹے میں آگئے۔ زمین انہیں واضح طور پر اپنے پیروں کے نیچے سے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بیگم بڑے تجسس سے آئیں۔ قاب میں دال دیکھ کر ان کا منہ بن گیا "یہ کیا؟ کون دے کر گیا ہے۔ منہ پر ماریں اس کے۔"

"تم بقر عید کے دن کسی کے گھر سے دال آنے کا مطلب سمجھتی ہو؟ نہیں سمجھتیں۔" امداد صاحب سرد لہجے میں بولے بدبخت عورت' میں نے صبح بھی کہا تھا کہ

بڑوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اب دیکھو' سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ اور توبہ کرو۔ تمہارے گھر میں قربانی ہوئی ہے۔ تمہارا فریزر گوشت سے بھرا ہے اور گلی میں ایک گھر ایسا ہے' جہاں دال پکی ہے۔ تف ہے تم پر۔ یہ قربانی قبول ہوگی بھلا۔"

بیگم کا چہرہ فق ہوگیا "یہ کس کے ہاں سے آیا ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ وہ عزت والے اور خود دار لوگ ہیں۔ یہ انہوں نے نہیں بھیجا۔ انہیں تو معلوم بھی نہیں۔ یہ مجھے ایک فرشتہ دے کر گیا ہے۔ اب یہ برتن گھر میں رکھنا یا کسی کو دے دینا اور ان کے بارے میں تجسس نہ کرنا۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں' تجسس نہ کرنا اور یہ تم جان بھی نہیں سکتیں۔ ہے نا کمال کی بات؟ اسے کہتے ہیں' سفید پوشی۔ اب تم جلدی سے ایک ڈش میں بھنا ہوا گوشت نکالو اور فریزر کے گوشت میں سے آدھا نکالو۔ آدھے سے زیادہ ہو' کم نہ ہو اور یہ سب سلیقے سے ٹرے پر رکھ دو۔" امداد صاحب کے لہجے میں ایسا تحکم تھا' جو ان کی بیگم کے لئے نیا تھا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے برا لگ رہا ہے۔" ان کی بیگم گڑگڑائیں۔ "خدا کی قسم' میں شرمندہ ہوں۔ آپ کہیں تو میں پورا گوشت دے دوں۔ ہمارے ہاں کل بھی تو قربانی ہوگی۔"

"بس جو میں نے کہا ہے' وہ کرو۔"



اختر پچھلے دروازے سے باہر گیا تھا اور ادھر ہی سے واپس آ گیا۔ واپس آ کر وہ چپکے چپکے سب بچوں کو جگانے لگا ''اٹھ جاؤ گوشت آنے والا ہے۔ کھانا کھانا ہے۔''

تینوں بچے چونک کر اٹھ بیٹھے لیکن ان کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھنا' ابھی دروازے پر دستک ہوگی اور گوشت آئے گا۔'' ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ ڈرائنگ روم میں افسردہ بیٹھے ہوئے ریاض احمد نے دروازہ کھولا۔ وہاں امداد صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے پر ایک قاب اور کافی سارا کچا گوشت تھا۔ قاب پر خوان تھا ''معافی چاہتا ہوں ریاض بھائی!'' امداد صاحب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''ہمارے ہاں قربانی ذرا دیر سے ہوئی۔ یہ تو ناوقت لیکن قبول فرمالیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں امداد صاحب!''

''برتن میں بعد میں لوں گا اور محلے والوں کے ہاں بھی جانا ہے گوشت لے کر۔''

ریاض احمد ٹرے لے کر اندر آئے۔ انہوں نے سلمٰی بیگم کو اٹھایا۔ قاب میں بھنا ہوا گوشت تھا ''دیکھا سلمٰی بیگم ' اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔ اب بچوں کو جگائیں اور کھانا لگائیں۔''

مگر پتا چلا کہ بچے پہلے ہی جاگ رہے ہیں ''اختر بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' فیاض چلایا ''گوشت آ گیا۔''

''کیا کہہ رہا تھا اختر؟'' ریاض احمد نے چونک کر پوچھا۔

''ہمیں سوتے سے جگایا اور کہنے لگے ..... اٹھ جاؤ' گوشت آنے والا ہے۔''

اشعر بولا۔

ریاض احمد نے شک آمیز نظروں سے اختر کو دیکھا ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''بس انکل' میرا دل کہہ رہا تھا۔'' اختر نے معصومیت سے کہا۔

ریاض احمد سوچتے رہے۔ اختر تو باہر بھی نہیں گیا تھا۔ اس پر شک کا کوئی جواز نہیں تھا پھر امداد صاحب نے کہا تھا کہ انہیں اور گھروں میں گوشت لے کر جانا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ امداد صاحب مختلف آدمی ہیں۔ وہ پڑوسیوں کو گوشت بھجواتے ہیں۔

''انکل ..... تیسری رات آپ مجھے اس چورنگی پر لے کر چلیں گے نا؟'' اختر نے انہیں چونکا دیا۔

وہ مسکرائے۔ دل و دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ خوش تھے۔ ''ہاں بیٹے اور ہم جا کر اصغر کو بھی لے آئیں گے۔''

''آئیں بھئی سب لوگ۔ کھانا کھالیں۔'' سلمٰی بیگم نے چہکتی آواز میں پکارا۔

بچے ڈائننگ ٹیبل کی طرف لپکے۔ ان کی عید کی صبح ہو گئی تھی۔



اصغر ادھر ادھر گھومتا' کھیل تماشے دیکھتا پھرا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ بھوکا تو نہیں تھا۔ اس نے تین پلیٹ چھولے کھا لیے تھے لیکن اس کی گوشت کی تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کے پاؤں میں کوئی چیز چبھی۔ تکلیف کا احساس ہوا تو اس نے جھک کر دیکھا اس کے تلوے میں سے خون نکل رہا تھا۔ شاید کوئی شیشہ چبھا تھا۔ اب وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔



باجی عصر پڑھنے کے بعد دعا کر رہی تھیں ـــ اے اللہ' مجھے صبر اور میرے چندو کو حوصلہ دے۔ یہ دعا لفظوں میں نہیں تھی' دھڑکنوں میں تھی اور ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں تھی۔

انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور سر گھما کر چندو کو دیکھا' جو مضطربانہ انداز میں

صحن میں ٹہل رہا تھا۔ قسائی کہاں رہ گیا۔ باجی نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ ذکریا صاحب نے اسے کہا ہی نہ ہو۔

اسی لمحے بھائی جان قسائی کو لے کر گھر میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

قسائی کے گھر میں قدم رکھتے ہی چندو کا بڑا شدید ردعمل سامنے آیا۔ وہ حلق سے ڈری ڈری آواز نکالتے ہوئے باجی کی طرف لپکا اور باجی کی گود میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ باجی نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اسے تھپکنے لگیں۔ "ڈرتا ہے رے چندو حوصلہ کر میرے بیٹے' میرے لال۔" انہیں احساس ہوا کہ چندو پر لرزہ طاری ہے۔ "تجھے تو پتا ہے' میں تجھے کتنا چاہتی ہوں۔" باجی کا اپنا دل بھی یوں دھڑک رہا تھا' جیسے اپنی ہی تیزی کے ہاتھوں بند ہونے والا ہو۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھیں۔

"تو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے رے چندو۔ بیٹے' میرے لال' حوصلہ کر ورنہ ماں کا کیا حال ہو گا۔ یوں تو تیری ماں مر جائے گی چندو۔" وہ اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ مگر چندو کی کوشش یہ تھی کہ ان کی آغوش میں یوں سمائے کہ کسی کو نظر نہ آئے۔



بھائی جان قسائی کو لے کر گلی میں داخل ہوئے تو انہیں عابد نے دیکھ لیا۔ ایک منٹ کے اندر پوری گلی کو معلوم ہو گیا کہ بھائی جان کے ہاں قربانی ہو رہی ہے۔ یہ خیال کسی کو نہیں آیا— سوائے اماں کے— کہ یہ چندو کی قربانی ہے۔ پھر بھی گلی کے لڑکے تماشا دیکھنے کیلئے جمع ہو گئے مگر جب انہیں اندازہ ہوا کہ قربانی چندو کی ہو رہی ہے تو گلی میں کھلبلی مچ گئی۔ گلی کی تمام عورتیں' بچے اور مرد آ گئے۔

باجی نے چندو پر گلاب چھڑکا۔ اس کے عطر لگایا پھر انہوں نے دیکھا کہ پوری گلی اکٹھا ہو گئی ہے۔ انہوں نے پکار کر کہا۔ "سنو— مجھ سے زیادہ چندو کو کوئی نہیں چاہتا اور میں ہنسی خوشی بغیر کسی لالچ کے اسے اللہ کی راہ میں قربان کر رہی ہوں تم سب کو قسم ہے' کوئی بحث نہ کرے۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ باجی اور بھائی جان سب کیلئے محترم تھے اور پھر محبت

والی بات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

حسینہ بلک بلک کر رونے لگی۔ "کیا کرتی ہیں باجی——"

"بس حسینہ——"

آنسو روکنا تو حسینہ کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنی آواز کا گلا گھونٹ لیا۔

"دیکھ چندو' میری جان' میرے لال— ماں کی محبت کی لاج رکھ لے آج۔" باجی نے چندو کے کان میں کہا۔

اور اچانک چندو یوں کھڑا ہو گیا' جیسے اس کی ٹانگوں میں جان پڑ گئی ہو۔

"چندو— میرے بیٹے— میرے لال— جا' قربانی پیش کر۔" باجی کی آواز ان کی آواز نہیں لگ رہی تھی۔ "دیکھ میرے بچے' رونا نہیں۔ کوئی آواز نہ نکلے—— دم نہ مارنا میرے لال— ہنسی خوشی——" ان کا گلا یوں رندھا کہ آواز بند ہو گئی۔

پھر چشم فلک نے— اور تماشا دیکھنے والوں نے وہ منظر دیکھا' جو وہ قیامت تک نہیں بھول سکیں گے۔

چندو مستانہ وار' بانکپن سے چلتا مقتل کی طرف— امرود کے درخت کی طرف چلا' جہاں بھائی جان اکڑوں بیٹھے تھے۔ چندو وہاں پہنچ کر اس طرح لیٹا کہ اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ جیسے چھری کو گلا پیش کر رہا ہو۔

دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ باجی نے اپنے منہ میں دوپٹے کا گولا بنا کر ٹھونس لیا۔

چندو نے سر گھما کر قسائی کو دیکھا' جس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلکا۔ وہ قسائی کو دیکھتا رہا۔ قسائی نے بھائی جان سے کہا۔ "چھری کون پھیرے گا جناب!"

"میں پھیروں گا۔" بھائی جان نے کہا لیکن ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

قسائی نے چھری ان کے ہاتھ میں دے دی۔ "میں اسے باندھ دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔" باجی نے بلند آواز میں کہا۔

چھری بھائی جان کے ہاتھ میں آتے ہی چندو کی آنکھوں سے خوف غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ واضح طور پر محبت جیسا کوئی جذبہ لہریں لینے لگا۔ وہ اٹھا' اس نے

بیٹھے ہوئے بھائی جان کے کندھوں پر دونوں اگلے پیر رکھے اور ان کے رخسار پر پیار کیا۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اس نے بھائی جان کو اس طرح پیار کیا ورنہ پیار کا یہ انداز صرف باجی کیلئے مخصوص تھا پھر وہ دوبارہ اسی طرح لیٹ گیا۔۔۔ سراپا سپردگی۔ سر تسلیم خم کئے۔۔

بھائی جان کا چھری والا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ "ایسے کیسے کام چلے گا جناب!" قسائی نے انہیں ٹوکا۔ "مضبوطی سے چھری پکڑیں۔ تینوں نسیں کاٹنا ہوں گی ورنہ جانور کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

یہ سنتے ہی بھائی جان کے ہاتھ کو قرار آ گیا' جیسے اندر سے کسی نے کہا ہو۔۔ ع ادب ناداں۔۔! انہوں نے دعا پڑھی۔ منہ پھیرا۔۔۔ یہ سوچ کر کہ وہ دیکھ کر تو یہ سب نہیں کر سکتے لیکن فوراً ہی انہیں احساس ہو گیا کہ بغیر دیکھے وہ چندو کی مشکل آسان نہیں کر سکتے۔ اس کی اذیت بڑھا دیں گے۔

انہوں نے اس کے گلے پر نظر جمائی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے بچ رہے تھے' جو نظر کے سامنے تھیں۔ انہوں نے پھر دعا پڑھی' تکبیر۔۔۔ اور چھری پھیر دی۔

دیکھنے والے آج بھی گواہی دیں گے کہ چھری پھرنے کے بعد چندو کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز ضرور نکلی لیکن چھری پھرنے سے پہلے نہ اس نے مزاحمت کی' نہ حلق سے کوئی آواز نکالی۔۔۔ باجی نے یہی حکم تو دیا تھا نا۔



اماں آ گئی تھیں۔ انہوں نے سب لوگوں کو بھیج دیا تھا۔ بھائی جان کو محلے کے کچھ لوگ لے گئے تھے۔ انہوں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

"اب کلیجی بھونو شمسہ۔" اماں نے کہا۔ "یہ تمہیں ہر حال میں کھانی ہے۔"

"اماں۔۔ اولاد کا کلیجا مائیں تو نہیں کھاتیں' ڈائنیں کھاتی ہیں۔" باجی نے فریاد کی۔

"قربانی کو رائیگاں کرنے والی باتیں مت کرو۔" اماں نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اماں۔"

گھر میں قصور کی میتھی نہیں تھی۔ باجی نے سوچا گلی میں موجود کسی بچے سے منگوا لیں گی۔ یہ سوچ کر انہوں نے دروازے سے جھانکا۔ ان کی دیوار سے لگا سات آٹھ سال کا ایک بچہ بیٹھا تھا۔ "کون ہو تم جی؟" باجی نے پوچھا۔ "پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

"میں اصغر ہوں۔" بچے نے روتے ہوئے کہا۔

باجی نے غور کیا تو انہیں خون نظر آیا۔ بچے کے پیر سے خون نکل رہا تھا۔

"اے ہے۔۔ یہ کیا ہوا؟"

"شیشہ لگ گیا شاید۔"

باجی باہر نکلیں۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ تلوا اچھا خاصا کٹا ہوا تھا۔ "چلو اندر' میں دھو کر دوا لگا دوں اور پٹی باندھ دوں۔" باجی نے کہا۔ اسی وقت انہیں عابد نظر آ گیا۔ "عابد' ملا جی کی دکان سے قصور کی میتھی کا ایک پیکٹ تو لا دے جلدی سے۔"

وہ بچے کو اندر لے گئیں۔ انہوں نے پاؤں کی صفائی کی' جو بڑا مشکل کام تھا۔ بچے کے پیر بہت گندے ہو رہے تھے۔ "کتنے گندے رہتے ہو۔ عید کے دن بھی نہیں نہاتے؟" باجی نے دوا لگاتے ہوئے کہا۔ "کپڑے بھی میلے چیکٹ ہو رہے ہیں۔"

بچہ رونے لگا۔ باجی نے پٹی نکالی اور زخم پر لپیٹنے لگیں۔ "کہاں رہتے ہو؟"

"کہیں نہیں یتیم ہوں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔"

باجی کرید کرید کر پوچھتی رہی۔ اصغر نے انہیں پوری کتھا سنا دی۔ "بقر عید کے دن بھی تمہیں گوشت نہیں ملا؟" باجی نے اچنبھے سے کہا۔

"کچے گوشت کا میں کیا کرتا امی۔۔"

امی سن کر باجی کا دل اس زور سے دھڑکا کہ بس پہلی بار کوئی انہیں امی کہہ رہا تھا۔ اور وہ بھی چندو کی قربانی کے ذرا ہی دیر بعد۔۔۔

"میں کہاں پکاتا اور پکا ہوا گوشت کسی نے دیا ہی نہیں۔"

"تو فکر نہ کر۔ ہفتہ بھر میرے پاس رہ میں تجھے جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی۔"

"مگر عید کی تیسری رات مجھے جانا ہے امی۔ میں اختر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

باجی سوچ رہی تھیں کہ اس بچے کو بیٹا بنا لیں گی لیکن دو بچے مسئلہ تھے۔

"ٹھیک ہے تیسری رات چلے جانا اور ہاں' کبھی پریشانی ہو تو میرے پاس آ جانا۔ اب میں تیرے لیے کپڑوں کا بندوبست کرتی ہوں۔ عید کا دن ہے بازار بند ہو گا ورنہ کپڑے دلاتی تجھے۔"

محلے میں اصغر جیسے کئی بچے تھے۔ باجی نے ایک جوڑا لیا اور بچے کو دیا۔ "جا نہا دھو کر پہن لو۔ اتنے میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

اصغر نہا کر کپڑے پہن کر واپس آیا تو باجی کلیجی بھون چکی تھیں۔ انہوں نے اسے کھلایا اور اس نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ اماں باجی کو کھانے کی تلقین کر رہی تھیں اور باجی کا یہ حال تھا کہ ہر لقمے پر رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔

بھائی جان نے بھی اماں کے اصرار پر تھوڑی سی کلیجی کھا لی لیکن ان کا بھی برا حال تھا۔

باجی نے اپنے حصے کا گوشت کسی کو نہیں دیا۔ انہوں نے اگلے تین دن تک اصغر کی گوشت سے اتنی تواضع کی کہ وہ گھبرانے لگا۔

عید کی دوسری رات باجی نے خواب دیکھا کہ ایک بہت خوب صورت شیرخوار بچہ بانہیں پھیلا کر ان کی طرف ہمک رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بول بھی رہا تھا۔ "امی--- مجھے گود میں لے لیں۔ میں آپ کا چندو ہوں۔ آپ میرا چاہے جو نام رکھ دیں' میں ہوں آپ کا چندو ہی۔ مجھے گود میں لے لیں۔"

"لیکن چندو میں نے تمہیں قربان کر دیا تھا۔"

"میں ایک بہت خوبصورت جگہ چلا گیا تھا امی! پھر کسی نے مجھ سے کہا' تم شمسہ بی کے پاس جاؤ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتیں جاؤ' جا کر انہیں بتا دو کہ اللہ پاک ان سے بہت خوش ہیں۔ پھر میں آپ کے پاس آ آیا۔ مجھے گود میں لے لیں امی---"

باجی خوشی سے رونے لگیں۔ انہوں نے بانہیں پھیلائیں اور بچے کو آغوش میں بھر لیا۔ "سچ ہے چندو مجھے تم سے بڑی محبت ہے لیکن اس روپ میں' میں تمہارا نام چندو نہیں' فہیم رکھوں گی---" اس کے ساتھ ہی باجی کی آنکھ کھل گئی۔ اسی لمحے موذن نے فجر کی اذان کا آغاز کیا۔

اماں نے یہ خواب سن کر کہا۔ "مبارک ہو شمسہ' اللہ پاک نے تمہارے لیے ایک بیٹا منظور فرمایا ہے۔"

اس رات اصغر رخصت ہونے لگا تو باجی نے اسے ایک نیا جوڑا دیا' چندو کی عیدی کے پیسے دیئے اور بھنے گوشت کی پوٹلی بنا کر اسے دی۔ "تم اور اختر اسے کھانا۔" انہوں نے کہا۔ "اور وہاں' کوئی پریشانی ہو تو یہاں آ جانا۔"

"شکریہ امی۔" اصغر نے کہا لیکن اس وقت وہ اختر کیلئے تڑپ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اختر کا بھی یہی حال ہے اور وہ ریاض احمد کے ساتھ اسی چورنگی پر پہنچنے والا ہے۔



دونوں دوست ایک ہی وقت میں بنگلے کے دروازے پر پہنچے۔ وہ سائیکلوں پر سوار تھے اور مختلف سمتوں سے آئے تھے۔ وہ بنگلا ریاض احمد کا تھا' جو انہوں نے عید کے کچھ ہی دن بعد خرید لیا تھا۔ انہوں نے وعدے کے مطابق انہیں سرونٹ کوارٹر میں رکھ لیا تھا۔

بنگلا ریاض احمد کا تھا لیکن سائیکلیں دونوں لڑکوں کی اپنی تھیں۔ وہ انہیں ریاض احمد نے خرید کر دی تھیں لیکن دونوں نے دو مہینے میں سائیکلوں کی قیمت انہیں واپس کر دی تھی۔ وہ کچھ بننے کی آرزو میں جینا سیکھ رہے تھے۔

"آج کچھ دیر ہو گئی۔" اختر نے سائیکل سے اترتے ہوئے کہا۔

"ہاں' اخبار ذرا دیر سے ملے تھے نا۔" اصغر نے کہا۔ "اب جلدی کرو۔ اسکول کو دیر نہ ہو جائے۔"

دونوں بنگلے میں داخل ہوئے اور اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگے۔ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے ریاض احمد نے انہیں پکارا۔ "اختر--- اصغر۔" آج دکان پر ذرا جلدی آ جانا۔ نواز آج چھٹی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی آ جائیں گے۔" دونوں نے بیک آواز کہا پھر وہ کوارٹر کی طرف لپکے۔ اسکول کیلئے بھی تیار ہونا تھا۔



باجی یوں گھبرائی ہوئی بیٹھی تھیں جیسے عدالت میں ہوں اور ان کے متعلق فیصلہ سنایا جانے والا ہو۔ لیڈی ڈاکٹر انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ اتنی پریشان اور نروس کیوں ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے ڈاکٹر۔"

"اب آپ کو پریشانیوں اور اعصابی دباؤ سے چھٹکارا پانا ہو گا۔ بہت احتیاط کرنی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مبارک ہو۔ آپ ماں بنیں گی۔ بس اپنا خیال رکھئے۔"

باجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اللہ ––– تیرا شکر ہے۔" انہوں نے زیر لب کہا۔ تصور میں چندو نے ان کے دونوں کندھوں پر اپنے اگلے پیر رکھے اور ان کے رخسار چومنے لگا۔ "مبارک ہو امی!" اس کی انسانی آواز انہوں نے واضح طور پر سنی ––– بچے کی آواز! شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ "شکریہ میرے بچے ––– میرے لال۔" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

لیڈی ڈاکٹر نے چونک کر انہیں دیکھا پھر وہ بھی مسکرا دی۔ برسوں کے بعد خوشی ملے تو ایسا ہوتا ہے۔

ختم شد

نذرِ توفیق

وہ ہفتے کی صبح تھی۔ چوہدری محکوم اللہ معمول کے مطابق صبح پانچ بجے بیدار ہوا۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے وضو کیا۔ نماز کے لئے مسجد جانے سے پہلے اس نے اپنی بیوی رحمت کو جگا دیا۔ پھر وہ گھر سے نکل آیا۔

گلی سنسان تھی۔ ہر روز کی طرح اسے اس صبح بھی بہت قلق ہوا۔ دنیا نئی صدی اور نئے ہزاریے میں داخل ہونے والی ہے۔ مگر آدمی .... مسلمان کتنا پیچھے چلا گیا ہے۔ اسے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی یاد آئی' جب وہ دس سال کا تھا۔ اس وقت ابا زندہ تھے۔ وہ اسے صبح پانچ بجے جگا دیتے تھے۔ وہ بہت کڑھتا تھا.... برا مانتا تھا کہ ابا اسے نیند پوری نہیں کرنے دیتے۔ اس پر ابا کہتے ..... دیکھ محکوم اللہ' انسان کے جاگنے کا یہی وقت ہے۔ پرندے بھی اسی وقت جاگتے ہیں اور اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ پھر رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں اور تو اور میں ہی نہیں' سب لوگ اسی وقت اٹھتے ہیں۔ سب نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ پھر ناشتے کے بعد رزق کی جستجو کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ برکت دیتا ہے۔

اور یہ سچ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھروں کے دروازے کھلتے' لوگ ٹوپیاں سروں پر رکھے نماز کے لئے نکلتے نظر آتے۔ ننھا چوہدری دل ہی دل میں آہ بھر کے رہ جاتا تھا۔ پھر وہ ابا کے ساتھ نماز پڑھ کر باہر آتا تو دکانیں کھلنے لگتیں۔ ابا کو پتا تھا کہ اسے مکھن بہت پسند ہے۔ چنانچہ وہ دودھ والے کی دکان سے دودھ' ڈبل روٹی اور مکھن بنیے پرچون والے سے چینی اور چائے کی پتی خریدتے' گھر پہنچتے پہنچتے چہل پہل شروع ہو چکی ہوتی۔

پر اب ایسا نہیں ہے۔ چوہدری نے سوچا اور ایک دل دوز آہ بھری۔ اس نے قریب ہی سوئے ہوئے ایک کتے کو بے حد ڈسٹرب کیا۔ کتے نے نیند خراب ہو پر بھونک کر صدائے احتجاج بلند کی' جیسے اس بات پر سخت برا مانا ہو۔ برا چوہدری کم نہیں مانا تھا۔ اس نے کتے کو ہنکارتے ہوئے کہا "تو میری گلی کا کتا ہو کر مجھ بھونکتا ہے۔ چل' پڑا سوتا رہ جھوٹی ہڈی کھانے والے۔"

چوہدری محکوم اللہ کو افسوس ہوتا تھا کہ اکیسویں صدی اور تیسرا ہزاریہ ش ہونے سے پہلے ہی کتے اتنے بدقماش ہوگئے ہیں کہ جاننے والوں پر بھونکنے سے نہیں چوکتے۔ بلکہ موقع ملے تو کاٹ بھی لیتے ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ افسوس چوہد کو اپنے ہم جنسوں پر ہوتا تھا۔ صبح بیدار ہونے کے وقت پوری بستی سو رہی ہو ہے۔ گلیاں اور سڑکیں یوں سنسان ہوتی ہیں' جیسے یہ آدھی رات کا وقت ہو اور پہنچنے پر فجر کی نماز میں امام صاحب کے پیچھے چھ سے لے کر آٹھ نو تک نمازی ہو ہیں اور واپسی پر بھی یہی حال ہوتا ہے۔ سب دکانیں بند' گلیاں اور سڑکیں سنسا کہیں آدم نہ آدم زاد۔ ہاں کتے جاگ چکے ہوتے ہیں اور کوڑے دانوں کو کھنگا رہے ہوتے ہیں۔ جنہیں کچھ نہیں ملتا' وہ زور آور ہوں تو نمازیوں کو جھنجھوڑنے جیتی جاگتی ہڈی وصول کرنے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ انہیں چھوڑو .... انسانوں ک ہوگیا ہے۔ دس بجے سے پہلے کسی کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ نہ کوئی دکان دار نہ خریدا حد ہے کہ گاڑیاں بھی نہیں چل رہی ہوتیں۔ کیا بنے گا اس قوم کا۔ یہ چا راکٹ پر بیٹھ کر داخل ہو یا گدھا گاڑی پر' یہ طے ہے کہ اکیسویں صدی اور تیس ہزاریے میں یہ قوم سوتی ہوئی داخل ہوگی۔ اور اٹھے گی تو نئی صدی اور نئے ہزار کے بیس تیس سال ضرور گنوا چکی ہوگی۔

چوہدری محکوم اللہ نے اپنی گلی پار کی اور دوسری گلی میں داخل ہوا۔ وہ کچھ چلا تھا کہ اس کا جی خوش ہوگیا۔ ذرا آگے ایک دروازہ کھلا۔ کوئی مرد باہر آیا۔ لمحے وہ دروازے پر کھڑا کسی سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر میں چوہدری اس تک پہنچ تھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور باہر نکلنے والے نے اس طرف کا رخ کیا' ج سے چوہدری آرہا تھا۔

قریب سے چوہدری نے اسے دیکھا اور پہچان لیا۔ پہچان کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔ وہ تو اسی کی گلی میں رہنے والا نکما نوجوان افضال تھا۔ افضال کے باپ کا کہنا تھا کہ وہ دوپہر بارہ ایک بجے سے پہلے اٹھتا ہی نہیں ہے۔

افضال کو سوا پانچ بجے صبح بیدار دیکھ کر چوہدری کو خوشی ہوئی۔ دل میں امید پیدا ہوئی کہ قوم کی زندگی میں انقلاب بھی آسکتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں افضال اسے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ ایسا کہ اسے سلام کرنا بھی بھول گیا۔

لیکن چوہدری محکوم اللہ اس وقت امید کی خوشی سے سرشار تھا۔ اس نے خود ہی سلام کرلیا۔ افضال نے سلام کا جواب دیا تو چوہدری نے کہا "بیٹے .... یہ تو حشمت کا گھر ہے نا' تو یہاں کیسے؟"

"حشمت بھائی کی طبیعت خراب تھی انکل' میں ان کی مدد کے لیے آیا تھا" افضال نے کہا۔

"بہت اچھا کیا تھا۔ مسلمان کو مسلمان کی عیادت کرنی چاہیے۔ جماعت نکلنے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بھی ابھی حشمت کی مزاج پرسی کرتا۔ خیر نماز کے بعد واپسی میں سہی۔"

افضال گھبرا گیا "یہ غضب نہ کرنا انکل!"

چوہدری' افضال کی سحر خیزی کے کار عظیم کو سراہنے کے باوجود اس بات پر برا مان گیا "غضب کیسا' اللہ کا حکم ہے یہ تو۔"

"میرا مطلب ہے انکل' کہ حشمت بھائی رات بھر درد سے تڑپتے رہے ہیں۔ ابھی نیند آئی ہے۔ آپ جگائیں گے تو انہیں تکلیف ہوگی۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" چوہدری نے سر ہلا کر کہا۔ "عیادت کے نام پر تکلیف پہنچانا تو ٹھیک نہیں۔"

"میں چلتا ہوں انکل!" افضال نے کہا اور اپنے گھر کی .... یعنی چوہدری کی گلی کی طرف چل دیا۔

چوہدری اپنی راہ پر چل دیا۔ مگر افضال کے معاملے میں کوئی خلش اسے ستا رہی تھی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ سمجھنے میں دیر اس لیے لگی کہ وہ حشمت کی

بیماری میں الجھا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ چوہدری کو یہ لفظ انکل بہت برا لگتا تھا۔ چاچا' ماما' دادا اور نانا میں جو مٹھاس اور اپنائیت تھی' یہ اس سے محروم تھا۔ دوسرے یہ کہ انکل کوئی کسی کو بھی کہہ دیتا تھا۔ اس خطاب کے لئے نہ عمر کی کوئی تخصیص تھی' نہ مقام اور مرتبے کی اور نہ پیشے کی۔ ہر دکان دار انکل تھا' جمعدار انکل تھا' پچیس برس کا جوان بھی انکل تھا اور ۸۰ برس کا بوڑھا بھی انکل تھا اور اس انکل کا کسی جذبے سے' کسی رشتے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

وہ مسجد پہنچا تو جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی سے سنتیں پڑھیں۔ سلام پھیرا تو جماعت کھڑی ہو رہی تھی۔ امام صاحب کے چہرے کو دیکھ کر اسے دن کی گزشتہ روز کی تقریر کا خیال آگیا۔ جمعے کی نماز سے پہلے امام صاحب نے بہت ایمان افروز تقریر کی تھی' بہت روشن باتیں بتائی تھیں۔ اس نے تقریر سن کر فیصلہ کیا تھا کہ ان باتوں پر عمل کرکے اپنی عاقبت سنوارے گا۔ لیکن افسوس کہ وہ بھول گیا۔ اب وہ انہیں یاد رکھے گا' کبھی نہیں بھولے گا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔

نماز کے بعد وہ باہر نکلا تو امام صاحب کی تقریر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ ارے ایسی ایک تقریر تو آدمی کی زندگی بدل دیتی ہے اور مجھے دیکھو کہ عہد کرکے بھول گیا۔ کچھ یاد ہی نہیں۔

ایسا نہیں کہ چوہدری محکوم اللہ کی یادداشت خراب ہو۔ اس کی یادداشت پر جو بات ریکارڈ ہو جاتی' کبھی نہیں مٹتی تھی۔ بس ایک خرابی تھی۔ اس کی یادداشت دور جدید کے ٹیپ ریکارڈ کی سی نہیں تھی۔ بلکہ وہ پرانے زمانے کے گراموفون ریکارڈ جیسی تھی۔ اور دشواری یہ تھی کہ اس کی سوئی والے کریڈل میں خرابی تھی۔ خرابی بھی کوئی بڑی نہیں تھی۔ بس وہ کریڈل خود کار بھی تھا اور خود مختار بھی۔ وہ اپنی مرضی سے ریکارڈ پر کہیں بھی جا ٹکتا اور ریکارڈنگ شروع ہو جاتی۔ اگر وہ چاہتا کہ ریکارڈ کے آغاز پر سوئی ٹکے تو یہ ممکن نہ ہوتا۔ ہاں کبھی کریڈل کا موڈ ہوتا تو یہ بھی ہو جاتا۔ اس بات سے چوہدری بہت پریشان تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گھبراتا۔ اسی لیے وہ مطلوبہ یاد کی سمری پر زور دیتا۔

لیکن امام صاحب کی تقریر کی بات اور تھی' وہ بہت اہم تھی۔ گھر جاتے ہوئے اس نے مطلوبہ ریکارڈ پر کریڈل رکھا۔ سوئی کہیں درمیان میں ہی ٹکی۔ امام صاحب کی آواز اس کی سماعت میں گونجنے لگی" ..... اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو راہ میں پڑا کانٹا یا پتھر ہٹا دو' کوئی تکلیف وہ رکاوٹ دور کردو۔ یہ بھی صدقہ ہے اور اپنے بھائی کے لئے کچھ نہ کرسکو تو اسے ایک بے غرض تبسم سے نواز دو۔ یہ بھی صدقہ ہے۔"

چوہدری جھنجلا گیا۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے کیا کہا تھا امام صاحب نے ؟ مگر سوئی ریکارڈ کے آغاز پر ٹک ہی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ وہ سمری کی طرف لپکا۔ امام صاحب کا اس تقریر میں سارا زور نیکی پر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آدمی کو بے ساختہ اور بے غرض نیکی کرنی چاہیے۔ وہ دکھاوا نہ ہو۔ اس کا مقصد لوگوں سے داد وصول کرنا' ان کے تئیں نیک سمجھے جانا نہ ہو اور انہوں نے آخر میں کہا تھا کہ اگر پوری زندگی میں انسان کی ایک ..... صرف ایک نیکی بھی اللہ کو خوش کرنے والی ہو تو اس کے دونوں جہان کے دلدر دور ہو جاتے ہیں۔

اس سمری نے چوہدری کو کچھ مطمئن کردیا۔ یہ ہوئی نا بات۔ اس نے دل میں کہا۔ یہی تو میں نے ارادہ کیا تھا کہ اب باقی زندگی ایسی ایک نیکی کی جستجو کرتا رہوں گا۔ کئے جاؤں گا لیکن پانچ منٹ بعد میں بھول گیا تھا۔ خیر..... اب نہیں بھولوں گا۔ لفظ نیکی کو اپنے دماغ پر سوار کرلوں گا۔

سو چوہدری محکوم اللہ بے غرض نیکی کے تصور میں سرشار اپنے گھر کی طرف بڑھتا رہا۔ گھر جاتے ہوئے وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ اب وہ تیس فٹ چوڑی سڑک پر چل رہا تھا۔ اچانک اسے پوری سڑک پر خار دار جھاڑیاں بڑی ترتیب سے پھیلی نظر آئیں۔ کسی نے وہ جھاڑیاں دانستہ سڑک پر ترتیب سے پھیلائی تھیں۔ کسی بھی راہ گیر کا دامن ان میں الجھ سکتا تھا۔ خراش بھی لگ سکتی تھی اور پیروں میں کانٹا بھی چبھ سکتا تھا۔

بے غرض نیکی کی خواہش نے چوہدری کے دل کو گداز کردیا تھا۔ کانٹوں والی جھاڑیوں سے انسانوں کو ضرر پہنچنے کا تصور کرتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر اسے ان لوگوں پر غصہ آگیا' جنہوں نے خلق خدا کو ضرر پہنچانے کا یہ سامان کیا تھا۔

چلو، آدمی نیکی نہ کرے تو نہ کرے لیکن ایسی کھلی بدی سے تو بچے۔ اور تیسرے مرحلے میں اس کا دل خوش ہوگیا۔ راہ سے ایک کانٹا ہٹانا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ یہاں تو سینکڑوں کانٹوں والی نیکی نصیب ہو رہی تھی۔

چنانچہ چوہدری نے جھک کر وہ جھاڑیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔ یہاں سے وہاں تک جھاڑیاں سمیٹنے میں کئی بار اس کے ہاتھوں میں کانٹے چبھے۔ ہر بار اس کے دل میں سچی اور خوب صورت خوشی کی ایک لہر ابھری۔ میری نیکی اور معتبر ہو رہی ہے۔

خار دار جھاڑیاں سمیٹ کر وہ سڑک سے ملحقہ گھر کی دیوار کے ساتھ لگا ہی رہا تھا کہ کسی نے اسے للکارا "او چاچا...... یہ کیا کر رہا ہے ؟"

سڑک پر کوئی اور موجود ہی نہیں تھا کہ چوہدری گمان کرتا کہ کسی اور کو پکارا جا رہا ہے۔ اس کا دل خوش ہوگیا۔ مدت کے بعد کسی نے چاچا کہہ کر پکارا تھا...... خراب لہجے میں سہی، پکارا تو تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اور تیور بڑے خراب تھے۔ وہ قریب آیا تو چوہدری نے نہایت حلیمی سے کہا "خدا کی اذیت کا سامان اور راہ کی رکاوٹ دور کر رہا ہوں۔"

وہ شخص اب اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا "خاک دور کر رہے ہو۔ خلق خدا کی موت کا سامان کر رہے ہو تم۔" اس نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

چوہدری بھونچکا سا رہ گیا۔ یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"نیچے تو دیکھو، شاید سمجھ میں آجائے کہ یہ کانٹے یہاں کیوں بچھائے گئے تھے۔"

چوہدری نے دیکھا وہ ایک اسپیڈ بریکر تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "مجھے تو یہ بھی رکاوٹ لگ رہی ہے۔" اس نے کہا "اس سے کسی کو بھی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔"

اس شخص نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے پرلے درجے کا جاہل سمجھ رہا ہو۔ "اللہ کے بندے، کس دنیا میں رہتے ہو۔ اس سڑک پر چہل پہل رہتی ہے۔ بچے بھی کھیلتے ہیں اور گاڑی والے اندھا دھند گاڑی چلاتے ہیں۔ کبھی کسی کی جان بھی چلی

جاتی ہے۔ گاڑیوں کی رفتار کم کرنے کے لئے کل یہ اسپیڈ بریکر بنایا ہے کے ایم سی والوں نے۔"

"تو یہ کانٹے بھی انہوں نے بچھا دیے ؟"

"نہیں۔ یہ تو میں نے بچھائے ہیں نیکی سمجھ کر۔"

چوہدری کے لئے وہ مقام عبرت تھا۔ راہ میں کانٹے بچھانا بھی نیکی ہے ؟ استغفراللہ! اس میں کیا مصلحت ہے بھائی ؟" اس نے پوچھا۔

اس شخص نے ملامت بھری نظروں سے چوہدری کو دیکھا۔ "ابھی یہ اسپیڈ بریکر کچا ہے۔ اس پر سے گاڑیاں گزریں یا لوگ ہی پاؤں رکھ کر گزریں تو یہ زمین سے مل جائے گا۔ ایسا ہوا تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ گاڑیاں پھر اسی طرح بے لگام دوڑیں گی اور معصوم بچے زندگی سے محروم ہوتے رہیں گے۔ اس لئے میں نے کے ایم سی والوں کے جاتے ہی یہ کانٹے لاکر بچھا دیے۔ پھر میں چوکیداری کرتا رہا۔ دو بجے میں گھر گیا۔ نیند ہی نہیں آئی۔ میں یہاں اسی لئے چلا آیا کہ کوئی کانٹے نہ ہٹا دے۔ اچھا ہی ہوا، ورنہ تم نے تو کام کر دیا تھا۔" اس کے لہجے میں بھی ملامت در آئی۔

چوہدری کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یہ شخص اس کی نیکی کو بدی بنائے دے رہا تھا۔ عجیب آدمی تھا "تم اس کی فکر میں رات بھر نہیں سوئے ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نیند تو ویسے ہی مجھ سے روٹھ گئی ہے" اس شخص نے کہا اور رونے لگا، پھر بولا "ابھی ایک ہفتہ پہلے ایک بدمست گاڑی نے میرے بچے کو کچل دیا تھا۔ تب سے مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ کسی اور کے بچے کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ میں اس اسپیڈ بریکر کو کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔" پھر وہ کانٹے اٹھا کر دوبارہ سڑک پر پھیلانے لگا۔

چوہدری کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ واقعی یہاں تو کانٹے ڈالنا اور ان کی حفاظت کرنا نیکی کا کام تھا۔ ان کانٹوں کو ہٹانا تو زیادتی تھی۔ "میں شرمندہ ہوں بھائی !" اس نے اس شخص سے کہا اور دل گرفتہ سا آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چل کر اسے خیال آیا کہ اسے کانٹے بچھانے میں اس شخص کی مدد کر کے نیکی کمانی چاہیے تھی۔ اس نے

پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص کانٹے بچھا چکا تھا۔

چوہدری محکوم اللہ بے حد دل گرفتہ تھا۔ نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اس کی کوشش ہی بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ اور وہ بھی صبح ہی صبح۔ اب پورا دن گزرے گا۔ کچھ نہیں ...... اس نے بے پروائی سے سوچا۔ میں پورے دن کو کرتا رہوں گا۔

وہ چند قدم چلا ہوگا کہ اسے دوسرا موقع مل گیا۔ سامنے سے ایک بھکارن آرہی تھی۔ اس کے قریب آکر اس نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ " سیٹھ، مجھے کچھ دیتا جا۔"

چوہدری نے بے ساختہ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر جیب خالی تھی، خالی ہاتھ جیب سے نکالتے ہوئے اسے خیال آیا کہ نیکی تو وہ اب بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے نشین انداز میں مسکرایا۔

بھکارن اب بھی ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی "سیٹھ ...... روپیا دو روپے دے جا اللہ کے نام پر" اس نے کہا۔ مگر جیب سے خالی ہاتھ باہر آتے دیکھ کر اس کا منہ گیا۔

"میں گھر سے نماز کے لئے نکلا تو خیال ہی نہیں آیا کہ جیب میں کچھ پیسے ڈال لوں۔" چوہدری نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

بھکارن نے خالی ہاتھ کے بعد ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو اسے اور تاؤ آیا۔ "تو مسکرا کیوں رہا ہے سیٹھ ؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"اس وقت تو میرے پاس یہی کچھ ہے صدقہ کرنے کے لئے۔" چوہدری نے بے حد خلوص سے کہا۔

"تو جیب سے خالی ہاتھ نکال کے اور مسکرا کے کیا کہنا چاہتا ہے سیٹھ، میں سمجھتی ہوں۔" بھکارن نے تیز لہجے میں کہا۔ "لیکن تو بوہنی والا ہے۔ دیکھ میرا دن خراب ہو جائے گا۔ ایک روپیا ہی دے دے اللہ کے نام پر"

بھکارن تو اپنے تجربے کے مطابق سمجھ گئی تھی۔ لیکن چوہدری محکوم اللہ نہیں سمجھا کہ بھکارن کیا کہہ رہی ہے۔ اس وقت تو وہ ایک بے غرض نیکی کرنا چاہتا

تھا اور اللہ کے نام پر اپنی جان بھی قربان کرسکتا تھا۔ دوسرے وہ خود دکان دار تھا۔ بوہنی کی اہمیت خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اور زیادہ خلوص سے کہا۔ "جیب خالی ہے تو کوئی بات نہیں۔ گھر میں میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے تو میرے ساتھ گھر چل۔ میں تجھے خوش کردوں گا۔ پورے دن تجھے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کسی سے۔"

یہ سن کر تو بھکارن بری طرح بھڑک گئی "یہ مسکراہٹ تو صدقہ کر اپنی بیوی کو .... اپنی دھی کو۔ اور گھر لے جاکر کسی رنڈی کو۔ میں ایسی ویسی نہیں۔ بھیک مانگتی ہوں، عزت سے۔ عزت نہیں بیچتی اپنی۔ جا اپنا کام کر۔"

چوہدری بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ "یہ بات نہیں۔ دیکھ میرے گھر میں بیوی ہے ..... بچے ہیں ....."

"میں جانتی ہوں۔ سب یہی کہتے ہیں۔ مگر گھر چھڑوں کا نکلتا ہے۔ جا سیٹھ، رش کا وقت ہوتا تو میں چلاتی اور تیری پھینٹی لگ جاتی۔ شکر کر کہ یہ سوتے کا وقت ہے۔ چلا جا، ورنہ میں ایسا شور مچاؤں گی کہ سوتے ہوئے لوگ بھی گھروں سے نکل پڑیں گے۔"

چوہدری کے دیوتا کوچ کر گئے کوئی اور ہو نہ ہو، کانٹوں کی چوکیداری کرنے والا تو موجود تھا اور پہلے ہی اسے ایک قبیح حرکت کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ چکا تھا۔ اب وہ رکتا تو دو منٹ میں پورے محلے میں اس کی بدنامی ہو جاتی۔ چنانچہ وہ دم دبا کر نکل لیا۔ دور تک اسے بھکارن کی گالیوں اور کوسنوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

چوہدری بے حد مایوس تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اس کی دو کوششیں ناکام ہوچکی تھیں۔ بلکہ دوسری کے نتیجے میں تو عزت بھی بال بال بچی تھی۔ مولوی صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نیکی کرنا آسان ہوتے ہوئے بھی آسان نہیں لیکن آدمی کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ انہوں نے فارسی کا ایک مصرع بھی پڑھا تھا ..... ایں سعادت بزور بازو نیست۔

چوہدری محکوم اللہ نے فارسی نہیں پڑھی تھی۔ لیکن وہ فارسی کو اردو کی بہن مانتا تھا اور فارسی اس کی سمجھ میں خوب آتی تھی۔ اس نے اس مصرعے کا مطلب بھی

سمجھ لیا تھا۔ جس نیکی کے لئے زور بازو کی ضرورت پڑے' وہ نیکی نہیں' بلکہ نیکی ہے۔

انہی خیالوں میں غلطاں وہ دوسری گلی میں مڑا تو اس کا جی خوش ہوگیا۔ حشمت دودھ کی تھیلی لئے اپنے گھر کی طرف آرہا تھا۔ چلو ..... عیادت کی نیکی تو مل گئی۔ چوہدری نے سوچا۔ عیادت بھی بڑے اجر والا کام ہے۔ چنانچہ قریب آنے پر اس نے بڑے تپاک سے سلام کیا۔ سلام کا جواب ملتے ہی وہ شروع ہوگیا "اس ----- میں دودھ لانے کے لئے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو تمہاری عیادت کے لئے آنے ہی والا تھا۔ مجھ سے کہہ دیتے' میں لادیتا۔ اب طبیعت کیسی ہے تمہاری ؟"

حشمت کے چہرے پر الجھن کا تاثر ابھرا "میری طبیعت تو ویسی ہی ہے' جیسی تھی۔ اور آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں' میری عیادت۔؟"

چوہدری نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے' رات بھر کی تکلیف کے بعد آدمی سوئے ...... اور پھر اسے دودھ لانے کے لئے اٹھنا پڑے تو اور کیا ہوگا۔ اس کا دل افسوس اور محبت سے بھر گیا۔

"..... اور دودھ تو میں روز لے کر آتا ہوں ..... کام سے واپس آتے ہوئے" حشمت نے اپنا جملہ پورا کیا۔

"تم کام سے واپس آرہے ہو ؟" چوہدری نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں چوہدری صاحب۔ رات کی شفٹ ہے نا میری۔"

"پر آج تو چھٹی کی ہے نا تم نے ؟" چوہدری نے کہا۔ پھر پوچھا "بہت زیادہ طبیعت خراب ہوگئی تھی تمہاری ؟"

"یہ کس نے کہا آپ سے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ؟"

"مجھے افضال نے بتایا تھا کہ تم رات بھر درد سے تڑپتے رہے ہو۔"

"کون افضال ؟" حشمت نے اسے گھورا۔

"وہ جوان لڑکا' جو ہماری گلی میں رہتا ہے۔ مرزا صاحب کا بیٹا !"

"تو اسے کیسے پتا چلا کہ میں بیمار ہوں اور کام پر جانے کی بجائے درد سے تڑپ

رہا تھا ؟" حشمت نے معترضانہ لہجے میں پوچھا۔

چوہدری کو یقین ہوگیا کہ حشمت بڑی اذیت میں رہا ہے۔ ایسے میں یادداشت پر برا اثر تو پڑتا ہے۔ وہ افضال کو بھی بھول گیا۔ سو چوہدری نے بے حد درگزر کرنے والے لہجے میں حشمت سے کہا "یاد نہیں' افضال تمہاری مدد کرنے کے لئے تمہارے گھر آیا ہوا تھا۔ تم درد سے تڑپ رہے تھے تو وہ تمہارے پاس بیٹھا تھا۔"

اچانک حشمت کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں پوری طرح کھل گئیں "افضال میرے گھر آیا ہوا تھا .... یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟"

"میں نماز کے لئے جا رہا تھا اور وہ اسی وقت تمہارے گھر سے نکل رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ تم رات بھر درد سے تڑپتے رہے ہو۔"

"میں بالکل بیمار نہیں ہوں چوہدری صاحب۔ آپ گھر جاؤ' میں اس خبیث کو ابھی دیکھ لوں گا اور اس کٹنی کو بھی۔"

چوہدری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس وقت وہ ہاتھ مل رہا تھا کہ عیادت بھی نصیب نہیں ہوئی اور یہ الجھن الگ کہ یہ ماجرا کیا ہے اور خبیث کون ہے اور کٹنی کون ہے۔ پیچھے گلی میں حشمت اپنے گھر کے دروازے کو یوں دھڑ دھڑا رہا تھا' جیسے توڑ ڈالے گا۔

چوہدری اپنی گلی میں داخل ہوا۔ اپنے گھر کے سامنے والے مکان سے اس نے لال دین کو نکلتے دیکھا۔ لال دین وہ شخص تھا جسے دیکھتے ہی چوہدری کو غصہ آجاتا تھا اور وہ اسے بکثرت دیکھنے پر مجبور تھا۔ اس غصے کی وجہ لال دین نہیں' اس کا مرغی خانہ تھا۔ لال دین کے پاس سامنے کے چار پلاٹ تھے۔ ان پر اس نے اپنے مکان کے ساتھ ایک مرغی خانہ بنا رکھا تھا۔ مرغیوں کی بدبو سے کوئی اور عاجز ہو نہ ہو' چوہدری بے حد عاجز تھا۔ اس نے سر توڑ کوشش کی تھی کہ مرغی خانہ بند کرا دے لیکن اس مقصد میں اسے اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ الٹا ان کوششوں کی وجہ سے اس کے اور لال دین کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی جو کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

لال دین اسی وقت سو کر اٹھا تھا۔ کبھی وہ انگڑائی لیتا اور کبھی جماہی۔ چوہدری کو دیکھا تو اس کے چہرے پر کراہت آئی اور اس نے نتھنے سکیڑ کر یوں ظاہر کیا جیسے

اچانک بدبو آنے لگی ہو پھر اس نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ چوہدری کے لئے ہر روز کا معمول تھا۔ وہ شاید اسے سلام کے مترادف سمجھتا تھا۔

چوہدری کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ کہتا تھا جیسی روح ویسے فرشتے۔ جو شخص پڑوسیوں کے حقوق پامال کرے گا' ان کی اذیت کا سامان کرے گا' اس کا سلام تو ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ وہ اس سلام کا جواب بھی ضرور دیتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ لال دین چہرے پر کراہت کا تاثر لاکر' نتھنے سکیڑ کر اور منہ اور ناک پہ ہاتھ رکھ کر گویا اسے اللہ کی رحمتوں سے نوازے جانے کی دعا کرتا ہے۔ سو وہ اس کا جواب عربی میں نہیں بلکہ اردو میں دیتا تھا۔ چنانچہ اس روز بھی اس نے ہمیشہ کی طرح کہا "تجھ پر بھی اللہ کی رحمت ہو لال دین" اس طرح اس نے لال دین کی طرف سے زبردستی اللہ کی رحمت کی دعا وصول کرلی۔ مگر اس کا اگلا جملہ خاصا اشتعال انگیز تھا "اور سنا لال دین تیری ناک تو لگتا ہے' ٹھیک ہوگئی ہے۔"

"ناک تو میری ہمیشہ سے ٹھیک ہے اللہ کے حکم سے" لال دین نے بڑے ... سے کہا۔ "اللہ کے حکم سے" اس کا تکیہ کلام تھا۔

"مگر اپنی مرغیوں کی بدبو تو تجھے آج آئی ہے۔"

"مرغیوں کی بدبو! میرا تو مچھلیوں کی بساند .... بلکہ سڑاند سے دماغ پھٹا جاتا ہے" لال دین نے کہا۔

یہ چوہدری پر صاف صاف طنز تھا۔ کیونکہ چوہدری کی کلفٹن پر دکان تھی جہاں وہ تلی ہوئی مچھلی بیچتا تھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تیری دور کی ناک تیز ہے قریب کی ماؤف ہوچکی ہے" چوہدری نے بڑے رسان سے' عالمانہ شان سے ... کیونکہ لال دین کی جہالت اس پر اظہر من الشمس تھی۔ اس لیے تجھے اتنی دور ... سمندر سے مچھلیوں کی بساند تو آجاتی ہے' گھر میں موجود مرغیوں کی سڑاند کا پتا نہیں چلتا۔

"سمندر سے مچھلیوں کی بساند کبھی نہیں آتی دس جماعت پاس جاہل!" لال دین نے بے حد حقارت سے کہا "وہ تو باسی مچھلیوں سے آتی ہے۔ باسی مچھلیاں بیچنے والوں کے جسموں سے آتی ہے اور ایسی آتی ہے کہ دماغ پھٹنے لگتا ہے اللہ ...

یہ سن کر چوہدری مشتعل ہوگیا "گھر میں اسٹور کرنا تو کجا' میں تو گھر میں مچھلی نہیں لاتا۔"

"سڑی بسی چیز نہ کوئی خود کھاتا ہے' نہ اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہے اللہ کے حکم سے۔"

چوہدری نے اس جملے کو نظرانداز کیا اور اپنی بات جاری رکھی "میں تیری طرح نہیں ہوں کہ اپنا بدبو دار مرغی خانہ پورے محلے کے سر پر لاد رکھا ہے۔ تو پڑوسیوں کے لئے موذی ہے' موذی۔"

"بدبو دار مرغی خانہ!" لال دین نے برا ماننے کی اداکاری کی "میں ولایتی عطر کے ڈرم کے ڈرم لاتا ہوں۔ اس سے مرغی خانہ بھی دھوتا ہوں اور مرغیوں کو بھی نہلاتا ہوں۔ مجھ سے بدبو کی شکایت آج تک کسی نے نہیں کی۔ لیکن تیرے جسم کی بدبو سے سب عاجز ہیں۔ لحاظ میں کچھ نہیں کہتے۔ جس روز تو لائف بوائے سے بھی نہالے تو محلے کے تمام چھوٹے بڑے' عورتیں اور مرد شکر کے نفل پڑھتے ہیں اللہ کے حکم سے۔"

چوہدری غصے میں آپے سے باہر ہوگیا "تیرا یہ مرغی خانہ غیر شرعی' غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہے لال دین!"

"مجھے کبھی قانون نے بھی نہیں ٹوکا اس پر" لال دین نے فخر سے سینہ تان کر کہا "تو نے سب کچھ تو کرلیا۔ مجھے ایک نوٹس بھی نہیں ملا آج تک اللہ کے حکم سے محکوم ہے' محکوم ہی رہے گا۔"

"میں محکوم ہوں اللہ کا۔ محکوم اللہ میرا نام ہے۔ مگر میں تیرے باپ کی پیش بینی اور مردم شناسی کو سلام کرتا ہوں' جس نے تیرے پیدا ہوتے ہی بھانپ لیا کہ اس کے ہاں ایک بے دین پیدا ہوگیا ہے۔ اسی لئے تیرا نام لال دین رکھا۔"

اب کے اشتعال لال دین کو آیا "کیوں .... کیا خرابی ہے اس نام میں' اللہ کے حکم سے؟"

"میں نے کب کہا کہ خرابی ہے۔ میں تو تعریف کر رہا ہوں اس کی۔ تیرا نام سن

کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تو سرخا ہے ...... کمیونسٹ ہے۔ سالے دہریے کہیں کے۔

یہ سرخا' کمیونسٹ' دہریا۔ یہ لال دین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس نے بڑ کر کہا "پھر بکنے لگا اول فول۔"

تیری صورت دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی تیری حاجت رفع نہیں ہوئی۔ جا بیت الخلا میں جا۔ وہاں بیٹھ کر سوچ کہ دین کبھی لال ہوا ہے ؟ یہ تو بے دینوں کا کل جاہل !" یہ مقطع پیش کرکے چوہدری تیزی سے اپنے گھر میں چلا گیا۔ ادھر لال دین اپنے گھر میں گھستے ہی بڑی سعادت مندی سے بیت الخلا کا رخ کیا۔

چوہدری اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بیوی نے پوچھا "ناشتا لاؤں جی ؟" حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ابھی چوہدری بیس منٹ تک ناشتا نہیں کرسکے گا۔

"ابھی رہنے دو۔" چوہدری نے نرم لہجے میں کہا۔

چوہدری بیٹھا لال دین اور اس کے مرغی خانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس بارے میں سوچتا تو اسے ہمیشہ غصہ آتا اور بے بسی کا احساس ہوتا۔ یہ مملکت خداداد میں کس طرح کی دھاندلی ہے۔ ایک شخص سینہ تان کر رہائشی ...... علاقے میں مرغی خانہ چلا رہا ہے۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ ایک طرف انتظامیہ کی طاقت اور مستعدی کا یہ عالم ہے کہ شہر بھر کی بھینسیں لے جاکر لانڈھی کے پیچھے پھینک دیں اور اس جگہ کا نام رکھ دیا بھینس کالونی اور یہاں لال دین پورے محلے کے سینے پر مونگ دل رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

چوہدری کو محلے کا خیال آتے ہی اہلیان محلہ پر غصہ آنے لگا۔ لال دین نہیں کہہ رہا تھا۔ چوہدری نے مرغی خانے سے محلے کو نجات دلانے کے لئے کیا نہیں کیا تھا۔ وہ تھانے گیا۔ انہوں نے کہا' یہ انتظامی مسئلہ ہے۔ انتظامیہ سے بات کرو۔ وہ انتظامیہ کے پاس پہنچا۔ انہوں نے کہا...... اجتماعی درخواست لے کر آؤ شکایت نامے پر پورے محلے کے دستخط ہوں۔ چوہدری نے محلے کی جنرل باڈی کا اجلاس طلب کیا۔ اجلاس میں چوہدری کے علاوہ محلے کا صرف ایک شخص شریک ہوا۔ کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس ملتوی ہوگیا۔ پھر ستم یہ کہ اجلاس کے دا "شرکا" نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ دراصل وہ چوہدری کو سمجھانے

لئے آیا تھا کہ دیوار سے سر نہ پھوڑے۔

اس کوشش کے لئے چوہدری نے شکایتی درخواست تحریر کی۔ پھر وہ اس پر اہلیان محلہ کے دستخط کرانے کے لئے نکلا۔ لیکن مذکورہ درخواست پر اس کے دستخط بھی اکیلے رہ گئے اور اس پر یہ عبرت ناک انکشاف ہوا کہ محلے میں کسی کو مرغی خانے کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہے۔ "کون سا مرغی خانہ' کہاں ہیں مرغیاں ؟"

"یہ لال دین کا گھر مرغی خانہ نہیں ہے ؟" چوہدری نے تپ کر کہا۔

"ارے یہ ...... یہ تو لال دین کی پالتو مرغیاں ہیں۔"

"یہ پالتو مرغیاں ہیں ؟"

"تو اور کیا" جواب ملا۔ "یہ تو شوق ہے لال دین کا۔"

"تمہیں مرغیوں کا شور پریشان نہیں کرتا ؟"

"کہاں ہے مرغیوں کا شور ؟ ہمیں تو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

چوہدری شرمندہ ہوگیا۔ وہ غلط کہہ گیا تھا۔ فارمی مرغیاں شور کہاں کرتی ہیں۔ اور دیسی مرغیوں کو لال دین پچھواڑے کی طرف رکھتا تھا "تمہیں بدبو نہیں آتی مرغیوں کی ؟"

"کیسی بدبو ؟ کہاں کی بدبو ؟"

اس ناکامی کے بعد چوہدری اپنی انفرادی شکایت بالائی سطح تک لے گیا اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ انتظامیہ کی طرف سے ایک سات رکنی انسپکشن ٹیم لال دین کے گھر آئی۔ اس روز چوہدری بہت خوش تھا۔ وہ کام پر بھی نہیں گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ٹیم کے رخصت ہونے کے بعد چلا جائے گا۔

وہ انتظار کرتا رہا۔ دس بجے آنے والی سات رکنی ٹیم شام چھ بجے تک لال دین کے گھر سے نہیں نکل پائی۔ چوہدری خوش اور مطمئن تھا کہ تفصیلی معائنہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن لال دین کے گھر کی طرف سے چلنے والی ہوا اپنے ساتھ ایسی اشتہا انگیز خوشبوئیں لا رہی تھی کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید انسپکشن ٹیم نے لال دین کو تمام مرغیاں پکانے اور اس کے بعد مرغی خانہ بند کرنے کا حکم دے رہا ہے۔

ساڑھے چھ بجے ساتوں اراکین باہر آئے تو ان کے پیٹ ان کی جیبوں کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ چہروں پر طمانیت تھی لیکن چوہدری نے استفسار پر انہوں نے بے رخی سے کہا کہ اپنی رپورٹ وہ متعلقہ افسر کو ہی دیں گے۔

اگلے روز چوہدری کمشنر کے آفس گیا تو کمشنر کے پی اے نے وہ رپورٹ اسے دکھا دی۔ رپورٹ میں لکھا تھا۔ "ہم نے نہایت تفصیلی معائنہ کیا۔ اس مکان میں کوئی کمرشل مرغی خانہ نہیں ہے۔ وہاں صرف Pets ہیں۔ مختلف اقسام کے پالتو پرندے۔ اور رہائشی علاقوں میں شوقیہ پرندے پالنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رپورٹ پر ساتوں اراکین کے دستخط ثبت تھے۔

چند روز بعد قمر نے چوہدری کو لال دین کے سیٹ اپ کے بارے میں سمجھایا۔ پتا چلا کہ لال دین تھانے سے لے کر انتظامیہ تک کو باقاعدہ بھتا پہنچاتا ہے۔ علاوہ ازیں وقت ضرورت متعلقہ لوگوں کو مفت دیسی مرغیاں فراہم کرتا ہے۔ دیسی مرغیاں اس نے اسی مقصد کے تحت رکھی ہیں۔ اور اس کی دیسی مرغیوں کے ذائقے کی پورے ڈسٹرکٹ میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اور جہاں تک محلے والوں کا تعلق ہے تو انہیں بوقت ضرورت رعایتی نرخ پر مرغیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں کوئی لال دین کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

یہ سب یاد کرکے چوہدری کا خون کھولنے لگا۔ اس نے دہاڑ کر کہا "رحمت' ناشتا دو مجھے۔"

رحمت جانتی تھی کہ اب یہ مرحلہ آنے والا ہے' وہ اس کے لیے تیار تھی!



زرینہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سونے کا مناسب وقت تھا ہی نہیں۔ ابھی ذرا دیر میں اس کا شوہر آجائے گا۔ وہ اس کے لئے چائے بنائے گی۔ ناشتا تیار کرے گی۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر ناشتا کریں گے۔ پھر حشمت سو جائے گا۔ اور وہ بھی۔ وہی سونے کے لئے مناسب ترین وقت ہوتا تھا۔ اور وہ خوب ڈٹ کر سوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حشمت اپنی نیند پوری کرکے اٹھ جاتا۔ مگر زرینہ کی آنکھ نہ کھلتی۔ حشمت بڑے پیار سے اسے جگاتا "سنو..... اٹھ جاؤ۔ میرا بھوک سے برا حال ہے۔"

وہ اٹھتی تو وہ بڑے پیار سے کہتا "تم تو ایسے سو رہی ہو' جیسے رات کی ڈیوٹی میں نے نہیں' تم نے دی ہے۔"

یہ سن کر زرینہ گھبرا جاتی تھی۔ اسے لگتا کہ اس کا چور پکڑا گیا ہے۔ وہ بہت غور سے حشمت کو دیکھتی لیکن اس کی آنکھوں میں محبت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ تب وہ پراعتماد ہو جاتی "ڈیوٹی تو میں بھی دیتی ہوں۔ تمہارے بغیر مجھے نیند کہاں آتی ہے" وہ دھڑلے سے کہتی "پھر تم سو جاتے ہو تو میں تمہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ بور ہو جاتی ہوں۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ تمہیں دیکھتے دیکھتے کبھی نیند بھی آجاتی ہے۔ تم رات کی ڈیوٹی چھوڑ دو نا" حالانکہ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ حشمت رات کی ڈیوٹی چھوڑے۔

"کیسے چھوڑ دوں؟ نوکری ہے۔ اس پر میرا اختیار تو نہیں ہے" حشمت افسردگی سے کہتا "پھر اس میں کچھ پیسے بھی زیادہ مل جاتے ہیں۔"

مگر آج زرینہ سے جاگا نہیں گیا' نیند پر اختیار ہی نہیں تھا۔ وہ گہری نیند سوگئی۔ سوتے ہوئے وہ خواب میں دیکھتی رہی۔ نہ جانے وہ کوئی شادی تھی یا کوئی اور تقریب۔ بہرحال کوئی زور زور سے ڈھول بجا رہا تھا۔ ڈھول اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

لیکن یہ ڈھول بجانے والا بے سرا تھا۔ لہٰذا ڈھول کی آواز اسے بہت ناگوار لگ رہی تھی۔ شاید اسی ناگواری ہی کی وجہ سے اس کی نیند اچٹی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ڈھول کی آواز خواب میں نہیں بلکہ حقیقت میں سنائی دے رہی ہے۔ اگلے مرحلے پر یہ احساس ہوا کہ وہ ڈھول نہیں، دروازہ پیٹے جانے کی آواز ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ لگتا تھا دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

اس نے جلدی جلدی آنکھیں ملیں اور دروازہ کھولا۔ حشمت دودھ کی تھیلی لیے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کا تاثر تھا اور آنکھوں میں شکوک کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ زرینہ نے بے حد مدھر آواز اور شیریں لہجے میں اسے سلام کیا۔

حشمت کا موڈ بہت خراب تھا۔ اس نے سلام کا جواب بھی نہیں دیا "کیا ابھی ابھی سوئی تھی کہ آنکھ نہیں کھل رہی تھی ؟" حشمت نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

زرینہ گڑبڑا گئی "نن .... نہیں تو۔ میں تو باتھ روم میں تھی۔ مجبوری تھی، باہر آنے میں دیر لگ گئی۔"

حشمت نے اسے غور سے دیکھا۔ "صورت سے تو لگتا ہے کہ تم سوئی ہوئی تھیں ؟"

"آدمی رات بھر جاگے اور نیند سے بے حال ہو تب بھی ایسی صورت ہو جاتی ہے، تم اندر تو آجاؤ۔"

حشمت کو احساس ہوا کہ وہ دروازے پر ہی کھڑا ہے۔ وہ اندر آگیا۔ زرینہ نے دروازہ بند کردیا۔ زرینہ نے اس کے ہاتھ سے دودھ کی تھیلی لی اور کچن کی طرف چلی

"رکو .... کہاں جا رہی ہو ؟" حشمت نے اسے ٹوکا۔

"ناشتا بنانا ہے نا ؟"

"ہوتا رہے گا ناشتا۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"اچھا ..... دودھ چولھے پر رکھ کر آتی ہوں۔"

کچن کی طرف جاتے ہوئے زرینہ پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ حشمت کے تیور

بہت خراب تھے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ کہیں حشمت کو پتا تو نہیں چل گیا لیکن نہیں .... کیسے چلے گا ؟ اچانک اس کے نیند میں سوئے ہوئے ذہن کو جھٹکا لگا۔ آج جب وہ افضال کو رخصت کر رہی تھی تو اس کا چوہدری چاچا سے ٹکراؤ ہوگیا تھا۔ اسے پوری بات یاد آگئی۔ ضرور چوہدری چاچا نے لگائی بجھائی کی ہوگی۔ نہ جانے لوگوں کو دوسروں کے گھر خراب کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ خیر.... وہ بھی دیکھ لے گی۔

وہ کمرے میں آئی تو حشمت چارپائی پر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "یہاں افضال کیوں آیا تھا؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کون افضال ؟ اور وہ کوئی بھی ہو، یہاں کیوں آنے لگا ؟" زرینہ نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں؟" حشمت کے تیور بدستور خراب تھے۔

"اول تو میں کسی افضال کو جانتی ہی نہیں، پڑوس کی عورتوں کے سوا میں کس کو جانتی ہوں ؟"

"یہ افضال سامنے والی گلی میں رہتا ہے۔ مرغی خانے کے ساتھ والے مکان میں۔"

"سامنے والی گلی میں تو میں سوائے چوہدری چاچا کے کسی کو نہیں جانتی۔"

"چوہدری صاحب نے ہی مجھے بتایا ہے کہ آج صبح سوا پانچ بجے انہوں نے افضال کو ہمارے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"چوہدری چاچا نے کہا تھا ...." زرینہ نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کی۔ پھر اچانک لہجہ بدل کر بولی "ہاں .... آج چوہدری چاچا آیا تھا صبح پانچ بجے۔ خدا کی مار پڑے اس پر۔ میں نے کبھی آپ سے اس کی شکایت نہیں کی۔ میں اس کی بڑی عزت کرتی تھی لیکن وہ بہت کمینہ ہے۔ آج تو اس نے حد ہی کردی۔"

"تجھ سے میں نے پوچھا ہے کہ افضال یہاں کیوں آیا تھا تو چوہدری کے بارے میں باتیں کرنے بیٹھ گئی" حشمت تو تڑاخ پر اتر آیا "صاف بات بتا۔"

"میں تو کسی افضال کو جانتی ہی نہیں۔ میں کوئی باہر گھومتی، ملتی پھرتی ہوں مردوں سے۔ تم خود سوچو، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ افضال کون ہے، کیسا ہے ؟

اس کی عمر کیا ہے؟"

"چوہدری چاچا نے خود افضال کو گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"جھوٹ بولتا ہے وہ لعنتی!" اب کے زرینہ نے غصے سے کہا۔ "سچ یہ ہے کہ وہ خود یہاں آیا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتا ہے فجر کے وقت۔ جانتا ہے کہ وہ وقت سناٹے کا ہے۔ گلی میں کوئی ہوتا ہی نہیں۔ یہی موقع ہوتا ہے اس کے لیے۔"

"پر وہ یہاں کیوں آتا ہے؟"

زرینہ جواب دینے کے بجائے رونے لگی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر حشمت کا دل موم ہوگیا۔ وہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگا "تو رویا نہ کر جینو۔ میرا دل کٹنے لگتا ہے۔ مجھے بتا تو سہی' بات کیا ہے؟"

"تم اتنے بھولے ہو کہ کچھ سمجھتے ہی نہیں" زرینہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا "اور سمجھو گے تو میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔"

"تو بتا تو سہی" اپنے بھولپن کا تذکرہ سن کر حشمت اور پگھل گیا۔

"چوہدری مجھ پر بری نظر رکھتا ہے۔ ہمیشہ مجھ سے کہتا ہے .... زرینہ' تیرا سونا آنگن دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ حشمت سے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے موقع دے کر دیکھ۔ تیرا آنگن پھولوں سے بھر جائے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا' حشمت کو بھی نہیں' حشمت کو میں جانتا ہوں' وہ کسی قابل بھی نہیں۔ تو اس کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔ یہ اجر کا کام ہے۔ اس لئے تیرا گناہ بھی اللہ کے ہاں گناہ نہیں شمار ہوگا۔ بس ایک بار ہاں کردے اور آج تو اس نے میرا ہاتھ بھی پکڑلیا۔ زبردستی کرنے لگا۔ میں نے کہا' شور مچا دوں گی۔ تب چھوڑا اس کمینے نے۔"

"یقین نہیں آتا" حشمت نے لرزیدہ آواز میں کہا "میں بچپن سے جانتا ہوں چوہدری چاچا کو۔"

زرینہ پھر رونے لگی "میں نے پہلے ہی کہا تھا' تم یقین نہیں کرو گے۔ اسی لئے تو پہلے نہیں بتایا تم کو۔ اپنا شوہر ہی اعتبار نہ کرے تو۔"

حشمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے تم پر اعتبار ہے لیکن یہ بات ہی ایسی ہے۔ خیر تم یہ بتاؤ' تم نے کیا کہا؟"

میں ہمیشہ سچی بات کہتی تھی۔ میں کہتی تھی' میرا حشمت دنیا کا سب سے کڑیل مرد ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

زرینہ نے بے حد معصومیت سے کہا۔" اور بچے تو اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہوگا' مل جائیں گے۔ مجھے بچوں کی خواہش اپنے مرد کی محبت اور عزت سے زیادہ عزیز نہیں۔ میں یونہی بہت مطمئن اور خوش ہوں۔"

اپنی مردانگی کے قصیدے نے حشمت کو جیلی بنا کر رکھ دیا۔ اس نے زرینہ کو ہٹالیا "اس چوہدری سالے ...... کو تو میں ابھی دیکھتا ہوں" اس نے موٹی سی گالی دے کر کہا "تم میرے ساتھ چلو۔"

"سنو جی' تم مرد ہو۔ پر ٹھنڈے دماغ سے کام لو" زرینہ نے اس سے اور لپٹتے ہوئے بے حد نخرے سے کہا۔

"تم ڈرتی ہو؟"

"ڈرنا کیسا۔ میں تو منہ در منہ بات کرنے والی ہوں۔ سچی ہوں' ڈرے وہ جو جھوٹا ہو" زرینہ نے تند لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ نرم کرتے ہوئے بولی "بات ہے تمہاری عزت کی اور میری عزت بھی تمہارے ساتھ ہے۔ ایسی باتیں عام ہو جائیں' سارے محلے کو پتا چل جائے تو بے عزتی ہماری بھی ہے۔ بس تم ایک کام کرو' مجھ پر کبھی شک نہ کرنا۔"

"میں نے کبھی شک نہیں کیا۔ اب یہ تو چوہدری جیسے بندے کی بات تھی۔"

"بس تم دفع کرو اسے۔"

"لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ میں اسے بتاؤں گا کہ مجھ پر اس کی حقیقت کھل گئی ہے لیکن میں اس کا پردہ رکھ رہا ہوں۔"

"تو چلو' میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ" زرینہ نے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں سچ مچ ہی سامنا کرنا نہ پڑ جائے۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں مرد ہوں' ان معاملات سے نمٹنا میرا کام ہے۔"

حشمت اٹھنے لگا تو زرینہ نے کہا "ناشتا تو کرتے جاؤ۔"

"تم ناشتا تیار کرو' واپس آکر تمہارے ساتھ ناشتا کروں گا۔"

چوہدری کے گھر کی طرف جاتے ہوئے حشمت کو یہ سوچ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ چوہدری جیسا دین دار آدمی بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر اپنے اندر کہیں گہرائی میں اسے اس بات کے سچ ہونے پر معمولی سا شبہ تھا۔ شاید اسی لیے اس نے پہلے مرزا صاحب کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دستک دی۔ مرزا صاحب باہر آئے تو اس نے ان سے کہا "ذرا افضال کو بلا دیجیے۔"

"وہ تو سو رہا ہے۔" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"سو رہا ہے؟" حشمت کے دل میں کوئی شک پھنکارا۔

"کوئی نئی بات نہیں" مرزا صاحب نے بے زاری سے کہا۔ "روز ایک دو بجے دوپہر تک پڑا سوتا رہتا ہے مردود۔ برسوں کا معمول ہے اس کا۔ یہ آج کے لڑکے ایسے ہی ہیں۔ کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے۔"

حشمت کو برسوں کا یہ معمول سن کر اطمینان ہو گیا۔ وہ مڑا اور اس نے چوہدری کے گھر کی طرف رخ کر کے آواز لگائی "محکوم اللہ ..... باہر آؤ ذرا۔"



ناشتہ کرتے ہوئے چوہدری نے وہ پکار سنی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ برسوں سے کسی نے اسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔ ابا مرحوم ہی اس طرح پکارا کرتے تھے۔ دوسروں کے لئے تو وہ چوہدری تھا۔ اور یہ جو چوہدری کا لاحقہ تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ چوہدری برادری سے تعلق رکھتا ہو، عام طور پر لوگوں سے اس کا نام ادا نہیں ہوتا تھا۔ صرف محکوم کہا جاتا تو اس کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ وہ کسی بندے کا نہیں، صرف اللہ کا محکوم تھا۔ کسی نے تنگ آکر اسے چوہدری کہنا شروع کیا پھر سب اسے چوہدری کہنے لگے۔

سو اس وقت محکوم اللہ کی پکار پر اسے ابا مرحوم یاد آگئے۔ پھر یہ خیال آیا کہ ابا مرحوم تو جنت مکانی ہو چکے۔ یہ اس طرح سے پکارنے والا کون ہو سکتا ہے۔ آواز جانی پہچانی لگی تھی۔ اس کے اپنے بچوں میں سے کوئی اٹھا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خود ناشتا چھوڑ کر دروازے پر گیا۔ حشمت کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا "ارے حشمت میاں، تمہاری

طبیعت ٹھیک ہو گئی؟"

"میری طبیعت تو ٹھیک تھی۔ میں تمہاری طبیعت ٹھیک کرنے آیا ہوں" حشمت نے سخت لہجے میں کہا۔

چوہدری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر کچھ نہیں کہا کہ حشمت ابھی بیماری سے اٹھا ہے۔ کون جانے، اب بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اس نے بے حد خلوص سے کہا "تم نے کیوں زحمت کی، مجھے بلوا لیتے۔"

"جانتا ہوں، تم تو میرے گھر میں گھسنے کا بہانہ تلاش کر رہے ہو" حشمت نے کہا "میں تم سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں محکوم اللہ۔ اور تم ہو تو اسی قابل لیکن پھر بھی میں محلے والوں کے سامنے تمہاری بے عزتی نہیں کرنا چاہتا۔ اب یہ بتاؤ، بات اپنے گھر میں کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

چوہدری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن حشمت کے تیور اسے بہت خراب لگ رہے تھے۔ بات تو پتا نہیں کیا تھی لیکن ہو گی کوئی بری ہی بات "ٹھیک ہے۔ اندر چلے چلو لیکن میں تمہارا بزرگ ہوں، تمہیں مجھ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے، آؤ۔"

"مجھے تو پورے محلے کو جمع کر کے سب کے سامنے بات کرنی چاہیے۔" حشمت نے اس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو!" چوہدری نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا "چائے پیو گے یا ناشتا کرو گے؟"

"اصولاً تو مجھے تمہارا خون پینا چاہیے اور تمہارے ٹوٹے کر دینے چاہئیں" حشمت نے بیٹھتے ہوئے کہا "لیکن میں نہ کچھ پیوں گا اور نہ کچھ کروں گا، بس تم میری بات سن لو۔"

چوہدری کو غصہ تو بہت آیا لیکن گھر آئے مہمان سے بات کرنے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ وہ نیکی کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بے حد تحمل سے کہا "مجھے یہ تو بتاؤ کہ میں نے ایسا کیا کر دیا

ہے؟"

"تم نے میری بیوی پر بہتان لگایا ہے؟" حشمت نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

رحمت آنگن میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس بات پر وہ چونکی اور ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

چوہدری اب تک یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ حشمت کے ساتھ اس نے کب اور کیا زیادتی کی ہے لیکن یہ سن کر وہ حیران رہ گیا۔ یہ تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"میں نے تمہاری بیوی پر بہتان لگایا؟ کب؟" اس نے ہراساں ہو کر کہا "کس نے کہا تم سے؟"

"کسی نے نہیں۔ خود تم نے کہا ہے مجھ سے۔ تم نے بہتان لگایا ہے میری معصوم بیوی پر۔"

"میں نے...... کب؟" چوہدری کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

"آج صبح، جب تم نماز پڑھ کر آ رہے تھے۔"

"مم.... مجھے تو یاد نہیں۔"

"تم نے نہیں کہا تھا کہ تم نے سوا پانچ بجے صبح افضال کو میرے گھر سے نکلتے دیکھا تھا؟"

"ہاں، کہا تھا اور افضال کو دیکھا ہی نہیں تھا، اس سے بات بھی کی تھی۔ مگر اس میں بہتان لگانے کی کون سی بات ہے؟" چوہدری کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"معصوم نہ بنو محکوم اللہ۔ اتنی صبح کو میرے گھر سے کوئی جوان آدمی نکلے گا تو عبادت کر کے تو نہیں نکلے گا۔ وہ میرا گھر ہے، کوئی مسجد نہیں ہے اور بہتان کیا ہوتا ہے؟"

"مگر وہ تو تمہاری عیادت کے لئے، تکلیف میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تمہارے گھر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم ساری رات درد سے تڑپتے رہے ہو اور ابھی سوئے ہو۔"

"میں تو گھر میں تھا ہی نہیں۔ کیسا درد، کیسی تکلیف۔ میں جب تم سے ملا تو رات کی ڈیوٹی کر کے آ رہا تھا۔"

رحمت اب بڑی توجہ سے ہر بات سن رہی تھی۔ لیکن چوہدری کو اس کی دگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ اس پر افتاد ہی ایسی پڑی تھی۔ حشمت کی یہ بات سن کر وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے تاسف سے کہا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"تو اب سوچو نا" حشمت نے کہا "بہتان تو تم نے لگایا ہے۔"

"میں کیوں بہتان لگاؤں گا۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو محکوم۔ میری بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟" چوہدری نے بلبلا کر پوچھا۔

"یہی کہ تم اسے پھنسانا چاہتے ہو۔ روز فجر کی نماز کے لئے جاتے ہوئے تم ے دروازے پر رکتے ہو اور اسے ورغلاتے ہو۔ تم اسے کہتے ہو کہ میں بچہ پیدا نے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ نیک نہ ہوتی تو تم اسے پھنسا لیتے۔ وہ نہیں پھنسی تو نے اس پر بہتان لگا دیا۔ میں تمہیں بہت اچھا سمجھتا تھا محکوم۔ تم بہت کمینے نکلے، یں شرم آنی چاہیے۔"

چوہدری اس دوران میں اپنے ہاتھوں سے اپنے دونوں رخسار پیٹتا رہا۔ "یہ ہاری بیوی نے کہا ہے تم سے؟"

"ہاں اور یہ وہ پورے محلے کے سامنے کہنے کے لئے بھی تیار ہے۔"

یقیناً" ہوگی .... جو عورت اپنے خاوند سے اس طرح کا جھوٹ بول سکتی ہے، وہ ر آدمیوں کے سامنے بھی یہ سب کچھ کہہ سکتی ہے۔" چوہدری نے دل میں سوچا ر لرز کر رہ گیا۔

میں اسے نہیں جھٹلا سکتا اور وہ افضال بھی اسے ہی جھٹلا دے گا۔ اب کیا ہوگا، ب میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ کیا ہونے والا ہے؟

کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ حشمت اٹھ کھڑا ہوا "دیکھو اللہ، ہونا تو یہ چاہیے کہ تمام محلے والوں کے سامنے تمہارے کرتوت بیان کیے ، لیکن میں تمہاری عزت کرتا تھا۔ اس لیے تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن اب اگر

میں نے تمہیں اپنی گلی سے بھی گزرتے دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

چوہدری نے دل میں قسم کھائی کہ اب وہ اس گلی سے کبھی نہیں گزرے گا۔ بلکہ اس کے بس میں ہوا تو کبھی کسی بھی گلی سے نہیں گزرے گا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب حشمت گھر سے چلا گیا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب رحمت نے قریب آکر کہا "ناشتا تو پورا کرلو۔"

چوہدری نے سر اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ رحمت نے بھی سب کچھ سن لیا ہے۔ اب تو اس کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے پتا چلا کہ آدمی بغیر گناہ کیے بھی شرمندہ ہو جاتا ہے "بس کرچکا ناشتا۔ اب اٹھا لو۔"

رحمت نے ناشتا یوں اٹھایا' جیسے شوہر کے گناہوں کا بوجھ اٹھا رہی ہو۔ پھر کچن میں جانے سے پہلے اس نے چوہدری سے پوچھا۔ "کیوں جی' کیا میں بوڑھی ہوگئی ہوں ؟"

چوہدری نے بے دھیانی سے اسے دیکھا اور بولا "نہیں تو' میں بوڑھا نہیں ہوا تو تم کیسے ہوسکتی ہو ؟" پھر چونک کر پوچھا "یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو ؟"

"کچھ نہیں' یونہی۔" رحمت ٹرے لے کر کچن کی طرف چل دی۔ پھر اچانک وہ پلٹی اور بولی "گھر میں ہی کھایا پیا کرو۔ باہر کا کھاؤ گے تو ہاضمہ بگڑ جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

چوہدری دل ہی دل میں جل بھن کر رہ گیا۔ بیوی نے ہاضمہ ایسے کہا تھا' جیسے اس کی عاقبت کا تذکرہ کر رہی ہو۔ اور وہ اس کی گرفت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لوجی' گھر میں بھی عزت گئی بلاوجہ۔ اس نے سوچا۔

اب وہ کڑھ رہا تھا' یہ کیسی مشکل ہے۔ اس نے عبادت کی نیکی کمانے کی کوشش کی تو اس کے حصے میں بہتان کا گناہ آیا اور بے عزتی الگ۔ وہ تو شکر ہے کہ حشمت نے محلے والوں کے سامنے فساد نہیں مچایا۔ ورنہ وہ اس سرخے لال دین کے سامنے کبھی نظر نہیں اٹھا پاتا۔

رحمت کچن سے نکل آئی اور اس کے پاس کھڑی ہوگئی "سنتے ہو جی' ایک بات کہوں ؟"

چوہدری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا "اب کیا ہے ؟"

"مجھ پر کیوں ناراض ہوتے ہو ؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

چوہدری نے بڑی مشکل سے لہجہ نرم کیا "بات کیا ہے ؟"

"تم فجر کی نماز گھر میں ہی پڑھ لیا کرو۔"

غصے کے مارے چوہدری کے سر کے بال کھڑے ہوگئے۔ پہلے کہا..... گھر میں ہی کھایا پیا کرو۔ اب کہہ رہی ہے' نماز بھی گھر میں پڑھ لیا کرو۔ "بکواس مت کرو" وہ غرایا۔

"تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہی ہوں" رحمت نے تنک کر کہا "اتنے سویرے سنسان گلیوں میں مردوں کا نکلنا ٹھیک نہیں' عزت بڑی چیز ہوتی ہے۔"

"باجماعت نماز سے بڑی چیز نہیں ہوتی عزت" چوہدری بولا۔ "دیکھ نیک بخت' فجر کی نماز میں مشکل سے سات آٹھ آدمی ہوتے ہیں۔ سب یہی سوچنے لگیں تو وہاں اکیلے امام صاحب ہی رہ جائیں گے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سب لوگ فجر کی نماز کے لئے اٹھیں۔ تاکہ نہ گلیاں سنسان ہوں اور نہ کسی پر تہمت لگے۔"

میرا کام سمجھانا تھا' آگے تم جانو" رحمت نے کہا اور کمرے میں چلی گئی تاکہ بچوں کو جگا سکے۔ چوہدری کو غصہ تو بہت شدید آیا تھا۔ رحمت کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے مجرم سمجھ رہی ہے۔ لیکن پھٹ پڑنے سے پہلے ہی چوہدری کو یاد آگیا کہ غصہ بہت بری چیز ہے۔ اسے پینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ گویا غصے کی کڑوی زہریلی گولی کو حلق سے اتار لیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ ان نحوستوں میں وہ یہ بھول گیا کہ اسے قرآن پاک کی تلاوت کرنی ہے۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔



چوہدری نے گزشتہ روز قرآن پاک ختم کیا تھا۔ اس روز دوبارہ شروع کیا تو اس کے دماغ کے میکنزم کا سوئی بردار کریڈل یادداشت کے گراموفون ریکارڈ کے ابتدائی

حصے پر گرا۔ اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

مولوی صاحب نے تقریر سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کے حوالے سے ہی شروع کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا .... "اس پہلے رکوع کو غور سے پڑھو' پڑھو اور غور کرو۔ اللہ فرماتا ہے کہ بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ہدایت ہے ان کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ تو اللہ سے نہیں ڈرو گے تو تمہیں اس سے ہدایت نہیں مل سکتی اور اللہ سے اس وقت تک نہیں ڈر سکتے۔ جب تک کہ اسے سمجھو گے نہیں' پہچانو گے نہیں۔ آگے اللہ فرماتا ہے کہ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں' بغیر دیکھے' جو نماز قائم کرتے ہیں۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو قرآن پر اور اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں پر یقین رکھتے ہیں اور جو آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

"اب سوچو تو یہ سب آپس میں مربوط ہے" مولوی صاحب نے کہا تھا "آخرت پر یقین بہت اہم ہے۔ آخرت پر مکمل یقین رکھو گے تو اللہ سے ڈرے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ تو پھر قرآن سے ہدایت بھی ملے گی ورنہ پڑھتے رہو' سمجھو گے کچھ بھی نہیں۔ اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے لیے پانچ ہزار کی قمیض خرید لی۔ یا اونچا محل بنوالیا۔ اس کا مطلب ہے' اللہ کی خوشی کے لئے اپنے رشتے داروں' پڑوسیوں اور ان تمام مسلمانوں کی مدد کرنا جو ضرورت مند ہوں۔ اس کی وضاحت آگے بھی۔کئی مقامات پر کی گئی ہے۔ یتیموں' مسکینوں' قیدیوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانا بھی اللہ کو خوش کرتا ہے۔ کوئی قرض دار ہو تو اس کی گردن چھڑانا بھی نیکی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرنا۔

"اور یہ نہ سمجھو کہ ایمان لے آئے تو بخشش ہو گئی۔ قرآن پاک میں جہاں بھی ایمان لانے کا تذکرہ ہے' وہاں نیک عمل کی شرط بھی ہے۔ متعدد مقامات پر اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' انہیں جنت کی بشارت دے دو۔ گویا نیک اعمال سے تجدید اور قیام ایمان ہے اور نیک اعمال کی وضاحت قرآن پاک میں جابجا موجود ہے۔ سچی گواہی دو' حق کو نہ چھپاؤ۔ انصاف سے کام لو' جہاد کرو' برائی سے روکو۔ بیماروں کی عیادت کرو۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو' استطاعت نہ رکھتے ہو تو اپنے بھائی کی راہ سے کانٹے' پتھر رکاوٹیں ہٹا دو۔ اپنے پریشان

حال بھائیوں کے لیے مسکرا دو۔ دوسروں کے لئے وہی پسند کرو' جو اپنے لیے پسند ہو۔ اپنی ناپسندیدہ چیز دوسروں پر تھوپنا نیکی نہیں' پڑوسیوں کا خیال رکھو۔ پڑوسیوں کو تم سے تکلیف نہ پہنچے۔ پہنچے گی تو تم مومن نہیں ہوسکتے۔"

پھر مولانا نے کہا تھا کہ نیکی کا حسن نیت کی پاکیزگی میں ہے۔ اسے بے غرض ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ بے ساختہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ آدمی صرف اللہ کو خوش اور راضی کرنے کے لئے نیکی کرے۔ دکھاوے کی نیکی کا صلہ تو آدمی انسانوں سے ہی وصول کرلیتا ہے۔ نیکی کے ساتھ پبلسٹی کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو تو وہ نیکی پسند ہے' جس کے متعلق نیکی کرنے والے اور جس کے ساتھ نیکی کی جا رہی ہو' اس کے سوا کسی تیسرے فرد کو علم نہ ہو۔ نیکی کرتے وقت صلے کا تصور جتنا دھندلا ہو' اتنا ہی بہتر ہے۔

وہ تقریر سنتے ہوئے چوہدری نے سوچا تھا کہ نیکی کرنا تو بہت آسان ہے۔ کیونکہ اللہ نے انسان کی فطرت میں نیکی رکھی ہے۔ البتہ خود کو ٹٹولنے پر اسے احساس ہوا کہ دکھاوا بہرحال سرزد ہو جاتا ہے اور یوں نیکی خالص نہیں رہتی۔ مگر آدمی ارادہ کرلے تو یہ خرابی دور ہوسکتی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اگر تمام زندگی میں انسان کی ایک بھی نیکی اللہ کو خوش کردے تو اس کے دونوں جہان کے دلدر دور ہو جائیں۔

یہ سن کر چوہدری نے اپنے دونوں جہان کے دلدر دور کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے سوچا تھا' وہ ایسی ایک نیکی ضرور کرے گا لیکن پھر پورے دن اسے اس بات کا خیال نہیں آیا۔ وہ دنیا کے دھندوں میں پھنس گیا تھا۔ اور آج فجر کے وقت اسے یاد آیا تو اس نے سوچ لیا کہ اب وہ یہ بات نہیں بھولے گا۔ اس وقت سے اب تک وہ نیکی کی تین شاندار لیکن ناکام کوششیں کرچکا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا پبلسٹی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ اس نے خلق خدا کی راہ سے کانٹے ہٹانے کی نیکی کی۔ تو پتا چلا کہ وہ بدی کر رہا تھا۔ پھر اس نے اللہ کی ایک بندی کو جیب خالی ہونے کی وجہ سے تبسم کا صدقہ دینے کی کوشش کی تو وہ اسی کے گلے پڑنے لگی۔ لوگوں کی چہل پہل ہوتی اور پبلسٹی کے لیے سازگار وقت ہوتا تو وہ محلے میں بدنام ہو جاتا۔ ایسی منفی پبلسٹی! پھر اس نے عیادت کی نیکی کمانے کی کوشش کی تو تہمت کا گناہ

اور اپنے لیے بدکرداری کا الزام کمالیا۔

چوہدری نے قرآن پاک کو چوما' آنکھوں سے لگایا' جزدان میں رکھا اور الماری میں رکھ دیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے تازہ ترین تجربات بتا رہے تھے کہ نیکی کرنا بہت دشوار ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایک نیک انسان ہے۔ لہٰذا اس کا دل اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ نیکی دشوار کیسے ہوسکتی ہے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک دلیل آئی۔ اگر ایک نیکی سے دونوں جہان کے دلدر دور ہوسکتے ہیں تو وہ نیکی آسان تو نہیں ہوگی۔ دنیا کی زندگی تو پوری کی پوری آزمائش ہے۔ ایسی ایک نیکی اتنی آسان ہو تو آزمائش کا تو تصور ہی گیا۔ نہیں ایک ایسی نیکی تو مشکل ہی ہوگی۔

بہرحال چوہدری نے یہ ارادہ کرلیا کہ اب ایسی ایک نیکی کیے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ کامیابی تک وہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچے گا۔ اسے ایسی ایک نیکی کرنی ہے۔ اور وہ کرکے رہے گا۔ وہ نیکیوں کے کنوئیں میں ڈول ڈالتا رہے گا' جب تک کہ اس کے ڈول میں ایک خالص نیکی نہیں آجاتی۔

چوہدری محکوم اللہ کی عیادت کرنا خاص طور پر بہت پسند تھا۔ کچھ اس لیے کہ یہ نبی کریم کی سنت تھی اور کچھ اس لیے کہ یہ آسان بہت تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا آسان ہونا اس پر ثابت ہوچکا تھا اور وہ عیادت کے صحیح مفہوم سے واقف تھا۔ اسے وہ واقعہ یاد آگیا' جب عیادت کی روح کو اس نے سمجھا تھا۔



چوہدری محکوم اللہ اس روز حافظ بشیر احمد صاحب کی عیادت کے لیے ان کے ر گیا تھا۔ چند روز پہلے حافظ صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اللہ نے ان پر کرم ایا تھا اور گزشتہ روز ہی وہ اسپتال سے رخصت ہوکر گھر آئے تھے۔ وہ بہت کمزور ئے تھے۔ بلند فشار خون کے مریض وہ پہلے ہی سے تھے۔

چوہدری ان کی عیادت کے لیے گیا تو وہ ایک اوسط سائز کے کمرے میں بیڈ پر ؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے نیم دراز تھے اور کمرا عیادت کرنے والوں سے کھچا چ بھرا ہوا تھا۔ پہلے آنے والے صوفوں اور کرسیوں پر قابض ہوچکے تھے۔ بعد میں نے والے فرش پر بچھے ہوئے پلاسٹک پر ٹھسے ہوئے نہایت بے آرامی سے بیٹھے ے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر چوہدری کو اپنے عرصہ گمراہی کے وہ دن یاد آگئے ' ب وی سی آر نیا نیا آیا تھا اور عام لوگوں کی دسترس میں نہیں تھا۔ کاروباری لوگوں نے وی سی آر رنگین ٹی وی خریدے' رہائشی علاقوں میں مکان کرائے پر لیے اور یں سینما ہاؤس کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ باہر ان کا ایک آدمی کھڑا ہوکر ازیں لگاتا تھا...... ہاں بھئی' دلیپ کمار کی فلم آدمی' دس روپے .... دس روپے .... شائقین دس روپے تھما کر اندر گھستے تھے۔ اندر یہ حال ہوتا تھا کہ تل دھرنے کی نہیں ہوتی تھی۔ بعض لوگ دروازے پر کھڑے ہوکر فلم دیکھنے پر مجبور ہوتے ے

تو اس روز حافظ صاحب کے کمرے میں عیادت کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر دری کو وہ دن یاد آئے اور اس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے اور دل امید ے بھر گیا کہ نیکی کے لئے بھی اتنا ہجوم ہوسکتا ہے۔ بمشکل جگہ بنا کر وہ حافظ صاحب پہنچا اور ان کی مزاج پرسی کی "حافظ صاحب' اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

حافظ صاحب نے عجیب سے یاس انگیز لہجے میں کہا "ابھی تک تو ٹھیک ہوں،
آگے کی اللہ جانے۔ آپ تشریف رکھیے نا۔"

چوہدری بمشکل وہاں بیٹھ گیا۔ حافظ صاحب کے بڑے بیٹے نے اس سے پوچ
"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟"

چوہدری نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا "نہیں بیٹے۔ کھانا کھا کر آیا ہوں۔"

"تو چائے لیں گے یا ٹھنڈا؟"

اب چوہدری کو بہت ناگوار گزرا۔ اس نے کہا "بیٹے ..... میں حافظ صاحب کی
عیادت کے لئے آیا ہوں۔"

"وہ تو یہ سب لوگ بھی آئے ہیں" حافظ صاحب کے بیٹے نے دبی آواز میں
کہا۔

وہاں موجود تمام لوگ دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں آپس میں باتیں کرنے میں
مصروف تھے۔ کہیں سیاست چل رہی تھی، کہیں حالات حاضرہ اور کہیں مہنگائی اور ...
مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ وقتاً فوقتاً کسی کی خطرناک بیماری یا خوفناک
حادثے کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہے تھے۔ حاضرین میں حافظ صاحب کے رشتے دا
اور احباب بھی تھے اور پڑوسی بھی۔

"میاں، حافظ صاحب پر اللہ نے کرم فرمایا۔ ورنہ ایسے ہی دورے میں اللہ د
کا تو دل پھٹ گیا تھا۔" کسی نے کہا۔

"یہ تو اللہ کا کرم ہوا" کوئی اور بولا "ورنہ اکرم صاحب درد سے ایسے تڑ
تھے کہ ان کا پورا جسم اینٹھ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔"

"یہ تو نمونیے کی علامت ہے" ایک اور صاحب نے اعتراض کیا "ہارٹ اٹیک
میں ایسا نہیں ہوتا۔"

جس پر اعتراض کیا گیا تھا، اس نے تپ کر کہا "وہ گرمی کا موسم تھا اور گر
میں نمونیا نہیں ہوتا۔"

"نمونیا گرمی میں بھی ہو جاتا ہے" اعتراض کرنے والے نے نہایت سکون سے
کہا۔

"لیکن ڈاکٹر نے دل کا مرض تشخیص کیا تھا۔"

"آج کل کے ڈاکٹر کچھ بھی کرسکتے ہیں۔"

اس پر زور دار بحث چھڑنے والی تھی کہ تیسرے صاحب کی مداخلت پر روک
"ڈاکٹروں کا کیا ہے جی، میرے سامنے کی بات ہے۔ دل کے ایک مریض کا
تھا اور ڈاکٹروں نے آپریشن تھیٹر میں لے جاکر اس کا پتا نکال دیا۔"

"ایک آدمی کی ٹانگ پر بس گر گئی تھی ..." حاضرین میں سے ایک اور شخص
اسٹارٹ لیا۔

"ٹانگ پر بس!" کسی نے حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں۔ اللہ کا فضل تھا کہ باقی جسم محفوظ رہا۔ بہرحال ٹانگ کا تو سرمہ بن
اب ڈاکٹروں کو وہ ٹانگ کاٹ کر جسم سے علیحدہ کرنی تھی اور جانتے ہیں کہ کیا
انہوں نے دوسری ٹانگ کاٹ دی۔ کہتے تھے کہ اس سے پورے جسم میں زہر
کا خطرہ تھا۔"

یہ خوفناک واقعات سن سن کر چوہدری کی اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ سوچ رہا
کہ حافظ صاحب کا کیا ہوگا۔ دل کا معاملہ ہے اور ابھی وہ پوری طرح صحت یاب
نہیں ہوئے ہیں۔ اس نے حافظ صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا
بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی جو بیڈ پر ان کے ساتھ بیٹھے
ان کی ہتھیلیاں سہلا رہے تھے۔

"بھائی صاحب، آپ آرام سے لیٹ جائیں نا" حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی
نے کہا۔

"اتنے لوگوں کی موجودگی میں اچھا نہیں لگتا" حافظ صاحب نے جواب دیا۔ ان
سے نقاہت اور لہجے سے تکلیف مترشح تھی۔

"تو آپ اندر چلے چلیے۔ آرام کرلیجئے تھوڑی دیر۔"

حافظ صاحب اٹھ رہے تھے کہ عیادت کرنے والوں میں سے ایک نے جلدی
"کمال کرتے ہیں امیر بھائی۔ اتنے لوگ اتنی محبت سے عیادت کے لئے آئے
آپ حافظ صاحب کو اندر لے جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے بھائی صاحب کو سختی سے آرام کے لئے کہا ہے۔" امیر صاحب نے کہا۔

"تو یہاں آرام ہی تو کر رہے ہیں حافظ صاحب!" ایک اور عیادت کرنے والا بولا۔

"اور کیا۔ ہم لوگوں کی موجودگی سے دل ہی بہلے گا حافظ صاحب کا۔" دوسرے نے فیصلہ سنایا۔

اب کے حافظ صاحب بیٹھ گئے لیکن ان کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ پہلو بدلنے سے ان کے ہائی بلڈ پریشر کا اندازہ ہو رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد ایک اور صاحب آئے۔ وہ بھی حافظ صاحب تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ راستے میں ان کی نظر فرش پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب پر پڑی۔ وہ حافظ صاحب کو بھول گئے اور لپک کر بولے "آغا صاحب بھی موجود ہیں۔ بھئی کیسے ہیں آپ؟"

"الحمد للہ، ٹھیک ہوں" آغا صاحب نے کہا۔

نو وارد نے گرم جوشی سے آغا صاحب سے مصافحہ کیا "اب تو برسوں میں ملاقات ہوتی ہے۔"

"زندگی اتنی مصروف ہوگئی ہے کہ اب تو عیادتوں، جنازوں یا شادیوں میں ہی ملنا ہوتا ہے" آغا صاحب بولے۔

"میں ذرا حافظ صاحب کی مزاج پرسی کرلوں پھر سکون سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ بہت باتیں کرنی ہیں آپ سے" نووارد پھر حافظ صاحب کی طرف بڑھنے لگے۔

چوہدری کو وہاں بیٹھے بیس منٹ ہوچکے تھے۔ اسے خیال تھا کہ اور عیادت کرنے والے بھی آئیں گے۔ جگہ خالی کرنی چاہیے۔ دوسرے لوگ تو یوں جمے بیٹھے تھے، جیسے رات کا کھانا ہی کھا کر اٹھیں گے۔ چوہدری اٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ طبعاً وہ شرمیلا تھا۔ نمایاں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ عیادت کے جوش میں جیسے تیسے وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا لیکن جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

پھر دروازہ کھلا اور ایک جوان لڑکے کا خوب صورت چہرہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ

میں ایک گلدستہ تھا۔ اس نے بھرے ہوئے کمرے کو گہری نظر سے دیکھا اور بلند آواز میں السلام علیکم کہا۔ کچھ لوگوں نے جواب دیا۔ کچھ کو اپنی باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ سلام کیا گیا ہے۔

امیر صاحب اس لڑکے کو دیکھ کر کھل اٹھے "آؤ بیٹے ابرار، کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں چچا میاں۔ تایا ابا کی طبیعت اب کیسی ہے؟" لڑکے نے دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"اب تو میں بہتر ہوں" حافظ صاحب نے خود ہی جواب دیا۔ آواز کی کمزوری کے باوجود ان کے لہجے میں لڑکے کے لیے محبت اور شفقت تھی۔

"اللہ کا شکر ہے تایا ابا۔ میں آپ کے لیے پھول لایا ہوں" لڑکے نے گلدستہ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص کو دیا "یہ تایا ابا کو پہنچا دیجئے۔"

گلدستہ ہاتھوں ہاتھ حافظ صاحب تک پہنچا۔ انہوں نے پھولوں کو سونگھا۔ پہلی بار ان کے چہرے پر خوشی اور طمانیت نظر آئی "اندر تو آؤ بیٹے۔ ذرا دیر بیٹھو۔"

"نہیں تایا ابا، میں دراصل یہ کہنے آیا تھا کہ کوئی ضرورت ہو، کوئی کام ہو تو مجھے کہلوا دیجئے گا، میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"جیتے رہو بیٹے" حافظ صاحب نے کہا۔

لڑکا چلا گیا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا "یہ حافظ صاحب کا سگا بھتیجا ہے۔"

"کتنا قریبی رشتہ اور عیادت کا یہ انداز!" کسی نے طنزاً کہا۔ "تایا کے پاس آنا بھی گوارا نہیں ہوا بھتیجے سے۔"

"آج کل کے جوانوں کو عیادت کرنی آتی ہی کہاں ہے" کوئی اور بولا "بس پھول لے آئے، پھولوں سے کیا ہوتا ہے میاں!"

یہ سنتے سنتے حافظ صاحب کا چہرہ کرب میں ڈوب گیا "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں" انہوں نے کرب آمیز لہجے میں کہا "یہ میرا بھتیجا بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ جان چھڑکتا ہے مجھ پر۔ یہ تین رات اسپتال میں میرے ساتھ رہا۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں سویا۔"

ادھر امیر صاحب کو بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے کہا "اور آپ لوگوں کو تو عیادت۔

کے آداب بہت آتے ہیں۔ آپ سے تو وہ لڑکا ہی اچھا کہ تعلق خاطر کا' اپنی موجودگی اور ہمدردی کا احساس دلا کر چلا گیا' بوجھ نہیں بنا اور خود کو دیکھیں' مریض کے آرام کا' اس کی تکلیف کا آپ کو خیال نہیں۔ اس کے سر پر بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ خوف ناک قصے دہراتے ہیں۔ دل جوئی نہیں کرتے' الٹا تکلیف کا سبب بنتے ہیں۔ بھائی' عیادت کا مقصد دل جوئی کرنا' مریض کو احساس دلانا ہوتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ سب اس کے ساتھ ہیں۔ عیادت کا مقصد مریض کو سکون آرام سے محروم کرنا نہیں' مریض پر بوجھ بننا نہیں ہوتا۔ یہاں تو مہمان داری ہو رہی ہے۔ کھانا ہو رہا ہے' چائے آ رہی ہے' جیسے کوئی خوشی کی تقریب ہو....."

اس دوران میں خاصی بڑی تعداد میں لوگ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ سب برا مان کر جا رہے تھے "کیا زمانہ ہے بھئی" کسی نے کہا "نیکی کرو' برائی لو۔"

"ہم یہاں کھانے پینے تو نہیں آئے تھے۔ اللہ کا حکم ہے عیادت کا۔ رسول کریم کی سنت ہے" دوسرا بولا۔

"چلو بھئی چلو۔ ناقدروں کے ساتھ بھلائی کرنا عمل کو ضائع کرنا ہے" تیسرے نے ارشاد فرمایا۔

مگر ایسے لوگ بھی تھے جو وہیں بیٹھے رہے۔ ان میں سے ایک نے بے پروائی سے کہا "میں جانتا ہوں' آدمی تکلیف میں ہو' پریشان ہو تو دماغ کام نہیں کرتا۔ ایسے میں کسی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے۔"

"اور پھر یہ بزرگ ہیں۔ بزرگوں کی بات پر خفا ہونا کیسا؟" ایک جوان آدمی نے کہا۔

چوہدری بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر شاید وہ واحد آدمی تھا جو برا مان کر نہیں جا رہا تھا بلکہ اسے نکلنے کا موقع ہی اب جگہ بننے کی وجہ سے ملا تھا اور وہ شرمندہ بھی تھا۔ اس کی سمجھ میں عیادت کا مفہوم آگیا تھا۔

اچانک اس کی نظر حافظ صاحب کے چہرے پر پڑی۔ ان کو دیکھ کر اسے ڈر لگنے لگا۔ ان کا چہرہ انگارے جیسا سرخ ہو رہا تھا اور سانسیں ٹوٹ کر آ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا ایک ہاتھ سختی سے دل کے مقام پر رکھا تھا اور اسے دبا رہے تھے۔ کچھ بدمزگی

اور کچھ بے آرامی کی وجہ سے ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔

امیر صاحب کی نظر بھی ان پر پڑی تو وہ تڑپ گئے "کیا ہوا بھائی صاحب! کیا بات ہے؟"

لیکن حافظ صاحب سے بولا بھی نہیں گیا۔ بس انہوں نے اشارے سے بتایا کہ ان کے دل میں درد ہو رہا ہے۔ چند لمحوں میں سب کو اندازہ ہوگیا کہ انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا۔

"اب دیکھیں۔ ہم لوگ ہیں تو حافظ صاحب کو اسپتال لے جانے میں دشواری نہیں ہوگی" ناراض ہو کر اٹھنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"آپ لوگوں ہی کی وجہ سے بھائی صاحب کو اسپتال لے جانا پڑ رہا ہے" امیر صاحب نے جل کر کہا۔

سو حافظ صاحب کو اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد ان کی حالت تشویش ناک بتائی اور انہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا۔ چھ گھنٹے تک موت و زیست کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ انتقال کر گئے۔

ان کی موت کے بعد چند معتمد افراد کے درمیان بیٹھ کر ان کے چھوٹے بھائی امیر احمد نے کہا "اگرچہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹروں نے موت کا سبب دل کی بیماری تحریر کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کی موت کا سبب کثرت عیادت ہے۔ ڈٹے رہنے والے اور مستقل مزاج عیادت کرنے والوں کی عنایت۔ میرا بس چلتا تو یہ بات ان کی قبر کے کتبے پر کندہ کروا دیتا۔"



اس روز چوہدری محکوم اللہ نے عیادت کا مفہوم سمجھ لیا۔ اس نے یہ بھی جان لیا کہ عیادت آسان ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد اجر والا کام ہے۔ اس میں آدمی کا خرچ کچھ بھی نہیں ہوتا اور صلہ بہت بڑا ملتا ہے۔ مگر اس نے عیادت کو نیکی میں کبھی شمار نہیں کیا۔ اس کے ذہن میں نیکی کا مفہوم الگ تھا۔ عیادت تو اگر دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے فرض ہے۔ نیکی کو وہ وعدہ کے مفہوم میں لیتا تھا۔

سو چوہدری نے ارادہ کرلیا تھا کہ اب وہ ایک بے غرض نیکی کرکے رہے گا۔ مگر اس سے پہلے عیادت کا ایک موقع مل جائے تو سبحان اللہ۔ عیادت کا ایک موقع تو صبح سویرے ہی ضائع ہوگیا تھا۔ صرف اس لیے کہ جس کی عیادت کرنی تھی' وہ سرے سے بیمار ہی نہیں تھا' الٹا چوہدری خود وبال میں آگیا تھا۔

مگر کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلتے ہوئے چوہدری کو یاد آیا کہ عیادت کا ایک چانس اور ہے۔ دو دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ سعید بیمار ہے۔ اس نے سوچا' کام پر جانے سے پہلے وہ پانچ منٹ میں اس کی عیادت بھی کرلے گا۔ پھر شاید نیکی آسان ہو جائے۔

سب سے پہلے اس نے پھول والے سے ایک گلدستہ لیا۔ پھر وہ سعید کے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں وہ عیادت کے لیے بولے جانے والے جملوں کا انتخاب اور ان کی ریہرسل کرتا رہا۔ اس نے سعید کے دروازے پر دستک دی۔ سعید کا چھوٹا بیٹا دروازے پر آیا "میں سعید بھائی سے ملنے آیا ہوں" چوہدری نے کہا۔

"ابا تو دکان پر گئے ہیں۔"

"لیکن انہیں تو بخار تھا۔ سنا ہے' بہت طبیعت خراب تھی ان کی۔"

"بخار تو اب بھی تھا" اندر سے سعید کی بیوی نے کہا "لیکن بچوں کا ساتھ ین دن سے دکان بند تھی' آج ہمت کرکے چلے ہی گئے۔"

چوہدری کو مایوسی تو ہوئی کہ کوئی کام سیدھا ہو ہی نہیں رہا ہے۔ لیکن عیادت تو ب بھی کرسکتا ہے۔ "ٹھیک ہے بہن' میں دکان پر ان کی مزاج پرسی کرلوں گا۔" نے کہا۔

تھوڑی ہی دور سعید کی دکان تھی۔ وہ ویڈیو کیسٹ کرائے پر دیتا تھا۔ چوہدری اس کی دکان پر نہیں گیا تھا لیکن اس روز عیادت کی خاطر اس نے یہ بھی گوارا یا۔ نیکی کے معاملے میں وہ یونہی کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

وہ سعید کی دکان پر پہنچا تو وہاں تیسری گلی والے نعمان کی بیٹی رضیہ موجود تھی۔ دیکھ کر چوہدری کو حیرت ہوئی۔ ابھی چند سال پہلے وہ چھوٹی سی بچی تھی ..... اور اتنی بھرپور جوان ہوگئی تھی۔ چوہدری نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔ وہ صرف جوان نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لباس اور انداز میں بے حجابی بھی بہت تھی۔ وہ ایک ک کھڑا ہوگیا۔

سعید اور رضیہ کے درمیان راز دارانہ گفتگو ہو رہی تھی لیکن آوازیں اتنی بھی نہیں تھیں کہ چوہدری نہ سن پاتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ سن رہا

"مجھے ویسی فلم چاہیے' آپ سمجھتے کیوں نہیں ؟" رضیہ کہہ رہی تھی۔

"بیٹی' میں ایسی ویسی فلمیں نہیں رکھتا۔"

"جھوٹ نہ بولیں۔ شہباز ہمیشہ آپ سے یہ فلمیں لے کر جاتا ہے۔"

"لیکن ...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں ہنگامہ کردوں تو ابھی آپ کی دکان سے سینکڑوں فلمیں برآمد ہوجائیں گی۔" لڑکی کے لہجے میں دھمکی تھی۔

سعید نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ پھر شوکیس میں ہاتھ ڈال کر ایک کیسٹ اور لڑکی کو دے دی۔ لڑکی کے جانے کے بعد وہ چوہدری کی طرف متوجہ ہوا "آؤ

چوہدری صاحب، کیسے نکل آئے ادھر؟ کوئی فلم چاہیے؟"

"نہیں، میں تو مزاج پرسی کے لئے آیا ہوں" چوہدری نے جلدی سے کہا "مجھے پتہ چلا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، اب کیا حال ہے؟"

"بخار تو اب بھی ہے۔ لیکن کیا کروں، دھندا بھی ضروری ہے۔ روز کنواں کھودتا ہوں، روز پانی نکالتا ہوں۔ تین دن دکان بند رہی تو فاقوں کی نوبت آنے لگی تھی۔"

"اللہ رزق دینے والا ہے۔ گھبراؤ مت، اللہ تمہیں شفا عطا فرمائے۔ روزگار میں برکت دے" چوہدری نے بے حد خلوص سے کہا۔ پھر گلدستہ سعید کی طرف بڑھا "یہ لو سعید بھائی، میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

سعید نے مشکوک نظروں سے اسے اور پھر گلدستے کو دیکھا۔ "اب میں اتنا بیمار بھی نہیں ہوں چوہدری صاحب!"

"اس میں تمہیں خلوص اور اپنائیت کی خوشبو انشاء اللہ پورے دن آئے گی اور تم پوری طرح صحت مند ہو جاؤ گے۔"

سعید نے گلدستہ لیا اور پھولوں کو سونگھا۔ پھر وہ مسکرایا "تم بہت نیک آدمی ہو چوہدری صاحب! آج کل تم جیسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔"

چوہدری کو بروقت خیال آگیا کہ تعریف پر اکڑنا پھولنا نہیں ہے۔ ورنہ نیکی ضائع ہو جائے گی۔ اس نے نہایت عاجزی سے کہا "ارے نہیں سعید بھائی، میں تو بہت گنہ گار آدمی ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

چوہدری بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ تمام راستے وہ ٹرپل ایکس مووی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس حوالے سے اسے نعمان کی بیٹی رضیہ اور سعید کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آتی رہی۔ پھر اس نے یہ سب ذہن سے جھٹک دیا اور خود کو یاد دلایا کہ اسے بس ایک بے غرض نیکی کی فکر کرنی چاہیے۔



چوہدری صدر پہنچا۔ وہاں سے اس نے کلفٹن کی بس پکڑی۔ بس میں بیٹھ کر

بھی وہ ممکنہ نیکی کے بارے میں سوچتا رہا، جو اسے کرنا تھی۔ اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے مولوی صاحب کی تقریر کا ایک حصہ یاد آگیا۔ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اللہ نے ایسے لوگوں کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو بظاہر سفید پوش ہوتے ہیں، جنہیں دیکھ کر کوئی سوچ نہیں سکتا کہ وہ پریشان حال ہیں لیکن ان کے چہروں کو غور سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی عزت اور خودداری کی وجہ سے کسی کے سامنے دست سوال بھی دراز نہیں کرسکتے۔

یہ ٹھیک ہے، چوہدری نے دل میں سوچا۔ یہ آسان بھی ہے۔ صدر سے کلفٹن جانے والی بس میں صبح کے وقت رش نہیں ہوتا۔ تفریح کے لئے تو لوگ دوپہر کے بعد ہی نکلتے ہیں اور صحیح معنوں میں تو تفریح کرنے والوں کا رش شام کے وقت ہوتا ہے۔ اس وقت تو صرف وہی لوگ کلفٹن کا رخ کرتے ہیں جو وہاں کوئی دھندا کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں بابا عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جانا ہوتا ہے۔

سو چوہدری بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ وہ سب پھیچر ٹائپ کے لوگ تھے۔ ان میں کوئی سفید پوش تھا اور نہ ہی کوئی ایسا جو مولوی صاحب کی بیان کردہ تعریف پر پورا اترتا ہو اور وہ ہچکچانے والے بھی نہیں تھے۔ انہیں پتا چل جاتا کہ وہ ایک بے غرض نیکی کا خواہش مند ہے تو وہ سب اپنی ضرورتوں کی فہرست لے کر اس پر پل پڑتے۔ ان میں بہرحال اس کے مطلب کو کوئی نہیں تھا۔

کلفٹن پر بس خالی ہوگئی۔ چوہدری محکوم اللہ بھی اتر گیا۔ نیچے ساحل سمندر پر، ساحل کو پیچھے دھکیلنے والی دیوار کے اس طرف جو دور تک دکانوں کا سلسلہ تھا، ان میں سے ایک دکان اس کی بھی تھی۔ وہ وہاں تلی ہوئی مچھلی بیچتا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس کی دکان خوب چلتی تھی۔ بہت معقول آمدنی تھی اس کی۔ وہ دکانیں ساری ہی ایسی تھیں۔ ان میں کہیں سیپیوں کے زیورات بیچنے والے تھے، کہیں شربت والے، کہیں آلو چھولے کی چاٹ والے۔ اور سب کے سب ہزار سے اوپر ہی پیٹ لیتے تھے۔ پچاس روپے روز تو پولیس کا بھتا ہی جاتا تھا اور سب خوشی سے دیتے تھے۔ جمعرات سے اتوار تک آمدنی اور زیادہ ہوتی تھی۔

اس روز اپنی دکان پر پہنچنے کے لئے چوہدری نے لمبا راستہ اختیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس راستے پر اسے کوئی ایسا ضرورت مند مل سکتا ہے جو سفید پوش ہو اور عزت اور خودداری کی وجہ سے دست سوال دراز نہ کرسکے۔ اگر قسمت سے ایسا ہوگیا تو صبح ہی صبح نیکی مل جائے گی۔

وہ ساحل سے کافی دور' ساحل سے متوازی پکی سڑک پر چلتا رہا۔ وہ مین روڈ تھا۔ لیکن اس وقت وہاں ٹریفک بہت کم تھا۔ آگے جاکر یہ سڑک ساحل کی طرف مڑتی تھی۔ ساحل پر پہنچ کر اپنی دکان پر جانے کے لئے اسے بائیں ہاتھ پر مڑ کر کافی دور چلنا پڑتا۔ یہ الٹے بانس بریلی والا معاملہ تھا۔ لیکن چوہدری کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا معتمد ملازم اکبر دکان کھول چکا ہوگا۔ اور اس وقت رش بھی نہیں ہوگا۔

چنانچہ وہ اطمینان اور سکون سے چلتا رہا۔ وہ سڑک کی سائڈ میں کھڑی ایک عالی شان کار کے پاس سے گزرا۔ کار میں ایک ڈرائیور اور دو گن مینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کار کی طرف توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اپنے سے کچھ آگے اسے ایک شخص جاتا دکھائی دیا۔ اس کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس شخص کو پیچھے سے دیکھ کر بھی وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے مطلب کا آدمی ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ بھاری بھرکم' بلکہ موٹا شخص تھا جو سفاری سوٹ وہ پہنے ہوئے تھا' وہ بیش قیمت معلوم ہو رہا تھا اور وہ اپنے مٹاپے کے باوجود تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا' جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔

چوہدری نے اپنی رفتار تیز کرلی۔ وہ جلد از جلد اس شخص کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ بس چہرے پر پریشانی نظر آئی اور میرا کام ہوا' اس نے سوچا۔

ایک منٹ بعد ہی چوہدری کو محسوس ہوا کہ آگے جانے والے شخص کی رفتار ٹوٹ رہی ہے۔ اسے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ بھی صاف طور پر نظر آئی۔ یہ اچھی علامت تھی۔ چوہدری کو یقین ہوگیا کہ اس شخص نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ وہ لڑکھڑاہٹ سو فیصد بھوک سے پیدا ہونے والی کمزوری کی وجہ سے تھی۔

بعد میں اسے حتمی طور پر پتا چل گیا کہ اس کا اندازہ کس قدر درست تھا!

چوہدری نے اپنی رفتار اور بڑھائی اور چند سیکنڈ میں اس شخص تک پہنچ گیا۔ ے قریب پہنچ کر اس نے اپنی رفتار کم کی اور چند لمحے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ پھر ں سے آگے نکلا اور اس نے بڑے سرسری انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ اس شخص کا یکھتے ہی اس کا دل خوش ہوگیا۔ وہ یقیناً" اس کے مطلب کا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ یں نہایا ہوا تھا اور اس پر عجیب طرح کے کرب کا تاثر تھا۔ اور اس کی آنکھیں ھندلائی ہوئی تھیں جیسے اسے کچھ دکھائی نہ دے پا رہا ہو۔ شاید اسے چکر آ رہے

چوہدری کے ذہن میں شدت سے ایک لفظ گونجنے لگا۔ بھوک ..... بھوک!

چند قدم چلنے کے بعد چوہدری رکا اور اس شخص کی طرف پلٹا۔ اب وہ شخص گیا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔ چوہدری محکوم اللہ نے اس کی عزت داری کا رکھتے ہوئے بے حد احترام سے کہا "السلام علیکم!"

اس شخص نے اسے یوں دیکھا جیسے ٹھیک طرح سے نہ دیکھ پا رہا ہو۔ پھر پھولی سانسوں کے درمیان کہا "وا...... لیکم....."

"آپ کسی بہت بڑی پریشانی سے دوچار ہیں جناب؟" چوہدری نے پوچھا۔

اس شخص نے چونک کر' آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے دیکھا "تمہیں کیسے چلا؟"

"آپ کے چہرے سے صاف ظاہر ہے۔"

"کیا کروں' بہت کوشش کرتا ہوں مگر پھر بھی چہرے سے پتا چل ہی جاتا ہے" شخص کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"پیٹ میں اینٹھن ہو رہی ہوگی؟" چوہدری نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اینٹھن کیا' ایک گولا سا ہے جو ہر طرف دوڑتا پھر رہا ہے۔"

"ایک بار میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔" چوہدری نے حوصلہ دینے والے انداز کہا "مگر اب آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی پریشانی انشاء اللہ دور ہو جائے گی۔"

"تم میری مشکل آسان کرو گے ؟"

چوہدری اپنے دونوں رخسار پیٹنے لگا "توبہ توبہ جناب ! میں کیا اور میری اوقات کیا۔ وہ اوپر والا جسے چاہے' وسیلہ بنا دے۔"

وہ شخص اب چوہدری کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "تم کوئی سنیاسی ہو یا حکیم ؟" اس نے پوچھا "تم کیا کرسکتے ہو میرے لیے ؟"

"میں ..... میں کیا کروں گا' حاجت روائی تو بس اللہ فرماتا ہے" چوہدری نے بے حد عاجزی سے کہا۔

وہ شخص اچانک گڑگڑانے لگا "مجھے حاجت کی حاجت ہے' میں بڑی مصیبت میں ہوں۔"

چوہدری پر رقت طاری ہوگئی۔ سچی اور بے غرض نیکی کی خواہش نے اسے مضطرب کردیا۔ وہ شخص بظاہر اس سے بہت .... بہت زیادہ خوش حال تھا۔ لیکن اتنا پریشان تھا کہ اسے اس کی مدد کی ضرورت تھی "میں جناب' بے حیثیت آدمی ہوں لیکن شاید میری حقیری سی مدد آپ کے کچھ کام آسکے" اس نے بے حد عجز سے کہا۔ پھر جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر اپنی مٹھی میں بند کیا۔ پھر اس نے اس شخص کا ہاتھ تھاما' سو کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر اس کی مٹھی بند کی اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

ایک لمحے بعد اسے عقب سے تیز لہجے میں پکارا گیا "اے رکو..... تم نے مجھے سمجھا کیا ہے ؟"

چوہدری کے قدم اور تیز ہوگئے۔ واقعی ..... خود دار اور عزت والا لگتا ہے۔ اس نے سوچا' اللہ ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے۔

"ابے رک الو کے پٹھے! مجھے خیرات دیتا ہے" اس بار عقب سے دہاڑ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بھاگتے ہوئے بھاری قدموں کی چاپیں۔

چوہدری بھی دوڑنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ موٹا اسے نہیں پکڑ سکے گا اور خوش تھا کہ اسے ایک سچی نیکی نصیب ہوگئی۔

عقب سے موٹے کی دہاڑ دوبارہ سنائی دی "ادھر آؤ نا خبیث' وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو ؟"

چوہدری نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا' بھاگتا رہا اور وہ زیادہ تیز نہیں بھاگ رہا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس بھوکے موٹے سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ تیز دوڑنے کی کیا ضرورت !

عقب سے ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ مگر چوہدری کو اس سے غرض نہیں تھی۔ گاڑی کے بریک چلائے۔ وقفہ .... پھر گاڑی دوبارہ چل پڑی۔ وہ اس سے بے نیاز بھاگتا رہا۔ ایک بار پھر بریک کی چیختی ہوئی آواز ...... اور اس کے ایک لمحے بعد ہی ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا' وہ اس بہت بڑی گاڑی میں اسی موٹے کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں پھینکنے کے بعد باڈی گارڈ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسرا پچھلی سیٹ پر اس کے برابر۔ اب وہ موٹے اور گن مین کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ موٹے کا وجود اسے پسینے ڈال رہا تھا۔

"گاڑی چلاؤں سرجی !" ڈرائیور نے موٹے سے پوچھا۔

"چلاؤں کے بچے' پہلے یہ بتا کہ گاڑی کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں کہتا ہوں کہ گاڑی میرے ساتھ ساتھ چلایا کرو۔"

چوہدری دم بخود بیٹھا تھا کہ یہ کیا افتاد آپڑی۔ وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سرجی' آپ جس رفتار سے جوگنگ کرتے ہیں' گاڑی کم سے کم رفتار میں بھی ہو کر اوور ٹیک کر جائے گی اور اتنی کم رفتار میں انجن بیٹھنے کا خطرہ الگ ہے۔ اسی لیے سرجی' میں آپ کو پانچ سو میٹر کی لیڈ دے کر چلتا ہوں۔"

"ابے گاڑی تیرے باپ کی ہے کیا۔ انجن بیٹھے یا لیٹے' تجھے کیا۔ تو میری بات نہیں مانتا" سیٹھ نے گرج کر کہا "پانچ سو میٹر کی لیڈ کی وجہ سے تو میں اغوا بھی ہوسکتا ہوں"

"ایسی بات نہیں سرجی۔ ہم سڑک پر اور راہ گیروں پر پوری طرح نظر رکھے

ہوئے تھے" آگے بیٹھے ہوئے گن مین نے جلدی سے کہا۔

"خاک نظر رکھے ہوئے تھے" موٹے سیٹھ نے بھنا کر کہا "یہ اتنی دیر مجھ سے بات کرتا رہا اور تم ٹس سے مس نہ ہوئے" روئے سخن چوہدری کی جانب تھا۔

"سرجی' یہ پیدل تھا" چوہدری کے ساتھ بیٹھے ہوئے گن مین نے صفائی پیش کی "یہ آپ کو اٹھا کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔"

"بکواس بند کرو غیر ذمے دار خبیثو!"

ڈرائیور نے شاید موضوع بدلنے کی کوشش کی "سرجی' تھانے چلوں یا اسے ٹھکانے لگا کر سمندر میں پھینکنا ہے؟"

اشارہ چوہدری کی طرف تھا۔ یہ سن کر چوہدری کے تو دیوتا کوچ کر گئے "م۔ میرا کیا قصور ہے جناب عالی؟"

"جب گاڑی چلانی ہوگی' میں بتا دوں گا" موٹے سیٹھ نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ پھر وہ چوہدری کی طرف متوجہ ہوا "تم بتاؤ' تمہارا کیا معاملہ ہے؟"

چوہدری نے گھبرا کر الف سے ے تک سب کچھ سنا دیا۔

"تو میں تمہیں صورت سے بھوکا' پریشان حال اور حاجت مند لگ رہا تھا؟"

"بس غلطی ہوگئی جناب!" چوہدری گھگیایا۔

"غلطی کیسی۔ میں بھوکا بھی تھا' پریشان حال بھی اور حاجت مند بھی" سیٹھ نے کہا "بھوکا اس لیے کہ حاجت پوری نہ ہو تو میں ناشتا نہیں کر سکتا۔ میں گیس اور قبض کا مریض ہوں۔ حاجت مند بھی میں تھا اور پریشان حال اس لیے کہ اس جسم کے ساتھ مجھے ہر روز جوگنگ کرنی پڑتی ہے۔ مگر تم نے مجھے خوب پہچانا" یہ کہہ کر سیٹھ نے ہنسنا شروع کیا اور ہنستا ہی چلا گیا "کمال کیا تم نے۔" وہ ہنسی کے درمیان کہہ رہا تھا "تم نے مجھے ایسا عزت دار ضرورت مند سمجھ لیا جو برے حال میں ہے اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا' خودداری کی وجہ سے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں اس حال میں بھی لگتا ہوں۔"

سیٹھ ہنسے جا رہا تھا اور گھبرایا ہوا چوہدری اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک بہت

زور کا ایک دھماکا ہوا' جس نے چوہدری کو سیٹھ سے کم از کم چھ انچ دور اچھال دیا۔ اس کے نتیجے میں گن مین گاڑی کے دروازے کے ساتھ دب کر رہ گیا۔ اس دھماکے کی نوعیت سمجھنے میں چوہدری کو دس سیکنڈ لگے۔

دھماکے کے نتیجے میں موٹے سیٹھ کے چہرے پر سکون اور طمانیت پھیل گئی تھی۔ اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا "لو.... میری آدھی حاجت تو رفع ہوگئی۔ تم بڑے باکمال اور مبارک آدمی ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"چوہدری محکوم اللہ۔ لیکن جناب' میں نے کیا' کیا ہے؟" چوہدری نے بے حد مظلومیت سے پوچھا۔

"بہت بڑا کام کیا ہے تم نے۔ میری مشکل آسان کی۔ نہ صرف میری پریشانی دور کی بلکہ اس کا مستقل حل بھی سمجھا دیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ جاگنگ کرو' مجھے پتا چل گیا کہ میرا مسئلہ تو ہنسنے سے بھی حل ہو جاتا ہے۔ اور وہ بھی بڑی آسانی سے۔ تم نے بہت بڑی نیکی کی ہے میرے ساتھ! اب میں روز صبح کے وقت لطیفے سنا کروں گا۔"

چوہدری دل ہی دل میں جھلس کر رہ گیا۔ اتنی شدید خواہش اور اتنی مشقت کے بعد یہ کس قسم کی نیکی نصیب ہوئی اسے اور وہ بھی بہت بڑی۔

"لیکن تم نے میری توہین کی سو روپے دے کر" اچانک سیٹھ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ نرم کرتے ہوئے بولا۔ "خیر تمہاری نیکی کی خاطر میں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن تمہیں بھی ایک نذرانہ قبول کرنا ہوگا" اس نے بریف کیس کھول کر اس میں سے سو کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی "لو.... یہ رکھ لو۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" چوہدری نے عاجزی سے کہا۔

"ضرورت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی کو احسان کا صلہ نہ دیا ہو۔ رکھ لو..... شاباش!"

"مگر سیٹھ صاحب! میں اللہ سے صلہ چاہتا ہوں۔"

"وہ تم جانو اور اللہ جانے۔ یہ تو تمہیں لینے ہی پڑیں گے۔" سیٹھ کا لہجہ سخت

ہوگیا۔

"اور اگر میں نہ لوں تو؟" چوہدری نے دل کڑا کر کے کہا۔

"مجھے افسوس ہوگا۔ میرے گن مین تمہیں شوٹ کر کے سمندر میں پھینک دیں گے۔"

چوہدری نے خاموشی سے نوٹوں کی گڈی جیب میں رکھ لی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ ابھی تک وہ نیکی کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے اور نیکی کے بغیر وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر اس گاڑی سے نکلتا اور اپنی دکان کی راہ لیتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے ایک طرف گن مین بیٹھا تھا اور دوسری طرف موٹا سیٹھ۔ چنانچہ اس نے بے حد نیاز مندی سے کہا "سیٹھ صاحب' اب مجھے اجازت ہے؟"

"تم مجھے سیٹھ نہ کہنا۔ اب میں تمہارا دوست ہوں۔ میرا نام جسیم ہے۔ اور ہاں' یہ بتاؤ کہ تم جاکہاں رہے تھے ؟"

"یہاں ساحل پر میری دکان ہے۔"

"تو چلو۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا" سیٹھ جسیم نے کہا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوا "چلو.... ساحل کی طرف...."

دکان تک پہنچنے میں ایک منٹ لگا۔ سیٹھ جسیم دکان دیکھ کر خوش ہوگیا "تم مچھلی بیچتے ہو ؟"

"جی ہاں سیٹھ ...."

"پھر وہی سیٹھ" سیٹھ جسیم کے تیور بدلنے لگے۔

"میرا مطلب ہے جسیم صاحب' میں مچھلی بیچتا ہوں' یہ میری دکان ہے۔"

"صرف تلی ہوئی مچھلی بیچتے ہو یا ابلی ہوئی بھی ہوتی ہے تمہارے ہاں؟" سیٹھ نے پوچھا۔ پھر وضاحت کی۔ "دراصل ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ ابلی ہوئی مچھلی میرے لئے دوا کا کام کرے گی۔"

چوہدری اس وقت اس کار سے نکلنے کے لئے کچھ بھی بیچ سکتا تھا۔ اس نے

جلدی سے کہا "ابلی ہوئی بھی ہوتی ہے سے ... میرا مطلب ہے جسیم صاحب !"

"بس تو پھر دوستی پکی ہوگئی۔ میں روز مچھلی منگوایا کروں گا تم سے۔ دو تین کلو ابھی دے دو۔"

چوہدری گڑبڑا گیا "وہ .... ابھی تو ممکن نہیں ہے۔ میں آیا ہوں' اب ابالوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دو گھنٹے بعد اپنے ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ تم بحث نہ کرنا" سیٹھ نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا۔

"جی۔ نہیں کروں گا' اب مجھے اجازت ؟"

سیٹھ نے اشارہ کیا۔ گن مین نے اتر کر چوہدری کو راستہ دیا۔ گاڑی چلی گئی تو چوہدری کی جان میں جان آئی۔ تب اس کی نظر اپنے ملازم اکبر پر پڑی۔ اکبر کی باچھیں کھلی جارہی تھیں "واہ سیٹھ' خوب مزے اڑا رہے ہو۔"

چوہدری دل ہی دل میں جل کر رہ گیا۔ اب اسے مچھلی ابالنے کی فکر تھی۔ اس کا اس کے پاس کوئی بندوبست نہیں تھا۔ وہ اس میں مصروف ہوگیا۔



چوہدری نے چار کلو مچھلی ابالی تھی۔ وہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اکبر اس دوران میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا تھا "سیٹھ' یہ نیا آئیڈیا کیسے سوجھ گیا؟"

"کسی گراک کی فرمائش ہے۔" چوہدری نے خشک لہجے میں کہا۔ بارہ بجے جسیم سیٹھ کی گاڑی آگئی۔ اس نے تین کلو مچھلی ڈرائیور کو دی۔ گن مین نے ایک ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میرے پاس کھلا نہیں ہے۔ ابھی تو دھندا شروع ہی نہیں ہوا ہے" چوہدری نے کہا۔ ویسے اسے سیٹھ کی دی ہوئی گڈی یاد تھی۔ لیکن نیکی کی خواہش اور تصور میں سرشار اس کے ذہن نے اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ان نوٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں "گن مین نے کہا" سیٹھ نے یہ پوری رقم تمہیں دی ہے' یہ مچھلی کی قیمت ہے۔"

چوہدری نے کوئی بحث نہیں کی۔ وہ خالص کاروباری آدمی تھا۔ اس نے سیٹھ کی فرمائش کے مطابق خاص طور پر مچھلی ابالی تھی۔ اب وہ تین کلو کا ایک ہزار دے تو اس کی مرضی۔ اس نے تو زبردستی نہیں کی تھی۔ لہٰذا یہ اس کے نزدیک حلال کی کمائی تھی۔ اس کی آمدنی تھی۔ البتہ اس کے دیے ہوئے پہلے دس ہزار اسے اب بھی کاٹ رہے تھے۔

"واہ سیٹھ' اللہ روز ایسا گراک دے۔ تین کلو مچھلی ایک ہزار کی" گاڑی جانے کے بعد اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ گراک روز کا ہی ہے" چوہدری نے کہا۔ پھر اس نے بچی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا۔ اس کا ذائقہ خراب ہوگیا "یہ تو بہت خراب ہے" اس نے

منہ بگاڑ کر کہا۔ "چل جان چھوٹی۔ اب سیٹھ کبھی مچھلی نہیں منگوائے گا۔"

"تو سیٹھ مجھ کو بولنا تھا نا" اکبر نے کہا "میں ایسی مچھلی ابال کر دیتا کہ اگلے روز گراک چھ کلو مانگتا۔"

"تجھے مچھلی ابالنی بھی آتی ہے؟" چوہدری نے اسے گھورا۔

"میں فنکار ہوں سیٹھ۔ مچھلی کا کچھ بھی کردوں' اس میں وہ ذائقہ ہوگا جو کہیں اور نہیں ملے گا۔" اکبر نے اکڑ کر کہا "اور مچھلی ابالنا تو ایک فن ہے۔ میں چرکا دے کر اندر مسالہ لگاتا ہوں۔ ایسا کہ نہ کہیں سے پھیکی نہ کہیں سے تیز مسالے کی شکایت۔ برابر کا ذائقہ ہوگا مچھلی کے اندر۔ اور مچھلی بکھرے گی بھی نہیں۔ یہ تو بڑا نازک کام ہے سیٹھ۔"

چوہدری جانتا تھا کہ مچھلی کے معاملے میں اکبر فن کار ہے ..... سچا فنکار "ٹھیک ہے' کل چار کلو ابال دینا۔ ویسے اب تو گراک نہیں آئے گا۔"

اب مصروفیت کا وقت شروع ہوگیا تھا۔ کلفٹن کے علاقے میں بے شمار تعمیراتی کام ہو رہے تھے۔ وہاں کام کرنے والے مزدور کھانا کھانے ادھر ہی آتے تھے۔ چوہدری کی مچھلی' شہزاد کی چھولوں کی چاٹ اور فضل دین کی حلیم اس دوران میں خوب بکتی تھی۔

دو بجے کے بعد ذرا آرام ملا۔ اب تفریح کے لئے آنے والے اکا دکا گاہک ہی رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ وقت تھا کہ سر توڑ کوشش کے باوجود وہ ایک نیکی بھی نہیں کرسکا تھا۔ صبح سویرے تو نمازیں بخشوانے گئے تھے کہ روزے گلے پڑگئے' والا معاملہ تھا۔ مگر آخری کوشش کے تو بڑے عجیب نتائج برآمد ہوئے تھے۔ اول تو جو کچھ اس نے نیکی کے خیال سے کیا' وہ اس کے خیال میں نیکی تھا ہی نہیں۔ لیکن جس کے ساتھ وہ کیا گیا تھا اس کے خیال میں وہ بہت بڑی نیکی تھا۔ اب ایسا تھا بھی تو وہ نیکی ضائع ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ شخص صلے کا معاملہ اللہ پر چھوڑنے کے بجائے خود صلہ دینے پر تل گیا تھا۔ دس ہزار روپے تو اس نے دیے ہی تھے۔ چوہدری کو شبہ تھا کہ وہ اس سے تین کلو مچھلی بھی ہر روز منگوائے گا۔ یعنی وہ صلے کو صلہ جاریہ بنا رہا تھا۔ یہ نیکی کی تڑپ میں مبتلا چوہدری کے لیے نہایت ناپسندیدہ صورت حال تھی۔

اب ایسے میں چوہدری یہی سوچ سکتا تھا کہ اس نام نہاد نیکی کو دریا میں ڈال دے اور خود بیٹھا بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نیکیوں کے کنوئیں میں طلب کا ڈول ڈالتا نکالتا رہے۔ کبھی تو کوئی نیکی ہاتھ آئے گی ہی۔ اور وہ بھی اس سے پہلے چین سے نہیں بیٹھے گا۔

سب سے پہلے تو اسے دس ہزار کی اس رقم سے نجات پانی تھی۔ بے شک وہ کوئی چھوٹی نیکی کرے، لیکن اپنے پیسے سے کرے گا۔ اس رقم سے کی گئی نیکی تو اس کی نیکی شمار نہیں ہوسکتی۔ مولوی صاحب نے حرام اور حلال کے متعلق بھی تو بتایا تھا۔

یہ سب اور اپنی پچھلی ناکامیوں کے بارے میں سوچ سوچ کر چوہدری کڑھتا اور کف افسوس ملتا رہا۔ اور اسی میں اس کے دماغ پر نیکی کی سنک بری طرح سوار ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں استقلال کی چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ میدان جنگ میں سپہ سالار کی حیثیت سے ہو اور جنگ جیتنے کے لئے حکمت عملی پر غور کر رہا ہو۔ مولانا کے جمعے کی تقریر کے ہمہ گیر اثرات اور گہرے ہو گئے تھے۔ عام طور پر وہ ہر بات بہت جلد بھول جایا کرتا تھا۔ لیکن مولانا کی وہ تقریر اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ اسے قسطوں میں اور مختلف مقامات پر یاد آتی تھی۔

چوہدری بس میٹرک پاس تھا لیکن اس کے خیالات فلسفیانہ نوعیت کے تھے۔ ویسے وہ بے حد عملی آدمی تھا۔ اس لیے اسے غور و فکر کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ کبھی موقع ملتا تو وہ بیٹھ کر زندگی کے، دنیا کے، لوگوں کے بارے میں سوچتا۔ بنیادی طور پر وہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ تیزی طراری اس میں نہیں تھی۔ کوئی بھی موقع ملنے پر اسے آسانی سے بے وقوف بناسکتا تھا۔ ہاں، دین کا رجحان اس کا بہت پکا تھا۔ اللہ سے وہ ڈرتا تھا۔

اس وقت کلفٹن کی وہ لوکیشن اس کے لئے کارزار حیات تھی، جہاں اسے ایک نیکی جیتنے کے لئے جنگ کرنی تھی۔ اور وہ جنگ اس کے لئے جہاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ یعنی ویک اینڈ۔ تین بجے تھے۔ اس لیے ساحل سنسان پڑا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی چار بجے کے بعد سے یہاں رونق شروع ہوگی، جو بڑھتی

جائے گی اور رات تک بھی ختم نہیں ہوگی اور رونق کا مطلب تھا دھندے کی مصروفیت۔ سو اب اس کے پاس نیکی کے بارے میں سوچنے اور نیکی کرنے کے لئے ایک گھنٹے کی مہلت تھی۔ اس کے بعد تو اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہ ملتی۔

وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ شاید کہیں کوئی ضرورت مند نظر آجائے اور نیکی کا موقع مل جائے۔ دور دور سے اس کی نظر ناکام لوٹ آئی اور پھر ذرا سے فاصلے پر کھڑے ہوئے اس جوان آدمی پر ٹھہر گئی۔ وہ خوبرو اور وجیہہ تھا۔ بہت قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور ہر اعتبار سے بہت معزز آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی دیکھتے اچانک چوہدری کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی۔ تشویش کی وجہ یہ تھی کہ کانسٹیبل مولا داد کا حسین چارہ اس جوان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کانسٹیبل مولا داد کا تعلق کلفٹن کے تھانے سے تھا۔ کہنے کو وہ کانسٹیبل تھا لیکن درحقیقت وہ اس علاقے کا بادشاہ تھا اور سبب اس کا یہ بتایا جاتا تھا کہ ایس پی کلفٹن اس کا بہنوئی تھا۔ بہرکیف یہ حقیقت تھی کہ مولا داد سے تھانے کا ایس ایچ او بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔

مولا داد پولیس کے ان کارندوں میں سے تھا جو ساحل کی دکانوں، ٹھیلوں اور دوسرے دھندے والوں سے بھتا وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا سرکاری کام یہاں چوری چکاری، لڑائی جھگڑا اور فحاشی اور بدکاری کو روکنا تھا۔

چوہدری اس مضمون میں بہت تیز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کاموں میں بھی پولیس کی کمائی ہے۔ پولیس والے کبھی بھی کسی جوڑے کو، تنہا گھومتا پھرتا دیکھ کر گھیر لیتے۔ سب سے پہلے تو وہ مال بنانے کی فکر کرتے۔ مال نہ نکلتا تو دونوں کو تھانے لے جاتے اور دونوں سے الگ الگ سلوک کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر والے آکر مک مکا کرتے اور انہیں چھڑا کر لے جاتے۔ وہ میاں بیوی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ کیونکہ عام طور پر شادی شدہ جوڑے نکاح نامہ ساتھ لے کر نہیں نکلتے ہیں۔

ایسے میں مولا داد نے اپنی ایک خود مختار کارپوریشن کی بنیاد ڈال لی تھی۔ چار پیلی ٹیکسیاں تو اس کی ویسے ہی چلتی تھیں۔ اس نے چار رنگین ٹیکسیاں بھی ڈال لی تھیں۔ وہ چاروں خوب صورت اور طرح دار تھیں۔ ساحل کے تمام دکان دار انہیں

مولا داد کا حسین چارہ کہتے تھے' جن کے ذریعے مولا داد بڑی' چھوٹی ہر طرح کی مچھلیاں پھنساتا تھا۔ وہ چاروں لڑکیاں ساحل پر فحاشی اور بے حیائی کے ان تمام کاموں کو فروغ دیتی تھیں جنہیں روکنا' جن کا سدباب کرنا پولیس کا کام تھا۔ چنانچہ یاسمین کو اس خوب رو' خوش پوش اور مال دار شخص کی طرف بڑھتے دیکھ کر چوہدری کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے اس شخص کی عزت و عافیت کے لئے دل ہی دل میں دعا کی کہ "اے الہ العالمین' اس شریف آدمی کے ساتھ کوئی ڈرامہ نہ ہو جائے پھر اس نے کان اس سمت لگا دیے۔

مگر وہ دن ہی ایسا تھا کہ کوئی کوشش' کوئی دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔

یاسمین اسی خوبرو جوان کی طرف بڑھی اور لگاوٹ بھرے لہجے میں بولی "ہیلو ہینڈسم!"

جوان آدمی نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے اور گردو پیش کو چوکنے پن سے دیکھا۔ وہاں دکان داروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ ذرا مطمئن ہوگیا اور اس نے بھی جواب میں ہیلو کہا۔

"کہیں چل کر آئس کریم کھائیں؟" یاسمین نے اسے دعوت دی۔

"مجھے ٹھنڈی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"تو کہیں چل کر گرما گرم سوپ پی لیتے ہیں۔"

"میرا بھوک بھڑکانے کا موڈ نہیں۔ وہ یقیناً" تگڑی آسامی تھا۔ "تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

جوان آدمی نے کوٹ کی جیب سے کار کی چابیاں نکال کر دکھائیں۔

"تو چلو' جبیس سے لنچ باکس لیتے ہیں۔ اولڈ کلفٹن پر گاڑی میں بیٹھ کر کھائیں پئیں گے اور باتیں کریں گے" یاسمین نے باتیں کریں گے اس انداز میں کہا کہ چوہدری محکوم اللہ کی رائے میں اس پر حد جاری ہو سکتی تھی۔

"میں بازار میں کھانے پینے کا قائل نہیں ہوں" جوان آدمی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

یاسمین کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی "بنگلا کہاں ہے تمہارا؟"

"ڈیفنس سوسائٹی' فیز فور میں۔"

"تو وہاں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا لوگی؟" جوان آدمی نے دو ٹوک لہجے میں پوچھا۔

یاسمین نے یوں آنکھیں پھیلائیں جیسے یہ سن کر اسے شاک لگا ہو "کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے کیا سمجھ رہے ہو تم؟ میں تو بس بوریت کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"یہ سب میں سمجھتا ہوں۔ تم سیدھی بات کرو۔ میں بور والے ڈرامے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ عزت دار آدمی ہوں" جوان آدمی پر یاسمین کی اداکاری کا کچھ اثر نہ ہوا۔

یاسمین شش و پنج میں پڑ گئی کہ ڈراما جاری رکھے یا نہیں۔ اس نے پوچھا "میری واپسی کب ہوگی؟"

"یہ ہوئی نا بات۔" جوان آدمی نے خوش ہو کر کہا "بھئی پہلے یہاں تفریح کریں گے۔ پھر رات کو گھر چلیں گے۔ صبح ناشتے کے بعد تم اپنے گھر چلی جانا۔"

یاسمین پھر سوچنے لگی۔ چند لمحے بعد بولی "میں دس ہزار لوں گی۔"

جوان آدمی کے لئے وہ یقیناً" معمولی رقم ہوگی۔ چوہدری اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تاثر کی کوئی تبدیلی چوہدری کو نظر نہیں آئی۔ اس نے بے حد پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یاسمین۔"

"خوب صورت نام ہے۔ کاش ...." جوان آدمی نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ پھر اچانک بولا "یاسمین' تمہارے پرس میں آئینہ تو ضرور ہوگا۔"

"ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" یاسمین بھڑک اٹھی۔

"کچھ نہیں۔ ذرا خود کو چیک کرلوں۔"

یاسمین مسکرائی۔ اس نے پرس کھول کر آئینہ نکالا اور جوان آدمی کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا "ویسے تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

جوان آدمی نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا "میں تو ٹھیک ہوں" اس نے کہا اور آئینہ یاسمین کی طرف بڑھا دیا "ذرا تم بھی دیکھ لو۔"

یاسمین اپنے چہرے کی ٹچنگ کرنے لگی۔ اچانک جوان آدمی نے کہا "میں نے دیکھ لیا۔ میں صورت سے بے وقوف نہیں لگتا۔ ہوں بھی نہیں۔ اب تم ذرا غور سے دیکھو اپنے منہ کو۔ یہ تمہیں دس ہزار کا لگتا ہے ؟"

یاسمین کی سمجھ میں پہلے تو کچھ آیا ہی نہیں۔ پھر اس نے جلدی سے آئینہ پرس میں رکھا "یہ کیا بکواس ہے ؟" وہ غرائی۔

"پانچ سو سے زیادہ کی تمہاری اوقات نہیں۔ بولو' چلتی ہو۔ نہیں تو اپنا راستہ لو۔"

یاسمین کا چہرہ تمتما اٹھا "میری اوقات کا تو تمہیں ابھی پتا چل جائے گا۔ ایک لاکھ دے کر بھی بغیر مرمت کے جان نہیں چھوٹے گی تمہاری۔"

چوہدری کا دل لرزنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ البتہ جوان آدمی کے حق میں ایک بات جا رہی تھی۔ اس وقت وہاں رش ہوتا تو پہلے مرحلے میں "عوام" کے ہاتھوں اس کی چٹنی بن جاتی۔ پھر دوسرے مرحلے میں شاید اسے ایک لاکھ ہی دینے پڑتے۔ اس کی شان و شوکت سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ جوان آدمی کچھ سمجھتا' یاسمین نے بہت مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور گلا پھاڑ کر چیخنے لگی "بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔ کوئی ہے ؟"

جوان آدمی نے گھبرا کر کہا "ارے چھوڑو' میرا ہاتھ۔"

مگر یاسمین کی گرفت بہت سخت تھی۔ اور کچھ یہ کہ جوان آدمی اس اچانک افتاد کے لئے تیار بھی نہیں تھا۔ یاسمین اس کے ہاتھ کو تیزی سے اپنے گریبان تک لائی اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اب تو جوان آدمی بالکل ہی بوکھلا گیا۔

وہ بیک وقت ہوش ربا اور عبرت ناک منظر تھا۔ چوہدری نے شروع ہی سے سب کچھ نہ دیکھا ہوتا تو بھی اس منظر کی اور ہی تعبیر کرتا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ

یاسمین کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور اس نے جوان آدمی کے ہاتھ کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ جوان آدمی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی فکر میں تھا اور ہاتھ چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ اس کوشش میں وہ یاسمین کو دھکیل رہا تھا۔ ہر دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ لڑکی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے اور چوہدری کے سوا تمام دکان داروں نے یہی سمجھا۔

چوہدری نے ایک لمحے میں خوب صورت لڑکی کے چہرے کو بدلتے دیکھا تھا۔ اب وہ کوئی مکروہ چڑیل لگ رہی تھی جو اچانک اپنے اصل روپ میں آگئی ہو۔ اس کے دل میں جوان آدمی کے لیے ہمدردی کی لہر اٹھی۔ اب اس بے چارے کا حشر ہو جائے گا۔ پھر اس نے سوچا یہ جو پیسے والے صدقہ خیرات نہیں کرتے' تو ان کا پیسا اس طرح نکلتا ہے۔ بے عزتی الگ ہوتی ہے۔

جوان آدمی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے دوسرے ہاتھ سے یاسمین کو مارنے لگا۔ دیکھنے والے اسے دست درازی بھی سمجھ سکتے تھے۔ کچھ دکان دار ان دونوں کی طرف لپکے۔ اس وقت مولا داد کی انٹری ہوئی۔ مولا داد نے سب سے پہلے وسل بجا کر گویا کمک طلب کی پھر جوان آدمی کو پکڑلیا "اوئے' یہ کیا کر رہے ہو تم سر بازار ؟" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"یہ اس گشتی سے پوچھو حوالدار۔ یہ مجھے گھیر رہی تھی" جوان آدمی نے گھبرا کر کہا۔

جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا' وہ گریبان چھپانے کے بجائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"موقع واردات کا نقشہ تو کچھ اور ظاہر کر رہا ہے" مولا داد نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ سب ڈراما ہے حولدار جی !"

مولا داد یاسمین کی طرف مڑا "کیوں بی بی 'کیا مسئلہ ہے ؟"

"یہ زبردستی کر رہا تھا میرے ساتھ۔ مجھے اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا۔"

مولا داد نے جوان آدمی کا ہاتھ پکڑا اور اسے الگ لے گیا۔ یوں وہ چوہدری

سے اور قریب ہوگئے "آپ مجھے معزز اور شریف آدمی لگتے ہیں۔" مولا داد نے بڑے احترام سے کہا "لیکن آپ بہت بے تکے پھنس گئے ہیں۔ تھانے گئے تو بڑی خرابی ہوگی، مہنگا بھی پڑے گا۔"

"میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔" جوان آدمی نے کہا۔

"بات یہیں ختم ہو جائے تو بہتر ہے" مولا داد کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"دس ہزار۔"

"یہی تو وہ مانگ رہی تھی، جوان آدمی نے کہا "میں کہاں سے لاؤں دس ہزار؟"

"آپ تو دس لاکھ بھی دے سکتے ہیں عزت کے لئے۔ مجھے بڑی پہچان ہے آدمی کی۔"

"یہی تو مشکل ہے" جوان آدمی نے آہ بھر کے کہا "جو یہ مجھے سمجھ رہی تھی اور آپ مجھے سمجھ رہے ہیں، میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو احتشام صاحب کا ڈرائیور .... خاص نوکر ہوں۔ وہ ایک ہفتے کے لئے بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہیں۔ میں ان کا سوٹ پہن کر، گاڑی لے کر تفریح کے لئے نکل آیا تھا۔ میری جیب میں بس تین چار سو روپے ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی مولا داد کے تیور بدل گئے۔ اس نے جوان آدمی کی گردن پکڑلی اور اسے دوبارہ لڑکی کے پاس لے گیا۔

کارروائی شروع ہوگئی۔ دونوں فریق بیان دینے لگے۔ ایک سچ بول رہا تھا اور دوسرا جھوٹ ..... اسی دوران میں چوہدری محکوم اللہ میں ایک کیمیاوی ..... تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ شاید نیکی کی خواہش اور طلب سے بوجھل نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اور شاید جوان آدمی امیرو کبیر ہوتا تو وہ یہ سوچ لیتا کہ اس کی دولت میں سے صدقہ نکل رہا ہے لیکن وہ بے چارہ تو معمولی سا ڈرائیور تھا۔ چوہدری کو اللہ کے احکامات یاد آنے لگے۔ حق کو نہ چھپاؤ، گواہی سچی دو۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ سچ کا ساتھ دو۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ۔

سو چوہدری ان سب باتوں سے لبالب بھر گیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ دریا میں رہ

کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جاسکتا اور دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانا ٹھیک نہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر کشمکش شروع ہوگئی۔

اسی لمحے مولا داد نے جوان آدمی سے کہا "کوئی گواہ ہے تمہارے الزام کا۔ تم نے زیادتی کی اور الٹا الزام لگا رہے ہو" پھر وہ دکان داروں کی طرف مڑا "تم میں سے کوئی گواہ ہے اس بات کا؟" پھر اس کی نظر چوہدری پر پڑی جو موقع واردات سے قریب تر تھا۔ "چوہدری، تم نے کچھ دیکھا، کچھ سنا؟"

اب چوہدری کو گواہی کے لئے پکار لیا گیا تھا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ نیکی تو وہ اب تک کر نہیں سکا تھا۔ سچ چھپانے کا، گواہی سے گریز کرنے کا گناہ کیوں کرتا۔ ساری مصلحتیں دھری رہ گئیں۔ اس نے سوچا، کون جانے، یہ نیکی ہی شمار ہو۔ "میں نے سب کچھ دیکھا، سب کچھ سنا" اس نے کہا۔

مولا داد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کیس پکا ہو رہا تھا "یہاں آکر مجھے بتاؤ۔"

چوہدری وہاں جا کھڑا ہوا "یہ لڑکی اس آدمی کو گھیر رہی تھی۔ کہیں چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے اس سے دس ہزار روپے کی بات کی۔ اس پر اس آدمی نے کہا کہ اس کی پانچ سو سے زیادہ کی اوقات نہیں ہے۔"

مولا داد کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا "لیکن اس نے لڑکی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔"

"گریبان لڑکی نے خود پھاڑا ہے" چوہدری نے بڑے سکون سے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے" مولا داد نے اعتراض کیا۔

"آپ نے سورہ یوسف نہیں پڑھی، دامن پیچھے سے پھٹا ہوتا تو مرد قصور وار ہوتا۔"

"یہ دامن کی نہیں، گریبان کی بات ہے اور کوئی عورت اپنا گریبان خود نہیں پھاڑتی" مولا داد نے اس کی دلیل مسترد کردی۔

"یہ کرسکتی ہے۔ یہ گشتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"ایک سال سے یہ یہاں یہی دھندا کر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔ تم بھی

جانتے ہو حوالدار صاحب !"

مولا داد گڑبڑا گیا "میں ..... میں کیا جانوں ؟"

"اس میں اور ایسی ہی تین لڑکیاں جو اور ہیں' ان کے دھندے میں تم بھی
حصے دار ہو" چوہدری اب ہر مصلحت سے بے نیاز تھا۔

اس پر بات بالکل ہی بگڑ گئی۔ مولا داد نے گرج کر کہا "میں سمجھ گیا چوہدری۔ تو
بھی یہی دھندا کرتا ہے۔ مجھ پر الزام لگاتا ہے۔ تجھے تو آج میں مزہ چکھاؤں گا۔"

پندرہ منٹ کے اندر وہ پورا قافلہ تھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ چوہدری بھی
مجرم کی حیثیت سے اس میں شامل تھا۔



مقدمے کی اگلی سماعت ایس ایچ او کے سامنے ہوئی۔ اس نے سب کچھ سننے
ے بعد چوہدری سے کہا "تم یہاں دکان کرتے ہو۔ تمہیں اس میں ملوث ہونے کی کیا
رورت تھی؟"

"مجھے تو جی حولدار نے خود پکارا تھا" چوہدری نے کہا۔

اس پر ایس ایچ نے مولا داد کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ سر جھکا کر
گیا۔ ایس ایچ او نے چوہدری کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا "تمہیں یہاں
ان کرنی ہے یا نہیں ؟" وہ واضح طور پر دھمکی تھی "تم چاہو تو بیان بدل دو۔ چاہو تو
ان سے دست بردار ہو جاؤ۔ اس کے بعد کیس صاف ہے" یہ واضح طور پر فیصلہ تھا۔

کیس صاف کا کیا مطلب ہے جناب !"

"ہم اس شریف لڑکی کو جانے دیں گے اور ملزم کے خلاف پرچا کاٹیں گے۔"

"مگر یہ تو غلط ہے۔"

"تمہیں اس سے کیا۔ میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔"

چوہدری ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑگیا۔ دکان جاتی رہی تو فاقے ہوں گے۔
ل کا کیا بنے گا۔ مگر نیکی سے سرشار ذہن کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ "رزق
ینے والا اللہ ہے سرکار۔ میں سچ تو ضرور بولوں گا۔ یہ شریف لڑکی نہیں ہے۔ ساحل
ندا کرتی ہے۔ مولا داد اس کا گرو ہے۔ اس جیسی تین لڑکیاں اس وقت بھی شکار
تلاش میں گھوم رہی ہوں گی۔ میں ان سب کو جانتا ہوں۔ یہ یاسمین ہے" اس
لڑکی کی طرف اشارہ کیا "اور باقی تین نگینہ' سائرہ اور پروین ہیں اور یہ آدمی بلاوجہ
ر گیا ہے۔"

ایس ایچ او نے مولا داد کو معنی خیز نظروں سے دیکھا "بھئی اسے لے جاؤ اور

سمجھانے کی کوشش کرو" اس کا لہجہ بھی معنی خیز تھا "ایک گھنٹے بعد میرے سامنے پیش کرو۔"

حوالات میں چوہدری پر جو ایک گھنٹا گزرا' وہ بہت سخت تھا۔ مار پیٹ سے وہ ہمیشہ ڈرتا تھا لیکن مولا داد کے سمجھانے پر بھی وہ نہ بیان بدلنے پر آمادہ ہوا' نہ بیان سے دست بردار ہونے پر۔ اس کے نتیجے میں اس کی مرمت کی گئی۔ مولا داد کے کہنے کے مطابق ہاتھ ہلکا رکھا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود چوہدری کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر مولا داد نے آدھے گھنٹے کا بونس ٹائم بھی لیا۔ لیکن ثابت یہ ہوا کہ مٹی نرم ضرور ہے لیکن زرخیزی سے محروم ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد چوہدری کو دوبارہ ایس ایچ او کے سامنے پیش کیا گیا۔ بظاہر تو وہ پہلے جیسا ہی تھا لیکن مار پیٹ نے اسے تباہ کردیا تھا۔ چہرے کو چھوڑ کر اس کے پورے جسم پر اس طرح ضربیں لگائی گئی تھیں کہ نشان کہیں نہیں تھا۔ چوہدری خود بھی حیران تھا۔ نہ جانے اس کے اندر کون سی قوت تھی کہ وہ ڈٹا ہوا تھا ورنہ اتنی مرمت پر تو وہ قتل کا اعتراف بھی کرلیتا۔

ایس ایچ او نے اس سے پھر دریافت کیا۔ اس کا وہی جواب پاکر اس نے مولا داد سے کہا "اس کی تلاشی لو۔ ہوسکتا ہے' جیب سے پڑیا نکلے۔ کیا پتا' یہ مچھلی کی آڑ میں ہیروئن کا دھندا کرتا ہو۔"

چوہدری نے سمجھ لیا کہ اب اس کی جیب سے پڑیا برآمد ہوگی لیکن اندر کا شعلہ اب بھی روشن تھا۔ وہ جھوٹ کیوں بولے' سچی گواہی کیوں چھپائے۔

اگلے ہی لمحے مولا داد کی باچھیں کھل گئیں۔ پڑیا برآمد کرانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چوہدری کی جیب سے سو کے نوٹوں کی پوری گڈی برآمد ہوگئی "یہ تو جیب کترا ہے سرجی ..... یہ دیکھیں"

اس نے نوٹوں کی گڈی لہرائی اور چوہدری کی گدی پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا "کس کی جیب صاف کی ہے ؟"

"میں جیب کترا نہیں ہوں۔ یہ مجھے میرے دوست نے دیے ہیں۔"

"واہ بھئی۔ ایسے دوستوں سے تو ہمیں بھی ملوا دے۔" ایس ایچ او نے ہنس کر

کہا۔

مولا داد نے گڈی ایس ایچ او کو دی "یہ شہادت رکھ لیں سنبھال کر سرجی۔ کام آئے گی۔"

"اب تو تجھ پر کئی کیس بنیں گے بچو! یا تو پاکٹ مار ہے یا پھر کوئی غلط دھندا کرتا ہے۔ یوں کوئی کسی کو دس ہزار نہیں دیتا۔" ایس ایچ او نے کہا پھر اس نے گڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اچانک گڈی میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکل آیا۔ ایس ایچ او نے اسے پڑھا اور مسکرایا "لو..... ثابت ہوگیا کہ یہ پاکٹ مار ہے" اس نے مولا داد سے کہا "اور ہاتھ بھی کہاں مارا ہے ..... سیٹھ جسیم کی جیب پر۔ اب تو یہ گیا....."

چوہدری کا دماغ جیسے روشن ہوگیا "وہی تو میرے دوست ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے یہ گڈی اور یہ کارڈ دیا تھا۔"

"سیٹھ جسیم اور تیرے دوست!" مولا داد نے مضحکہ اڑایا۔

"کارڈ پر فون نمبر بھی ہے۔ آپ میری بات کرا دیں ان سے۔"

اس کے لہجے میں یقین ایسا تھا کہ ایس ایچ او اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے سیلوٹ کرے گا مگر عین موقعے پر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے مولا داد سے کہا "میں سیٹھ جسیم کو فون کرکے ان سے پوچھوں گا۔ تم اسے لے جاؤ' ہاں اب ہاتھ نہ لگانا اور عزت سے پیش آنا۔"

"سرجی' یہ ان کا دوست کیسے ہوسکتا ہے ؟" مولا داد نے احتجاج کیا۔

"لگتا تو مجھے بھی نہیں۔ لیکن رسک نہیں لے سکتا۔ تم جانتے ہو کہ سیٹھ جسیم چیف منسٹر سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتے۔ جو بھی کہہ رہا ہوں' تم وہ کرو" ایس ایچ او نے کہا۔

ایس ایچ او ہر آدھے گھنٹے بعد سیٹھ جسیم کا نمبر ملاتا رہا لیکن وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ دس بجے ان سے بات ہوئی۔ ایس ایچ او نے اسے بتایا کہ ایک مشتبہ آدمی کی جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی اور آپ کا وزیٹنگ کارڈ برآمد ہوا ہے "وہ کہتا ہے سرجی کہ آپ اس کے دوست ہیں۔"

"میرے دوستوں کو تم جانتے ہو" دوسری طرف سے سیٹھ جسیم نے خشک لہجے

میں کہا "کوئی مشتبہ آدمی میرا دوست کیسے ہوسکتا ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا سرجی کہ ساحل پر مچھلی بیچنے والے سے آپ کی دوستی کیسے ہوسکتی ہے؟" ایس ایچ او نے خوش ہوکر کہا۔

"مچھلی بیچنے والا ....." دوسری طرف سیٹھ جسیم چونکا۔ "ہاں ... وہ تو آج ہی میرا دوست بنا ہے۔ تم نے پکڑ رکھا ہے اسے؟"

ایس ایچ او کی ہوا خراب ہوگئی "ارے نہیں سرجی، عزت سے رکھا ہوا ہے۔ آپ حکم کریں تو ابھی چھوڑ دوں۔"

"تم کچھ نہ کرو، میں خود آرہا ہوں" سیٹھ جسیم نے بے حد خراب لہجے میں کہا اور ریسور پٹخ دیا۔

ایس ایچ او کے ہاتھ پاؤں پھول گئے "او اس مچھلی والے کو یہاں لاؤ جلدی سے، عزت سے لانا۔ اس نے ہیڈ محرر سے کہا۔



چوہدری محکوم اللہ کا دل امید سے بھر گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بچت کی صورت نکل سکتی ہے۔ وہ تو اپنے طور پر نیکی کی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جوان ڈرائیور کو نہیں بچاسکے گا۔ بلکہ وہ تو خود بھی نہیں بچ سکے گا۔ یہاں جو نقصان ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دکان اس سے چھین لی جائے اور روزگار بھی جاتا رہے۔

اسے سیٹھ جسیم الدین یاد بھی نہیں تھا۔ مگر اسی کی وجہ سے اس کی بچت ہوگئی۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جن دس ہزار روپوں سے وہ چڑ رہا تھا، وہی اس کی بچت کا باعث بنے۔ نہ وہ رقم اس کی جیب سے برآمد ہوتی، نہ سیٹھ جسیم کا تذکرہ نکلتا، نہ اس کی جان بچتی۔

ایس ایچ او نے اسے دوبارہ حوالات میں بھجوا دیا تھا۔ لیکن وہ مار پیٹ سے بہرحال محفوظ ہوگیا تھا۔ البتہ مولا داد اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ اس بار اس نے دانت پیس کر کہا تھا۔ "یہ سیٹھ جسیم والے غبارے سے ہوا نکل جائے

چوہدری۔ پھر میں تجھے دیکھوں گا۔ تو تو کلفٹن آنا بھول جائے گا۔"

چوہدری کو امید تھی کہ ابھی سیٹھ سے ایس ایچ او کی بات ہوگی اور اسے رہائی مل جائے گی لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا۔ کوئی خوش خبری اس کی طرف نہیں آئی۔ دو گھنٹے ہوگئے تو مولا داد کے انداز میں فاتحانہ پن اور جارحیت نمایاں ہونے لگی۔ اب تو لگتا تھا کہ کسی بھی وقت وہ اس پر پل پڑے گا۔

پھر تین گھنٹے گزر گئے۔ چوہدری کی امید کمزور پڑنے لگی۔ سیٹھ جسیم کو تو شاید یاد بھی نہیں ہوگا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر سیٹھ جسیم نے اسے پہچاننے سے انکار کردیا ہوتا تو اب تک تو وہ مولا داد کے ہاتھوں زندہ لاش بن چکا ہوتا۔

اب کے مولا داد حوالات کی طرف آیا تو اس نے دل کڑا کرکے اس سے پوچھا "سیٹھ جسیم سے بات ہوئی؟"

"بات ہوگئی ہوتی تو تو عافیت سے نہ ہوتا چوہدری۔ بس ان سے بات ہونے ہی کی دیر ہے۔"

سو چوہدری آس کے اس دھاگے سے لٹکا جھولتا رہا۔ پانچ گھنٹے ہوگئے۔ پھر اچانک اسے مولا داد تیز قدموں سے چلتا ہوا حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے حوالات کا دروازہ کھولا اور چوہدری کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ چوہدری کو ساتھ لے کر حوالات کی طرف چلتے ہوئے اس نے سخت لہجے میں کہا "چوہدری ..... میرے خلاف زبان کھولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تمہیں کلفٹن میں دکان کرنی ہے اور میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں" لیکن اس کے لہجے کی کمزوری چھپ نہیں سکی تھی۔

چوہدری ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے والے دروازے سے سیٹھ جسیم کمرے میں داخل ہوتا نظر آیا۔ "کہاں ہے میرا دوست .....؟" وہ ایس ایچ او سے کہہ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر چوہدری پر پڑی تو وہ اس کی طرف لپکا "تم کیسے ہو میرے دوست ..... میرے محسن!" اس نے چوہدری کو لپٹا لیا "مجھے بتاؤ، بات کیا تھی؟"

چوہدری کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایس ایچ او بول اٹھا "کچھ نہیں ..... معمولی سی بات تھی سرجی۔ آپ تشریف رکھیں، میں بتاتا ہوں۔"

"تم چپ رہو۔ میں چوہدری سے بات کر رہا ہوں۔"

سیٹھ جسیم نے چوہدری کو اپنے ساتھ ہی بٹھالیا۔ چوہدری نے الف سے ے تک پوری داستان سنا دی۔ ایس ایچ او اور مولا داد کے چہرے فق ہو گئے۔ سیٹھ جسیم غصے سے پھنکار رہا تھا۔ "تو یہ کالے دھندے ہیں تم لوگوں کے" اس نے کہا "اور معصوم لوگوں پر ظلم کرتے ہو .... صرف پیسے کی خاطر!"

"مم .... میں .... میں بے قصور ہوں جناب!" ایس ایچ او ہکلانے لگا "مجھے تو یہ سب کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"یہ کہہ کر جان چھڑا لو گے تم۔ تم انچارج ہو اس تھانے کے۔ پورے علاقے کے ذمے دار ہو" سیٹھ جسیم نے غصے سے کہا "تمہارے اپنے آدمی بدکاری کو فروغ دے رہے ہیں" پھر اچانک اسے کچھ خیال اور وہ چوہدری کی طرف مڑا "دوست، انہوں نے تمہیں مارا پیٹا تو نہیں ؟"

اس پر مولا داد بلبلا اٹھا "وہ جناب .... ضابطے کی کارروائی تو کرنی تھی۔"

"میں اپنے دوست سے بات کر رہا ہوں۔ تم خاموش رہو" سیٹھ جسیم نے اسے ڈانٹ دیا۔

چوہدری بچپن میں اپنے باپ کے ہاتھ پٹا تھا مگر وہ پٹائی اس مار کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی اور بچپن کے بعد سے اب تک کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسے اپنی مرمت یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ مار پیٹ کی وجہ سے اس کا پورا جسم دکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اسے مولا داد کی دھمکی بھی یاد آئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جانے دیں۔ جسیم صاحب، جو ہو گیا سو ہو گیا۔"

اس کے آنسو دیکھ کر جسیم تڑپ گیا "نہیں چوہدری دوست، تم مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس نے مارا تھا؟"

چوہدری سے بولا تو نہیں گیا۔ اس نے مولا داد کی طرف اشارہ کیا۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گا" سیٹھ مولا داد پر دہاڑا "ایک ایک چوٹ کا حساب لوں گا تم سے" پھر وہ ایس ایچ او کی طرف مڑا "اس کا رینک کیا ہے ؟"

"کانسٹیبل ہے جناب!"

"بڑا بااختیار کانسٹیبل ہے" سیٹھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا اور یہ سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ ایس ایچ او تو یہ ہوا نا۔ بڑی ڈھیل دے رکھی ہے اسے۔ لگتا ہے، اس کے کالے دھندوں میں تم بھی حصے دار ہو۔"

"میں بے قصور ہوں جناب!" ایس ایچ او گڑگڑایا "یہ مجھ پر اوپر سے مسلط کیا گیا ہے۔ میں کیا کروں، میرے بس میں ہوتا تو میں اسے یہاں ایک دن بھی برداشت نہ کرتا۔"

"اوہ .... تو ذرا اس کا حدود اربعہ بتاؤ۔"

"رہنے دیں سیٹھ جی۔ مجھے بھی نوکری کرنی ہے" ایس ایچ او نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم مجھے بتاؤ۔" سیٹھ نے اصرار کیا "مجھے نہیں جانتے تم ؟"

"یہ جناب .... اپنے ایس پی صاحب کا سالا ہے۔"

سیٹھ نے ایس پی سے فون پر بات کی۔ اسے خوب جھاڑا۔ مولا داد کو معطل کرایا۔ ڈرائیور کو بھی رہائی مل گئی۔ پھر وہ چوہدری کو لے کر چلنے لگا۔ ایس ایچ او نے دونوں ہتھیلیوں پر نوٹوں کی گڈی اور سیٹھ کا وزیٹنگ کارڈ رکھ کر چوہدری کو پیش کیا "یہ سرجی آپ کی رقم۔ میں معافی چاہتا ہوں آپ سے۔"

چوہدری نے بادل ناخواستہ گڈی پھر جیب میں رکھ لی۔ وہ باہر آئے۔ سیٹھ نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ اپنی دکان کے سامنے گاڑی سے اترنے سے پہلے چوہدری نے سیٹھ سے کہا "آپ کا شکریہ جناب! ورنہ میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ اب تم میرے دوست ہو" سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اب کہہ رہا ہوں کہ اس علاقے میں کیا، پورے شہر میں تم کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اب تم جاؤ، ہاں .... کل بارہ بجے مچھلی تیار رکھنا۔"

اکبر نے چوہدری کا بے حد پرتپاک خیر مقدم کیا۔ "سیٹھ" تم تو ایک دن میں بڑے آدمی ہو گئے۔ تھانے سے کسی کو اس طرح آتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

چوہدری نے دل میں سوچا۔ "اندر کا حال تجھے کہاں معلوم ہے۔"

"پر سیٹھ تمہیں کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی یہ سین تو یہاں روز ہوتے رہتے ہیں۔ تم پہلے کبھی اس طرح نہیں کودے تھے۔" اکبر بولا۔

"کبھی کبھی دماغ خراب ہو جاتا ہے بچے!"

"اچھا سیٹھ' اب اپنا گلا سنبھالو اور مجھے چھٹی دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج دھندا بھی بہت زیادہ تھا۔ لاؤ مجھے پیسے دو۔"

چوہدری کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تو خود ہی لے لے نا!"

"تم جانتے ہو سیٹھ۔ اکبر پیسے ڈالنے کے لیے گلا کھولتا ہے۔ پیسے نکالتا نہیں ہے۔" اکبر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"چوہدری جانتا تھا کہ اکبر مثالی ایمان دار آدمی ہے۔ اس نے گلے میں سے دو سو روپے نکال کر اسے دیئے۔ وہ چلا گیا۔ چوہدری دکان بند کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے گلے کی رقم گنی تو حیران ہوا۔ اس روز کی سیل چار ہزار چھ سو روپے تھے۔ ورنہ دو اور تین کے درمیان ہوتی تھی۔

گھر جانے کے لیے بس میں بیٹھ کر وہ اس دن کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیسا عجیب...... اور سخت دن گزرا تھا۔ صبح سے وہ نیکی کے لیے جھک مارتا رہا لیکن بات نہ بنی۔ شاید اس محرومی ہی کی وجہ سے وہ اس پرائی آگ میں کود پڑا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بڑی حماقت کی تھی' مگر وہ ایک غیر معمولی بات بھی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ پولیس کے چکر سے بہت دور رہتا تھا۔ کیسا خطرناک اور تلخ تجربہ ہوا ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ اتنی بڑی مشکل کیسے آسان ہو گئی۔ یقیناً اللہ نے اس کی مدد کی۔ شاید اس لیے کہ وہ اللہ کے حکم پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے حق کے لیے آواز اٹھائی۔ جھوٹ کے خلاف کھل کر بولا۔ سچی گواہی دی' وہ ایسا تو نہیں۔

بہرکیف اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرے گا لیکن اس نے یہ عزم بھی کرلیا کہ نیکی کا خیال نہیں چھوڑے گا۔ ایک نیکی تو اسے کرنی ہے۔



سعید ویڈیو والے پر وہ افتاد اچانک ہی آئی تھی۔

وہ گاہکوں کے واپس لائے ہوئے کیسٹوں کی رجسٹر میں انٹری کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کی گردن پکڑ لی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ نعمان تھا۔ اسے حیرت ہوئی' نعمان پہلی بار اس کی دکان پر آیا تھا اور آتے ہی گردن پکڑ لی تھی۔ "کیا بات ہے نعمان بھائی۔ خیریت تو ہے؟" اس نے بے حد رسان سے پوچھا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔" نعمان نے کہا۔ پھر اپنے دس سالہ بیٹے کو ہاتھ پکڑ کر آگے کیا۔ "رضوان .... اسی سے لے کر گیا تھا یہ کیسٹ؟" رضوان نے اثبات میں سرہلادیا۔ وہ خوف زدہ لگ رہا تھا۔

تب سعید کی نظر رضوان پر پڑی۔ رضوان کبھی کبھار اس سے کیسٹ لے جاتا تھا۔ اب بھی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی "بات کیا ہے نعمان بھائی؟"

"بات پوچھتا ہے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔" نعمان حلق کے بل دہاڑا "یہاں محلے میں بیٹھ کر یہ کالا دھندا کرتا ہے تو۔ محلے کی بہنوں بیٹیوں کو خراب کرنا چاہتا ہے۔"

نعمان کی آواز سن کر لوگ جمع ہونے لگے۔ دو منٹ میں وہاں مجمع لگ گیا۔ سعید کی نظر کیسٹ پر پڑی تو اس کا دم نکل گیا۔ وہ تو وہی کیسٹ تھی' جو صبح اس سے نعمان کی بیٹی لے کر گئی تھی.... کیا نام تھا لڑکی کا .... ہاں' رضیہ۔

اس نے بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ یہ تو بہت بڑا وبال معلوم ہو رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس طرح کے کیسٹوں پر اپنی دکان کے نام کا اسٹکر نہیں لگاتا تھا اور وہ ایسے کیسٹوں کو رجسٹر میں بھی درج نہیں کرتا تھا۔

"کیا ہوا نعمان بھائی؟" مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

"ارے بھائی' یہ حرام زادہ محلے میں بیٹھ کر فحاشی کا کاروبار کر رہا ہے۔" نعمان نے گرج کر کہا۔ میری بچی کبھی کبھی کوئی کیسٹ منگا لیتی ہے۔ آج اس نے رضوان سے فلم منگوائی تو اس کمینے نے یہ گندی فلم بھیج دی۔ میری بیٹی تو اس وقت سے روئے جا رہی ہے۔"

"یہ گندی فلم ہے۔" مجمع میں سے اشتیاق آمیز آوازیں ابھریں۔ "یقین نہیں آتا۔"

"نعمان بھائی! میری بات سنیں" سعید نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہ گندی فلم ہے یا نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ میری دکان کی کیسٹ نہیں ہے۔"

"تو میرا بچہ جھوٹ بول رہا ہے؟" نعمان نے تڑپ کر کہا "بیٹے رضوان' بتا نا۔"

آپا نے کہا تھا' صبح آپ ہی سے..." دس سالہ رضوان کہتے کہتے صرف ایک ثانیے کو رکا۔ یہ بات صرف سعید ہی سمجھ سکا تھا کہ وہ کیوں رکا ہے۔ اس کے منہ سے سچی بات نکل رہی تھی۔ وہ بتانے والا تھا کہ صبح وہ آپ ہی سے کیسٹ لے کر گئی تھی۔ پھر اس نے فوراً ہی جملہ مکمل کیا "...... میں کیسٹ لے کر گیا تھا۔"

"دیکھئے نعمان بھائی' بچے سے بھول ہو رہی ہے۔ یہ میری دکان کی کیسٹ ہے ہی نہیں۔"

"یہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ دکان کیسے بھول سکتا ہے؟" نعمان نے دہاڑ کر کہا۔

"پہلے یہ تو دیکھ لو کہ یہ بلیو فلم ہے بھی یا نہیں۔" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" نعمان نے مجمع پر آنکھیں نکالیں۔ کیونکہ یہ معلوم نہیں تھا کہ بولنے والا کون ہے۔

"ابھی پتا چل جائے گا نعمان بھائی۔ آپ برا کیوں مانتے ہیں۔" ایک اور شخص نے کہا۔

"ہاں ہاں .... کیسٹ چلا کر دکھاؤ۔" مجمعے میں سے کئی آوازیں ابھریں۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ نعمان بھائی نے دیکھ کر ہی کہا ہوگا۔" سعید نے گھبرا

ر کہا۔

"نہیں ..... کیسٹ چلاؤ۔" لوگوں نے بے تابی سے مطالبہ کیا۔

سعید مجبور ہوگیا۔ اس کی دکان میں وی سی آر بھی تھا اور کلر ٹی وی بھی۔ اس ے کیسٹ لگایا اور پلے کا بٹن دبا دیا۔ ایک لمحے کے بعد ٹی وی پر جو سین نظر آیا' ے دیکھ کر مجمع دم بخود ہوگیا اور نعمان آپے سے باہر۔ دیکھنے والوں میں کچھ لوگ حول پڑھتے جا رہے تھے۔ مگر ٹی وی اسکرین سے نظریں کسی کی نہیں ہٹ رہی ہیں۔ ایسے میں نعمان سعید پر ٹوٹ پڑا اور اسے مارنے لگا۔ سعید نے خود کو بچانے کی وشش کی اور جلدی سے وی سی آر کو آف کر دیا۔ اتنی دیر میں نعمان دکان کا شٹر رانے والا سریا اٹھا چکا تھا۔ اس نے وہ سریا سعید کے سر پر مار دیا۔

شاید اسکرین تاریک ہونے کے نتیجے میں لوگوں کو ہوش آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ سعید کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نعمان ایک اور وار کرنے والا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے دبوچ لیا اور سریا اس سے چھین لیا۔ اتنی دیر میں سعید کا چہرہ خون میں نہا گیا تھا۔

"تم لوگوں نے دیکھا؟" نعمان بری طرح چیخ رہا تھا "اس حرام زادے نے یہ کیسٹ میرے گھر بھجوائی۔ میری بچی یہ دیکھ رہی تھی۔"

اس پر کچھ لوگوں نے تاسف بھرے تبصرے کیے۔ ایک شخص بولا۔ "سعید کی فکر کرو۔ سر کا زخم ہے' اسے ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

"پہلے تھانے میں رپورٹ درج کرانی ہوگی۔" دوسرے نے کہا۔ "یہ پولیس کیس ہے۔ ایف آئی آر کے بغیر کوئی مرہم پٹی نہیں کرے گا۔"

یہ سنتے ہی سعید نے تڑپ کر کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں' معمولی چوٹ ہے۔ میں نعمان بھائی کی بہت عزت کرتا ہوں۔ انہیں پولیس کے چکر میں نہیں پھنسانا چاہتا۔ انہوں نے غلط فہمی میں مجھے مارا ہے۔ یہ میری دکان کا کیسٹ نہیں۔"

"میں یہ بات نہیں مانتا۔" نعمان اب بھی آپے سے باہر ہو رہا تھا "نہ میرا بچہ نادان ہے' نہ جھوٹا ہے۔"

"پولیس کو بلاؤ" مجمعے میں سے کسی نے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری آپس کی بات ہے۔" سعید نے کہا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کسی بچے نے اس کی بیوی کو جھگڑے اور اس کا سر پھٹنے کے متعلق بتا دیا ہے اور اس کی بیوی تھانے کی طرف دوڑ گئی ہے۔

محلے کے ایک مدبر بزرگ نے کہا۔ "اس معاملے کا حل کیا ہے۔ سعید تو اس کیسٹ سے انکاری ہے۔ نعمان، تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں اس خبیث کا خون پی جانا چاہتا ہوں۔ میں اسے قتل کر دینا چاہتا ہوں۔" نعمان کا غصہ اب بھی سرد نہیں ہوا تھا۔

اس وقت چوہدری تھکا ہارا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ سعید کی دکان پر بھیڑ لگی دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں خدانخواستہ .... وہ تیز قدموں سے دکان کی طرف چل دیا۔ وہاں جو منظر دکھائی دیا، وہ اس کے خدشات کے برعکس لیکن اتنا ہی سنگین تھا۔ سعید کا خون میں نہایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ تڑپ گیا اور ہجوم کے درمیان جگہ بناتا ہوا آگے بڑھا۔ "یہ کیا ہوا سعید کو؟ اسے تو بخار بھی تھا۔"

"اسے نعمان بھائی نے مارا ہے۔" ایک لڑکے نے بتایا۔

چوہدری کا نیکی کو ترسا ہوا دل گداز ہوگیا۔ وہ سعید کے لئے ہمدردی سے سرشار ہوگیا "کیوں مارا ہے نعمان نے اسے۔"

"ٹرپل ایکس مووی کا چکر ہے" کسی نے کہا۔ دوسرے لوگوں نے مل کر تفصیل سنا دی۔

چوہدری اس وقت تک دکان کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ ٹرپل ایکس سن کر اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ "وہ تو میرے سامنے ہی دی تھی سعید نے۔" اس نے کہا۔

یہ سن کر نعمان خود کو چھڑانے اور سعید پر دوبارہ پل پڑنے کے لیے زور لگانے لگا۔ "دیکھا .... میں نے کہا تھا نا، اب چوہدری صاحب تو جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" سعید نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہے یہ بات؟" مدبر محلے دار نے چوہدری سے پوچھا۔

"سعید کو بخار تھا نا۔ میں اس کی عیادت کے لئے گلدستہ لے کر آیا تھا۔ میں

نے سب دیکھا اور سنا تھا۔ سعید نے اس شوکیس سے کیسٹ نکال کر دیا تھا۔" چوہدری نے اشارے سے بتایا۔

چند پرجوش نوجوان دکان میں گھس گئے۔ انہوں نے اس شوکیس میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں چوہدری کا لایا ہوا گلدستہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ وہاں سے بیسیوں کیسٹ بھی نکلے۔ ان پر سعید کی دکان کے نام کا اسٹکر بھی نہیں تھا۔

"لو دیکھ لو" نعمان نے فاتحانہ لہجے میں کہا "اب یہ کہے گا کہ یہ کیسٹ بھی اس کی دکان کے نہیں ہیں۔"

لڑکوں نے کیسٹ لگا کر دکھائے۔ وہ سب کی سب بلیو فلمیں تھیں۔ چوہدری انہیں دیکھ کر چکرا گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا "توبہ ... توبہ...." اس نے کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شریف گھروں کی لڑکیاں ایسی فلمیں دیکھتی ہوں گی۔"

"اب بولو۔ سچ کہہ رہا تھا نا میرا بچہ۔ رضوان اسی سے کیسٹ لے کر گیا تھا۔ چوہدری صاحب اس بات کے گواہ ہیں۔"

اس پر چوہدری کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے پلٹ کر نعمان کو دیکھا "تم کس بیٹے کی بات کر رہے ہو؟"

نعمان نے اپنے بیٹے رضوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ میرا بیٹا رضوان ہے۔ یہ کوئی انڈین فلم لینے آیا تھا اور سعید نے یہ منحوس اور ناپاک کیسٹ دی تھی۔ آپ تو گواہ ہیں اس کے۔"

چوہدری حق گوئی کا حق ادا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "نعمان .... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہارا بیٹا اس دکان پر نہیں آیا تھا۔"

نعمان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ابھی آپ نے ہی کہا چوہدری صاحب کہ...."

چوہدری نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیسٹ لینے تمہاری بیٹی رضیہ آئی تھی نعمان!"

یہ سن کر نعمان نے چوہدری پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ "یہ چوہدری سعید سے ملا

ہوا ہے۔ میری بچی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

اس پر چوہدری نے رضیہ اور سعید کی پوری گفتگو دہرا دی۔ سعید کا انکار کہ وہ ایسی فلمیں نہیں رکھتا' اس پر رضیہ کی طرف سے شہباز کا حوالہ۔ پھر رضیہ کی دھمکی اور سعید کی بے بسی اور اس نے آخر میں کہا۔ "مجھے تو اس وقت ٹرپل ایکس کا مطلب ہی معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں اس بچی کی پٹائی بھی کر دیتا۔"

"مجھے لگتا ہے' یہ چوہدری بھی اس گندے کاروبار میں ملوث ہے۔" نعمان نے کہا۔

"چوہدری صاحب کی بات ٹھیک ہی لگتی ہے" ایک نوجوان بولا "بہت لوگوں کو معلوم ہے کہ رضیہ اور شہباز کے درمیان چکر چل رہا ہے اور شہباز گندی فلمیں دیکھتا ہے.... بابر کے گھر جا کر اور میں نے کئی بار رضیہ کو بھی بابر کے ہاں جاتے دیکھا ہے۔"

نعمان نے خود کو چھڑایا اور چوہدری کے بھی دو چار ہاتھ دھر دیے۔ پھر لوگوں نے اسے قابو میں کرلیا۔

چند اور لڑکے بھی رضیہ اور شہباز کے راز فاش کرنے لگے۔ اب نعمان ان لوگوں سے تو نہیں لڑ سکتا تھا۔ "یہ میری بیٹی کو بدنام کیا جا رہا ہے۔"

محلے کے مدبر بزرگ نے سعید سے کہا۔ "چوہدری صاحب کی بات کے بعد بہتر یہی ہے کہ تم سچ بول دو۔"

"چوہدری جھوٹ بول رہا ہے۔" سعید نے چوہدری کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے حد نفرت سے کہا۔ "رضیہ میری دکان پر کبھی نہیں آئی۔ میں نے تو نعمان کی بیٹی کو کبھی دیکھا بھی نہیں اور میں سچ کہتا ہوں کہ یہ کیسٹ میری دکان کی نہیں ہے۔"

"یہ اتنے کیسٹ نکلنے کے بعد بھی تم یہی کہو گے؟" مدبر بزرگ نے کہا۔

سعید صرف ایک لمحے کو پریشان ہوا پھر اس نے کہا۔ "یہ بھی میرے نہیں۔ ایک شخص میرے پاس لایا تھا بیچنے کے لئے۔ میں نے کہا' دیکھ کر خریدوں گا' دیکھنے کی مجھے فرصت نہیں ملی۔"

چوہدری سعید کی ڈھٹائی پر حیران رہ گیا۔ "سعید .... جھوٹ بولنے کا فائدہ ؟"

"سعید جھوٹ نہیں بول رہا ہے' جھوٹا تو ہے چوہدری ! نعمان نے چوہدری کو را۔

صورت حال پیچیدہ ہوگئی تھی۔ مدبر بزرگ نے کہا۔ "پولیس کو بلاؤ بھئی' یہ پولیس ہی حل کرے گی۔"

"جی ہاں۔ ویسے بھی یہ پولیس کیس ہے۔" کسی نے ان کی تائید کی۔

"پولیس کیس کیسے ہے ؟" نعمان نے تڑپ کر کہا "سعید نے کہا تھا کہ یہ ہماری ی کی بات ہے' کیوں سعید؟"

"ہاں نعمان بھائی۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" سعید نے بہت خلوص کہا۔ "اور چوہدری کو تو ہم دیکھ لیں گے۔"

چوہدری دنیا کی نیرنگی پر اش اش کر رہا تھا کہ پولیس آگئی۔ پولیس کے لئے تو وہ ہی گرم کیس تھا۔ انہوں نے نعمان اور سعید کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چوہدری نے کے لئے پلٹا تو اسے ایس آئی نے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو چوہدری۔ تمہیں تھانے چلنا ہے۔"

چوہدری کا یہ سن کر دم نکل گیا۔ "کیوں جناب؟"

"تم بہت اہم گواہ ہو۔"

○

لیکن تھانے پہنچنے پر صورتحال بدل گئی۔ نعمان اور چوہدری تھانے میں تھے۔ کو دو کانسٹیبل مرہم پٹی کے لئے لے گئے تھے۔ وہ وہاں سے آیا تو تفتیش شروع یہ جان کر چوہدری کے دیوتا کوچ کر گئے کہ نعمان اور سعید اس کے خلاف یکجا ہیں۔ وہ اسے مجرم بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

ر' مجھے چوہدری نے آکر بتایا کہ سعید نے میری بیٹی کو گندی کیسٹ دی ہے۔" نے کہا۔ "اس پر میں مشتعل ہوگیا اور میں نے اس کے سر پر سریا مار دیا۔"

"جبکہ نعمان بھائی کی بیٹی میری دکان پر کبھی نہیں آئی۔ میں اسے جانتا ہی نہیں

ہوں۔" سعید نے فریاد کی۔

"اور جو بغیر سٹیکر کی فلمیں برآمد ہوئی ہیں تمہاری دکان سے۔" تفتیش کرنے والے ایس آئی نے اسے گھورا۔

"وہ تو چوہدری صاحب میرے پاس رکھوا کر گئے تھے۔ کہہ رہے تھے' دیکھ لینا۔ اچھی لگیں تو خرید لینا۔ مجھے تو سر' پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ بلیو فلمیں ہیں۔"

"خدا کا خوف کر سعید!" چوہدری نے بلبلا کر کہا۔ "میرے گھر میں تو وی سی آر ہے ہی نہیں۔"

"تمہارے گھر میں سمندر ہے نہ دریا ہے' نہ ندی ہے اور نہ کوئی جھیل۔ پھر بھی تم مچھلی کا کاروبار کرتے ہو۔" سعید نے کہا۔

ایس آئی نے چوہدری کو گھورا۔ "تم وہ کیسٹ کہاں سے لائے تھے؟"

"آپ اس جھوٹے کی بات کا یقین نہ کریں تھانیدار جی۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"سر جی' یہ دس بجے میری دکان پر آیا تھا۔ اس کا لایا ہوا گلدستہ تو دیکھا ہے نا آپ نے۔"

"ایس آئی نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہا۔ "ان تینوں کو حوالات میں بند کر دو۔"

"مجھے کیوں جناب' میں تو گواہ ہوں۔" چوہدری نے احتجاج کیا۔

"اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ تم بڑے مجرم ہو۔" ایس آئی نے فیصلہ سنایا۔ "لے جاؤ انہیں۔"



چوہدری محکوم اللہ کا بہت برا حال تھا۔ ایک ہی دن میں وہ دوسرا موقع تھا کہ سچ بولنے' حق کا ساتھ دینے اور سچی گواہی دینے کی وجہ سے وہ حوالات میں محبوس ہوا تھا۔ اس بار بہرحال اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دن بھر کی تھکن کے بعد اس وقت جب اسے نیند کی اور اس کے جسم کو آرام کی ضرورت تھی' یہ ب

ے بہت بری لگ رہی تھی۔ اس کا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ وہ گھر جاکر بستر پر گر جانا چاہتا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بجا تھا۔ حوالات میں بند ہوئے بھی اسے رہ گھنٹے سے زیادہ ہوچکا تھا۔ پولیس والے بھی انہیں حوالات میں ڈال کر گویا بھول ئے تھے۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جان کیسے چھوٹے گی؟ پولیس والے چاہتے کیا ں؟

بہرحال وہ مایوس نہیں تھا۔ بلکہ پرامید تھا۔ کم از کم یہاں کی صورت حال نے کی صورت حال کے مقابلے میں تو بہت بہتر تھی۔ اور اللہ نے اسے وہاں سے ی آسانی سے نجات دلا دی تھی۔ مرمت تو اس کی بہت ہوئی تھی مگر یہ کم نہیں تھا ہ وہ عزت سے تھانے سے نکل آیا تھا۔ اللہ یہاں بھی مدد کرے گا' وہ مسبب الاسباب ہے۔

اسے یہ الجھن بھی پریشان کر رہی تھی کہ سعید اور نعمان دونوں ہی اس سے تہ ہو گئے اور ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ کیوں؟ جبکہ ذرا دیر پہلے نعمان ے سعید کا سر پھاڑا تھا۔ پھر ان میں یہ ایکا کیسا؟ اور وہ دونوں مل کر اسے پھنسانے کی شش کر رہے تھے۔

بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے سعید سے پوچھا۔ "سعید .... تم مجھ سے نی کیوں کر رہے ہو؟"

"دشمن سے دشمنی ہی کی جاتی ہے۔" سعید نے بے رخی سے کہا۔

"مگر میں تو تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں خون میں نہایا ہوا دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔"

"نادان دوست کہو چوہدری اور نادان دوست دشمن سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ تم کیسٹ کی گواہی دے کر میرے ساتھ دشمنی نہیں کی .... اور تم نے میری تمام ٹیں بھی پکڑوا دیں۔"

"اور تم نے انہیں میرے کھاتے میں ڈال دیا۔" چوہدری نے شکایتاً کہا۔ "تم جھوٹ بولا۔"

"خود کو بچانے کے لیے میں اور کیا کرتا؟"

"اور نعمان نے تمہارا سر پھاڑا تھا' پھر بھی تم اس کا ساتھ دے رہے ہو؟"

"یہ مصلحت ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات بڑھے۔ اس لیے سر پھٹنے کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ تھانے پولیس کی نوبت آئے۔ اس لیے میں نے رضیہ کا نام بھی نہیں لیا۔"

نعمان سے کچھ پوچھنا ہی فضول تھا۔ چوہدری اس کا نکتہ نظر سمجھ سکتا تھا۔ اس کی تو عزت کا معاملہ تھا۔ اس کی بیٹی کی بدنامی ہو رہی تھی۔

دو بجے متعلقہ ایس آئی تفتیش کے لئے حوالات میں آیا۔ پوچھ گچھ ہوئی تو چوہدری اکیلا رہ گیا۔ وہ خود بھی اپنے کو جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوگیا۔ نعمان اور سعید نے کیس ہی بدل دیا تھا۔ سعید نے ٹرپل ایکس کیسٹوں کو چوہدری سے منسوب کر دیا۔

"میں تو یہ گندا دھندا کرتا ہی نہیں ہوں۔ اور چوہدری کے دیئے ہوئے کیسٹ میں نے دیکھے ہی نہیں تھے۔"

"اور تم کس کیسٹ کی شکایت لیکر سعید سے لڑنے گئے تھے؟" ایس آئی نے نعمان سے پوچھا۔

"کیسٹ کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔" نعمان نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم نے اس کا سر کیوں پھاڑا؟"

"وہ تو پیسوں کا جھگڑا تھا۔ سعید نے مجھ سے قرض لیا تھا اور واپس نہیں کر رہا تھا' مجھے اس پر غصہ آگیا۔"

ایس آئی اب چوہدری کی طرف مڑا۔ "تم کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟"

اب چوہدری کو طرارہ آگیا۔ بلاوجہ اسے گندگی میں لتھڑا جا رہا تھا۔ "یہ سعید جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا ان کیسٹوں سے کوئی تعلق نہیں۔ سعید ہی یہ گندا کاروبار کرتا ہے اور جو جھگڑا نعمان اور سعید کے درمیان ہو رہا تھا' اس کی وجہ ایسی ہی ایک کیسٹ تھی۔ اس کے گواہ محلے کے تمام ہی لوگ ہیں۔ کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔" یہ کہہ کر چوہدری نے جھگڑے کی پوری تفصیل سنا دی۔

سب کچھ سن کر ایس آئی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اے ایس آئی شفقت کو بلایا۔ "تم اصل گواہ کو چھوڑ آئے ہو۔" اس نے شفقت سے کہا۔ "اب

شاید موقعے کا کوئی گواہ تو تمہیں نہیں ملے گا۔ ایسا کرو' نعمان کا بیٹا ہے دس سال کا' رضوان نام ہے۔ تم اسے لے کر آؤ فوراً۔"

"موقعے کا ایک گواہ بھی لے آؤں گا۔ ایک لڑکا ہے جنید۔" شفقت نے کہا۔

اس پر نعمان اور سعید کے چہرے فق ہو گئے۔ "بات کیوں بڑھاتے ہو حوالدار جی!" نعمان نے کہا۔ "ہم بتا رہے ہیں نا۔۔۔"

"اور ہمیں تفتیش کرنی ہے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔" ایس آئی نے خشک لہجے میں کہا۔ "شفقت تم جاؤ اور انہیں لے آؤ۔"

دس منٹ بعد گواہ جنید اور رضوان تھانے میں موجود تھے۔ ادھر لال دین کی قیادت میں چوہدری کی گلی کے کچھ لوگ چوہدری کو چھڑانے کیلئے بھی آ گئے۔ لال دین اثر و رسوخ والا آدمی تھا اس لئے بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں انسپکٹر صاحب چوہدری میرا پڑوسی ہے۔ یہ کوئی غلط دھندا نہیں کرتا۔ یہ نیک اور شریف انسان ہے۔"

"مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ بے قصور ہے۔" ایس آئی نے کہا۔ "لیکن پلیز' ہمیں تفتیش کرنے دیں۔"

تفتیش بہت مختصر ثابت ہوئی۔ رضوان پہلے تو وہی بات کہتا رہا کہ کیسٹ لینے وہ گیا تھا لیکن دو تھپڑ پڑے تو اس نے سچ اگل دیا۔ چوہدری کے بیان کی تائید ہو گئی۔ ادھر جنید نے بیان دیا کہ جھگڑا ایک گندی کیسٹ پر ہو رہا تھا۔

"اب تو مجھے تمہاری بیٹی رضیہ کو بھی تھانے بلوانا پڑے گا۔" ایس آئی نے نعمان سے کہا۔

نعمان گڑگڑانے لگا۔ "خدا کے لئے' مجھ پر رحم کریں۔ میری ایک بات سن لیں۔"

علیحدگی میں کوئی بات ہوئی اور معاملہ صاف ہوگیا۔ نعمان اور سعید کو تو اس وقت نہیں چھوڑا گیا مگر چوہدری کو رہائی مل گئی۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے چوہدری نے لال دین سے کہا۔ "تمہارا شکریہ لال دین' تمہیں میرا اتنا خیال ہے۔"

"بھئی تم میرے پڑوسی ہو' اور بہت اچھے پڑوسی ہو۔ میں تمہیں دکھ یا تکلیف میں تو نہیں دیکھ سکتا۔" لال دین نے بے حد خلوص سے کہا۔

"لیکن تم اچھے پڑوسی نہیں ہو۔ تم نے محلے والوں کے سروں پر مرغی خانہ بنا رکھا ہے' جو سراسر ناجائز ہے۔"

"وہ اپنی جگہ چوہدری۔ بات تمہاری سچی ہے لیکن میری مجبوری ہے۔ ویسے میں ایک زمین خریدنے کے چکر میں ہوں۔ سودا پٹ گیا تو مرغی خانے لے جاؤں گا یہاں سے۔"

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" چوہدری نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" لال دین آستینیں چڑھانے لگا۔

"تم پہلے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو' آئندہ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔"

"یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ ضرورت پڑی تو میں تمہارے مرغی خانے کو بم سے اڑا دوں گا۔"

"تم نے گواہوں کے سامنے یہ بات کہی ہے۔ میں انسداد دہشت گردی والوں کو بتاؤں گا اور تمہیں ابھی اندر کرا دوں گا۔"

"گلی کے دوسرے لوگ بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ "لال دین! ابھی تم نے چوہدری کو چھڑایا ہے اور اب اندر کرانے کی بات کر رہے ہو۔" کسی نے کہا۔

"اس نے مجھے نہیں چھڑایا۔" چوہدری کو اب یہ بات گالی کی طرح لگی۔ "سچی بات سامنے آئی تو انہوں نے مجھے چھوڑا۔"

"اور مجھے اس کی کوئی پروا بھی نہیں۔" لال دین نے تڑخ کر کہا۔ "بے شک وہ اسے پھانسی چڑھا دیں۔"

اس کے بعد دونوں منہ پھلائے چلتے رہے۔ گلی میں پہنچے تو چوہدری نے دوسرے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر میں چلا گیا۔

"اتنے دن تمہارے ساتھ گزارے' مگر میں تمہیں سمجھ نہیں سکی۔" رحمت نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "اور ایک دن میں پتہ چل رہا ہے کہ تم کیا ہو؟ پتہ نہیں کیا کیا کرتے پھرتے ہو تم۔"

چوہدری کا دماغ الٹ گیا۔ "کیا بک رہی ہو؟"

"صبح وہ چکر تھا اور رات کو تھانے کی نوبت آ گئی۔ تم تو چھپے رستم ثابت ہو رہے ہو۔"

اب چوہدری اسے کیا بتاتا کہ سہ پہر بھی تھانے میں ہی گزاری تھی۔ اس میں ٹ کرنے کی طاقت نہیں تھی اس وقت وہ بس سو جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بستر پر جا کرا۔۔ اور گرتے ہی بے سدھ ہو گیا۔



اس رات چوہدری خواب دیکھتا رہا۔ خواب میں وہ نیکی کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ وہ جنگل جنگل بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں چھالے تھے اور جسم پر جابجا کانٹوں سے لگی ہوئی خراشیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا لیکن نیکی اسے نہیں مل رہی تھی۔

اچانک ایک بزرگ اس کے سامنے آ گئے۔ "کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے تو؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے ایک نیکی کرنی ہے۔"

"نیکی تو توفیق سے ہے۔ اللہ کے حکم سے ہے۔" بزرگ نے کہا۔ "توفیق کو نہیں مانے گا تو نیکی کہاں سے نصیب ہو گی۔ پہلے اپنے نظریات تو درست کر۔"

"جب مجھ میں نیکی کا جذبہ موجود ہے تو توفیق کی محتاجی کیوں؟ میرا ارادہ کافی نہیں ہے۔"

"نہیں۔۔۔ توفیق کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے۔ آدمی کے پاس دنیا اور آخرت کے لئے جو کچھ بھی اچھا ہے' اللہ کی طرف سے ہے اور جو برا ہے' وہ آدمی کے اپنے نفس کی طرف سے۔ اس کے اعمال کی وجہ سے۔"

چوہدری کی آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو گھر میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ ارے فجر کی نماز گئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ نیکی تو ملی نہیں۔ فرض بھی قضا ہو گیا۔ اچانک اسے بھوک کا احساس ہوا' اسے یاد آیا کہ اس نے رات کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

"رحمت۔۔۔ جلدی سے ناشتہ دو۔" اس نے آواز لگائی۔ "بہت بھوک لگی ہے مجھے؟"

رحمت پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں آئی۔ "اب کھل گئے ہو' پردہ اٹھ گیا ہے تو

نو بجے سو کر اٹھا کرو گے۔ بچے تک اسکول جا چکے ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ ناشتہ دو مجھے۔" چوہدری نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ جسم الگ بری طرح دکھ رہا تھا۔

"اب دانت صاف کئے منہ دھوئے بغیر ناشتہ کیا کرو گے؟" رحمت نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم ناشتہ لگاؤ' میں آتا ہوں۔"

باتھ روم سے لیکر ناشتہ تک چوہدری خواب اور اس کے حوالے سے مولانا کی تقریر کے جلسے کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ توفیق کا معاملہ تو اس وقت بھی اٹکا تھا۔ تقریر سنتے ہوئے بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ کیا انسان توفیق کے بغیر نیکی نہیں کر سکتا۔ نیکی کا جذبہ تو انسان کو ملا ہے اور اس کے ارادے کی ایک اہمیت ہے۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ مولانا سے یہ بات پوچھے لیکن وہ طبعاً" بہت شرمیلا تھا اور وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔

اس وقت اسے مولانا کی تقریر کا وہ حصہ یاد آنے لگا۔ انہوں نے کہا تھا۔ نیکی کرتے وقت صلے کا تصور جتنا دھندلا ہو' اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ عمل تو نیتوں کا حال جاننے والے کے اس احسان کا ہدیہ تشکر ہے' جو اس نے آپ پر نیکی کی توفیق عطا کر کے کیا۔ پھر صلہ کیا؟ اس لئے کہ جو کچھ آپ نے کیا' وہ اللہ کی دی ہوئی توفیق کے مطابق نہیں' اس سے کم ہے۔ فرض کیجئے' آپ بازار میں گھوم رہے ہیں۔ ایک ضرورت مند آپ سے سو روپے کا سوال کرتا ہے۔ آپ کی جیب میں اس وقت 70 روپے ہیں۔ بیس روپے اپنے لئے بچا کر آپ اسے پچاس روپے دیتے ہیں تو کیا یہ نیکی بقدر توفیق ہے؟ جی نہیں' آپ کی کلائی پر ہزار روپے کی گھڑی بھی تو بندھی ہوئی ہے۔ کیا آپ اس کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ نے آپ کو توفیق سے بھی نوازا اور وسائل سے بھی۔ اس کے باوجود آپ اس ضرورت مند کو پچاس روپے دے کر ٹرخا رہے ہیں۔ آپ کی مدد کے باوجود وہ پھر ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے اور پھر اس وہم سے کہ آپ نے بڑی نیکی کی ہے' آپ اپنی گردن اکڑا کر دوسرے لوگوں کو

حقارت سے دیکھ رہے ہیں' جنہوں نے ضرورت مند کو کچھ بھی نہیں دیا۔ بے شک آپ نے نیکی کی اور آپ کو اس کا اجر ضرور ملے گا لیکن آپ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ نیکی کے اس اجر سے محروم رہیں گے' جس کی کوئی انتہا نہیں۔ نیکی اگر عاجزی اور انکسار کے ساتھ سر جھکا کر اس تصور کے ساتھ کریں کہ آپ اس پر شرمندہ ہیں کہ توفیق اور وسائل سے نوازے جانے کے باوجود کسی مستحق کی مدد اپنی بساط سے کم کر رہے ہیں' تو یقین کیجئے' اس بے نیاز معبود کو عاجزی بہت پسند ہے اور گھمنڈ سخت ناپسند ہے اور عاجزی تو حق ہے آپ کا کیونکہ آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ کے دیئے ہوئے مال یا طاقت کے زور پر کر رہے ہیں تو اللہ آپ کی عاجزی سے خوش ہو کر آپ کو اتنا اجر دے سکتا ہے جو کائنات کی وسعتوں اور تمام انسانوں کے مال و دولت سے بڑھ کر ہو۔ سو دوستو! دراصل نیت کی بے غرضی اور دل کی عاجزی نیکی کا حسن ہے اور توفیق اللہ کی جانب سے ملتی ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی نیکی اس انداز میں بقدر توفیق کر سکے تو اللہ خوش ہو گا اور اس شخص کے دونوں جہان کے دلدر دور ہو سکتے ہیں۔

اس بار غور کرنے پر چوہدری کی سمجھ میں کچھ آیا' کچھ نہ آیا۔ توفیق تو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ کل اس نے ارادہ کیا' نیکی کے لئے کیا کیا جتن کیے لیکن نیکی اسے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ یقیناً توفیق کا فرق ہے۔ اللہ نے توفیق نہیں دی تو وہ نیکی نہیں کر سکا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ توفیق کی اہمیت کو نہیں سمجھ رہا تھا اور اللہ اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

لیکن بقدر توفیق کو وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ بہرحال اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اس نے توفیق کو سمجھ لیا ہے۔ اس لئے اب وہ نیکی اس کے لئے آسان ہو جائے گی' جو اللہ کو پسند آئے اور اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔

اس نے پھر سے نیکی کا عزم کیا اور کام پر جانے کیلئے تیار ہونے لگا۔ کپڑے بدلتے ہوئے اسے سیٹھ جسیم کے دیئے ہوئے دس ہزار روپے نظر آئے۔ اس رقم پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ بہرحال' اس سے وہ کوئی نیکی تو نہیں کر سکتا۔ اس نے وہ رقم جیب میں رکھی اور رحمت کو

پکارا۔

"اب کیا ہے؟" رحمت نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے پیسے چاہئیں۔" چوہدری نے نرم لہجے میں کہا۔

رحمت نے سو روپے کا ایک نوٹ لا کر اسے تھما دیا۔ "یہ لو۔"

چوہدری کو بہت برا لگا۔ اس رقم میں وہ کیا نیکی کر سکتا تھا۔ "مجھے زیادہ کی ضرورت ہے۔"

"کتنے دوں؟" رحمت نے چڑ کر پوچھا۔

"جو تمہارے پاس ہے' سب دے دو۔"

"ارے واہ۔" رحمت نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بڑا گل کھلانا ہے۔"

"دیکھ رحمت' مجھے کوئی بہت بڑی نیکی کرنی ہے۔"

"وہ کل والی چھوٹی تھیں کیا؟"

چوہدری کو غصہ تو بہت آیا لیکن نیکی کی جستجو کا آغاز وہ غصے سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ رحمت کو سمجھانے لگا۔ "تم مجھے برسوں سے جانتی ہو رحمت۔ میں کسی برائی میں' کسی عیب میں نہیں ہوں۔ اور سچ یہ ہے کہ میں بہت نیک بننا چاہتا ہوں۔ ان الزامات پر مت جاؤ۔ یہ شاید میری آزمائش ہے۔"

رحمت کا دل پسیج گیا۔ "جس راستے پر الزام لگے اسے چھوڑ دینا چاہئے۔"

"چاہے وہ نیکی کا راستہ ہو؟"

رحمت لاجواب ہو گئی۔ اس نے پانچ ہزار روپے لا کر چوہدری کو دیئے۔ "بس یہی ہیں میرے پاس۔"

"دعا کرنا آج مجھے نیکی نصیب ہو جائے۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی' جاؤ۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" رحمت کے لہجے میں خلوص تھا۔



کلفٹن جاتے ہوئے چوہدری محکوم اللہ کے ذہن میں اچھے خیالات کا ہجوم تھا۔ اس کے کانوں میں مولانا کی پرسوز آواز گونج رہی تھی۔ وہ جسم و جاں کی ہم آہنگی کے ساتھ اس نیکی کے تصور میں سرشار تھا' جو اسے آج کرنا تھی۔ وہ نیکی سے متعلق کوئی قابل عمل منصوبہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ پہنچا تو اکبر دکان کھول چکا تھا۔ اس نے دکان سنبھالی اور اکبر کو مچھلیاں خریدنے کیلئے بھیج دیا۔

مچھلی کی قسموں اور ذائقوں کے بارے میں اکبر کی معلومات مستند تھیں۔ وہ روز کبھی کیماڑی' کبھی منوڑا چلا جاتا تھا۔ وہاں اچھی مچھلی تلنا ایک فن تھا۔ اس لحاظ سے وہ فن کار تھا۔ اس میں فنکاروں والی تمام ہی خوبیاں تھیں۔۔۔ حساسیات' جذباتیت' لاابالی پن' پیسے سے بے نیازی اور احمقانہ حد کو پہنچی ہوئی ایمان داری۔ اس آخری صفت کی وجہ سے چوہدری اس کی بہت قدر کرتا تھا۔

اکبر کے علاوہ نو دس سال کا ایک لڑکا ٹنگو بھی اس کے پاس ملازم تھا۔ اس کا کام دور بیٹھے ہوئے گاہکوں کو پلیٹ میں مچھلی پہنچانا تھا۔ رش ہوتا تو اکبر بھی یہی کام کرتا۔ پیسے وصول کرنا اکبر کا کام تھا۔

اکبر کو بھیجنے کے بعد چوہدری اپنی سوچوں میں گم ہوگیا۔ بقدر توفیق کی پھانس اب تک اس کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ دکان پر کوئی کام' کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس نے ساحل کا جائزہ لیا۔ ساحل سنسان تھا۔ اکا دکا جوڑے نظر آرہے تھے لیکن وہ ضرورت کی ہر چیز سے بے نیاز ایک دوسرے میں گم تھے۔ انہیں تنہائی کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

چوہدری پھر دکان میں آبیٹھا اور نیکی کی فکر میں لگ گیا۔

"السلام علیکم چوہدری صاحب۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور حیران رہ گیا۔ وہ ایک باوردی ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیسے ہو چوہدری صاحب جی!"

چوہدری پولیس والے کے تپاک پر حیران و پریشان تھا۔ اس عنایت کی وجہ اس ں سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ "ٹھیک ہوں الحمدللہ۔" اس نے کہا۔ "پیسے لینے آئے ہو؟"

پولیس والے نے دونوں کان چھوتے ہوئے کہا۔ "توبہ چوہدری صاحب۔ آپ ے پیسے کون لے گا۔ ایس ایچ او صاحب نے سلام دیا آپ کو اور کہلایا ہے کہ کبھی سی بھی طرح کی پریشانی ہو تو یہاں کسی بھی وردی والے کو حکم کر دیجئے گا۔ ہم سب ر طرح سے حاضر ہیں آپ کے لئے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ بڑی مہربانی ان کی۔" چوہدری نے شرمندگی سے کہا۔

اس پر چوہدری کو سیٹھ جسیم یاد آگیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ بلاوجہ ہی کی بن گیا۔۔۔ اور اس کا اجر اسے دنیا میں ملے جا رہا تھا۔ یہ وہ نیکی تھی' جس پر وہ رمندہ تھا لیکن وہ کل بھی آڑے وقت میں اس کے کام آئی تھی اور اب تو لگتا تھا کہ ں کا صلہ جاریہ اسے ملتا رہے گا۔

پھر اسے سیٹھ کیلئے مچھلی ابالنے کا خیال آیا لیکن اکبر نے کہا تھا کہ مچھلی وہ الے گا چنانچہ چوہدری یہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر پھر نیکی کی سوچوں میں گم ہو یا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یہاں بیٹھے بیٹھے تو وہ نیکی کرنے سے رہا۔ اس کیلئے تو ے بھاگ دوڑ' عملی جدوجہد کرنا ہوگی لیکن اکبر کے آنے تک وہ یہاں سے نہیں ہل کتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے اسے ایک محاورہ یاد آیا۔ چراغ تلے اندھیرا۔ مولانا نے کہا تھا۔۔۔ امنے کی چیزیں چھوڑ کر دور دیکھنا اچھی بات نہیں۔ آدمی کو پہلے اپنا گھر' اپنا محلّہ ٹھیک رنا چاہئے۔ اس پر چوہدری نے سوچا کہ آدمی کاٹھیا بھی تو اس کا گھر ہی ہوتا ہے۔۔۔ سرا گھر۔"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے دیوار کے پاس ٹنگو بیٹھا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی ہدری کے ذہن میں ایک مشین سی چل پڑی۔

یہ ٹنگو صبح سے رات تک یہاں کام کرتا تھا۔ مچھلی کی پلیٹیں دور بیٹھے ہوئے

لوگوں تک پہنچاتا' پھر پلیٹیں سمیٹتا' انہیں دھوتا اور خشک کرتا۔ اتنا سا بچہ ! رات کو اسے کیسی تھکن ہوتی ہو گی۔ اس کا جسم کس بری طرح دکھتا ہو گا۔

"پھر اسے دوسرا زاویہ سوجا۔ یہ کوئی کام کرنے کی عمر ہے یہ تو علم حاصل کرنے کی' کھیلنے کودنے کی عمر ہے۔ اس کے اپنے بچے کیسے صاف ستھری یونیفارم پہن کر اسکول جاتے ہیں اور اسکول سے واپس آ کر صرف کھیل میں لگے رہتے ہیں۔ مار باندھ کر پڑھنے کو بٹھایا جائے' تب کہیں پڑھتے ہیں۔ کیسی بے فکری کی زندگی ہے ان کی۔ کھیلنے' کھانے اور پڑھنے کے سوا کچھ کام نہیں اور وہ بھی اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور ایک یہ چھوٹا سا بچہ ہے ہر چیز سے' ہر نعمت سے' بے فکری سے محروم۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے دن بھر مشقت کرتا ہے اور ہے کتنا چھوٹا سا۔ چھ سات سال سے زیادہ کا نہیں لگتا۔ کہتے ہیں کہ محنت مشقت سے بچوں کی نشوونما رک جاتی ہے۔ کہیں یہ اتنا ہی نہ رہ جائے۔

چوہدری نے پر ٹنگو کو دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ شاید پریشان ہو' کون جانے' بھوکا ہو' گھر میں بھی فاقہ ہو۔ چوہدری کا دل کانپنے لگا۔ یہ بچہ دن بھر محنت کر کے اس مہنگائی کے زمانے میں تیس روپے گھر لے کر جاتا ہے۔ اس میں کوئی گھر چلتا ہے اور ان تیس روپوں کیلئے وہ کتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔ اپنے بے فکری کے دن' اپنا خوبصورت بچپن' اپنے معصوم شوق اور خواہشیں اور سب سے بڑھ کر تعلیم۔

چوہدری کا دل بھر آیا۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ وہ اس بچے سے محنت کراتا ہے اور اسے صرف تیس روپے روز دیتا ہے۔ جبکہ اللہ نے اسے اتنا دیا ہے کہ وہ اس کی تعلیم کا خرچ بھی اٹھا سکتا ہے۔ اسے ڈھنگ کے کپڑے بھی دے سکتا ہے اور اس کے گھر کی دال روٹی بھی چلا سکتا ہے۔

اس نے تصور میں اپنے سات سالہ بیٹے کو ٹنگو کی جگہ رکھ کر دیکھا تو تھرا گیا۔ جو میں اپنے بچے کیلئے گوارا نہیں کر سکتا' وہ دوسرے کے بچے کیلئے کیوں گوارا کرتا ہوں۔ یہ تو سنگ دلی ہے اور دل میں گداز اور نرمی نہ ہو تو آدمی نیکی کہاں سے کرے گا۔ وہ باقاعدہ رونے لگا۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ یہ سوچتے ہوئے وہ پھر توفیق کو نظر

انداز کر رہا ہے۔

چوہدری نے سوچا' نیکی اس کے سامنے موجود ہے۔۔ اور وہ ہے کہ اس کی جستجو میں پھر رہا ہے۔ کیا حماقت ہے۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور ٹنگو کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے قریب بیٹھا آتی جاتی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اپنی محرومیوں کو شمار کر رہا تھا۔

"ٹنگو۔۔ او ٹنگو!" چوہدری نے اسے پکارا اور اپنے آنسو پونچھ لئے۔ دیر آید درست آید۔ اس نے سوچا۔ غلطی کی اصلاح کرنا بھی نیکی ہے اور کسی کی مدد کرنا تو ہے ہی نیکی۔ دوسری پکار پر ٹنگو نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے سیٹھ!"

"ادھر تو آ۔"

ٹنگو اس کے پاس آ گیا۔ چوہدری نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ خوش شکل بچہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیلگوں سمندر کا رنگ جھلک رہا تھا۔ بس وہ کمزور بہت تھا ورنہ یقیناً خوبصورت کہلاتا۔ "تو وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟"

"سوچ رہا ہوں سیٹھ۔"

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

چوہدری کو تشویش ہوئی بچہ سوچ رہا ہے۔۔ اور کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے۔ تو نے رات کھانا کھایا تھا؟"

"ہاں سیٹھ روز کھاتا ہوں۔"

"اور ناشتہ کیا تھا؟"

"ہاں سیٹھ وہ بھی روز کرتا ہوں۔"

"رات کیا کھایا تھا؟"

"تمہاری دی ہوئی مچھلی۔"

چوہدری کا دل بھر آیا۔ بچی کھچی مچھلی' جو کسی کو نہ دو تو سڑ جائے۔ یہ بھی کوئی نیکی ہے۔ یہ ان بے چاروں کا رات کا کھانا ہے۔ "تیری کتنی عمر ہے ٹنگو؟"

"سات سال ہے سیٹھ۔"

"سات سال؟ تو جب کام پر آیا تو' تو نے کہا کہ تیری عمر نو سال ہے۔"

ٹنگو کھسیائی ہوئی ہنسی ہنسنے لگا۔ "وہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بھائی نے کہا تھا کہ سات سال کہوں گا تو تم مجھے کام پر نہیں رکھو گے۔" اس کا اشارہ اکبر کی طرف تھا۔

ہائے ری مجبوری۔ چوہدری نے دل میں سوچا۔ ضرورت کے لئے آدمی کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ "تو جھونپڑی میں رہتا ہے؟"

"نہیں سیٹھ!"

چوہدری کا دل ڈوبنے لگا۔ "فٹ پاتھ پر سوتا ہے؟"

"نہیں سیٹھ۔ ہمارا مکان ہے۔"

چوہدری نے تفتیش روک دی۔ کچا مکان ہی ہو گا۔ اسے خیال آیا' بچہ یتیم تو نہیں۔ "تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ٹنگو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تیرا باپ بیمار ہے؟"

اس بار انکار میں سر ہلا۔

"ماں ٹھیک ٹھاک ہے؟"

سر کی اثباتی جنبش!

"باپ بہت بوڑھا ہے؟"

سر کی انکاری جنبش!

"بہنیں بہت ہوں گی؟"

"ایک بھی نہیں ہے سیٹھ۔"

"کوئی بڑا بھائی نہیں ہے؟"

"دو بڑے بھائی ہیں سیٹھ۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

چوہدری نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "دونوں بھائی بے روزگار ہیں۔"

"دونوں کام کرتے ہیں سیٹھ۔ ایک ابا کے ساتھ موٹر مکینک کا کام کرتا ہے۔ را خراد مشین چلاتا ہے۔" ٹنگو نے کہا۔ "مگر بات کیا ہے سیٹھ!"

"میں تیری بھلائی کا سوچ رہا ہوں۔" چوہدری نے بے حد عاجزی سے کہا۔ تجھے اسکول میں داخل کراؤں گا۔ یونیفارم اور کتابیں دلاؤں گا اور تجھے تیس بھی دوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا سیٹھ۔" ٹنگو نے ٹکا سا جواب دیا۔

"کیوں؟" چوہدری نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ایک تو میں مفت کے پیسے نہیں لے سکتا۔"

اس کی خودداری نے چوہدری کو بہت متاثر کیا۔ یہ ہوتی ہے عظمت۔ اس نے ں سوچا۔

"دوسرے یہ کام تو میرے ابا بھی کر سکتے تھے۔" ٹنگو نے مزید کہا۔ "لیکن وہ ہیں کہ آدمی پڑھ لکھ کر کہیں کا نہیں رہتا۔ چودھویں پاس کر کے بھی نوکری نا پھرتا ہے پھر نوکری مل جائے تو بھی موٹر مکینک سے کم کماتا ہے۔ تو کیا فائدہ سال وقت اور پیسے برباد کرنے کا۔

چوہدری کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ ہمیشہ تعلیم سے محرومی کے احساس سے بہت ہو جاتا تھا۔ حالات نے اسے تعلیم مکمل کرنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ اور کہہ رہا تھا کہ اسے موقع ملنے کے باوجود پڑھنے نہیں دیا جاتا۔ "تیرا باپ بھی کماتا ور دو بھائی بھی۔ پھر تو یہاں تیس روپے میں خواری کیوں کرتا ہے؟" اس نے ل سے پوچھا۔

"وہ جی میں سارا دن کھیلتا تھا۔ مجھے کرکٹ کا بہت شوق تھا۔" ٹنگو کی آنکھیں لگیں۔ "میں بہت اچھا کھیلتا تھا۔ پھر میری ماں نے ابا سے کہا کہ لڑکا برباد ہو رہا حرام خور ہو جائے گا۔ اسے کسی دھندے سے لگاؤ۔ اس لئے میں تمہارے پاس

"اچھا۔۔ اگر میں تجھے الگ ٹھیلا لگوا دوں تو۔۔" چوہدری کا لہجہ نیکی سے چھلک

رہا تھا۔

"نہیں سیٹھ۔ مجھے مچھلی نہیں بیچنی۔" ٹنگو نے بے حد حقارت سے کہا۔ "یہاں تو مجھے محنت کا عادی ہونے کیلئے لگایا گیا ہے اور اس لئے بھی کہ میرا قد چھوٹا ہے۔ ابھی میں خراد پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا لمبا ہو جاؤں تو بھائی کے ساتھ جا کر خراد کا کام سیکھوں گا۔"

چوہدری کو اپنی پیشکش کے بعد اپنا سینہ ایک انجانی خوشی سے' نیکی کے احساس سے پھولتا محسوس ہوا تھا مگر ٹنگو کا جواب سن کر اسے ایسا لگا کہ وہ غبارہ تھا اور اس جواب نے اس میں پن چبھو دی ہے۔ اب آہستہ آہستہ اس میں سے ہوا نکل رہی ہے۔ "تیرا ابا کرتا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"گاڑی کھاتے پر بہت بڑا گیراج ہے ان کا۔"

یہ جواب سن کر غبارے میں سے ہوا بہت تیز آواز کے ساتھ نکل گئی۔ "ٹھیک ہے' تو جا۔" اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا اور اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔



چوہدری محکوم اللہ مایوس نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مایوسی کفر ہے۔۔۔ اور وہ ہ کفر نہیں کمانا چاہتا تھا۔ وہ نیکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی بے تابی بڑھتی ۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اکبر مچھلیاں لے کر واپس آیا تو اس وقت تک ری نیکی کے بڑھتے ہوئے رس کی وجہ سے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ہو چکا تھا' اخ سے ٹوٹ کر گرنے کیلئے بے چین ہے۔

"سیٹھ۔ اب میں پہلے مچھلیاں ابالتا ہوں۔ پھر تلنے والی مچھلیوں کو مسالہ لگا کر لوں گا۔" اکبر نے کہا اور کام میں لگ گیا۔

چوہدری کو خیال آیا کہ نیکی گھر سے شروع کرنی چاہئے اور ایک اعتبار سے اکبر کے لئے گھر کے فرد کی طرح تھا۔ وہ اکبر کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

اکبر کو یکھتے دیکھتے چوہدری کا دل پگھلنے لگا۔ یہ کس طرح کا آدمی ہے ڈیڑھ سو ے روز لیتا ہے اور دن بھر گدھے کی طرح کام کرتا ہے۔ باہر کا کام بھی کرتا ہے۔ بھی تلتا ہے اور رش کے وقت مچھلی گاہکوں تک پہنچاتا اور ان سے پیسے وصول رتا ہے۔ ابھی اتنی دور گیا' مچھلی لاد کر لایا اور آتے ہی مچھلی ابالنے' مچھلی پر مسالہ ے میں مصروف ہو گیا۔ ستانے کیلئے بھی نہیں بیٹھا۔ کتنا مخلص' محنتی اور ایمان ہے۔ کبھی گلے سے ایک روپیہ بھی پار نہیں کیا۔ کیسا نیک آدمی ہے یہ۔"

اکبر کو دیکھتے دیکھتے چوہدری کو کچھ ہونے لگا۔ کتنے خلوص سے مچھلی ابال رہا جانتا ہے کہ صرف تین کلو مچھلی کے ایک ہزار ملیں گے۔ پھر بھی اس نے اپنی ی میں اضافے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بغیر کہے خود مچھلی ابالنے لگا۔ یہ تو نیکی وہدری نے سوچا اور یہ اکبر ہر روز اور ہر روز کے ہر لمحے ایک نیکی کرتا رہتا ہے

اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے ہاں یہ کتنا امیر آدمی ہو گا۔ اس کی کمائی تو بہت زیادہ ہو گی اور میں کیا کرتا ہوں۔ میں اس کا استحصال کرتا ہوں۔ کبھی میں نے اس کے پیسے بڑھانے کے بارے میں نہیں سوچا۔

چوہدری کے دل میں یکایک ایسی محبت امنڈی کہ اس کا جی چاہا' اکبر کو لپٹا لے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ "اکبر۔۔ تم کبھی مستقبل کے بارے میں سوچتے ہو؟" اس نے اچانک پوچھا۔

اکبر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "اتنی فرصت ہی نہیں ملتی سیٹھ!" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ "رات کو گھر جاتا ہوں تو یقین کرو' ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ بس نیند سے برا حال ہوتا ہے۔ بستر پر گرتے ہی سو جاتا ہوں۔"

چوہدری کا دل بھر آیا۔ کتنا سادہ دل ہے یہ اکبر لہجے میں شکایت بھی نہیں ہے۔

"پھر سوچنا تو چاہئے اکبر!" اس نے بات آگے بڑھائی۔

"سوچنے سے کیا ہوتا ہے سیٹھ جی۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ مجھے عزت کی روٹی دے رہا ہے۔"

چوہدری دل میں اش اش کرنے لگا۔ ایسے ہوتے ہیں خدا کے فرماں بردار بندے۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں اکبر۔" چوہدری نے بے حد محبت سے کہا۔

"کاروبار بند کرنے کا تو نہیں سوچ رہے سیٹھ!" اکبر نے بے حد تشویش سے اسے دیکھا۔

"میں اپنے نہیں' تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا! کیا میرے کام سے خوش نہیں ہو؟"

"تم جیسا آدمی تو قسمت سے ملتا ہے اکبر!" چوہدری نے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

اکبر اس دوران میں بھی کام کرتا رہا تھا۔ اس نے مچھلی ابالنے کیلئے چڑھائی اور فوراً ہی اتار لی۔ "یہ ایک بھاپ کا کام ہے سیٹھ۔ مچھلی' ثابت بھی رہے گی اور مسالہ گوشت میں اتر جائے گا۔ اب میں کڑاہی چڑھا رہا ہوں سیٹھ۔" اچانک اسے خیال آیا

کہ چوہدری کچھ کہہ رہا تھا۔ "ہاں سیٹھ تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

"میں بتا رہا تھا کہ میں نے ایک بہت بڑا اور اہم فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے سیٹھ!" اکبر نے یوں بے پروائی سے کہا جیسے اسے فیصلے سے کوئی غرض ہی نہیں۔

"اکبر۔۔ میں نے تمہیں پارٹنر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" چوہدری نے اسے مطلع کیا۔

اکبر کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "پارٹنر!" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"ہاں اکبر' آدھے آدھے کا پارٹنر۔"

"وہ کیوں سیٹھ؟" اکبر نے یوں فریاد کرنے والے انداز میں پوچھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ آخر میں نے ایسا کون سا قصور کر دیا۔

"تم اتنی محنت کرتے ہو۔ اتنے ایمان دار ہو کہ یہ پارٹنر شپ تمہارا حق ہے۔ مجھے تو بغیر کچھ کیے ہی سب کچھ مل جاتا ہے۔ اصل میں تو یہ کاروبار ہی تمہارا ہے۔"

اکبر کے ہاتھ رک گئے۔ وہ کام کرنا بھول گیا اور ہراساں ہو کر چوہدری کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔

چوہدری نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر؟"

"ایک بات پوچھوں سیٹھ۔" اکبر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ یہ ہچکچاہٹ اس کے چہرے پر بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

"ضرور پوچھو۔"

ایک پل میں اکبر کی ہچکچاہٹ ہوا ہوئی اور اس کے چہرے پر عزم نظر آنے لگا۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں مضبوطی اور انداز میں اعتماد تھا۔ "ظاہر میں تو اپنا دھندا بہت اچھا جا رہا ہے سیٹھ!" اس نے کہا۔ "پر یہ بھی ہے کہ تم سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔"

چوہدری کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ "دھندا تو اچھا جا رہا ہے۔ کل

ساڑھے چار ہزار کا گلا اٹھایا ہے میں نے۔"

"تو پھر کیا بات ہے سیٹھ۔ کیا آج کل میں دھندا ڈاؤن ہونے والا ہے؟" اکبر نے کہا۔ لیکن کہتے کہتے گڑبڑا گیا۔ جلدی سے بولا۔ "میرا مطلب ہے سیٹھ' تم مجھے ڈیڑھ سو روپے روز دیتے ہو نا' یہ میرے لئے بہت ہے۔ لگا بندھا ہے نا' دھندا ڈاؤن ہو گیا تو میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

اکبر نے لاکھ بات کا رخ بدلا لیکن چوہدری اس کا اصل مفہوم پا گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا افسوس ہوا کہ اکبر نے اس کے خلوص پر شک کیا۔ لیکن اس وقت اس کا دل ایسا گداز ہو رہا تھا اور وہ نیکی اور درگزر سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا کہ اسے برا نہیں لگا۔ "میں تو تمہارے بھلے کیلئے کہہ رہا تھا اکبر۔"

"نہیں سیٹھ۔ مجھے پارٹنری نہیں چاہئے۔ میں اس ڈیڑھ سو میں بہت خوش ہوں۔"

چوہدری محکوم اللہ مایوس نہیں ہوا۔ وہ نیکی کا خواہش مند تھا۔ کفر کیوں کرتا۔

اکبر نے تازہ لائی ہوئی مچھلیوں کو برف میں رکھ دیا۔ پھر وہ گزشتہ روز کی بچی ہوئی مچھلیوں پر مسالہ لگانے لگا۔ اچانک چوہدری کو ہلکی سی بدبو کا احساس ہوا۔ اس نے غور کیا تو پتہ چلا کہ بدبو ایک مچھلی میں آ رہی ہے۔" اکبر--- یہ مچھلی پھینک دو۔" اس نے کہا۔

"پھینک دوں؟" اکبر کے ہاتھ رک گئے۔ وہ خالی خالی نظروں سے چوہدری کو دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ یہ آج سیٹھ کو کیا ہو گیا ہے۔

"ہاں' اس میں سے بدبو آ رہی ہے۔"

"بدبو! سیٹھ ابھی اس میں سے خوشبو آئے گی۔ میں مچھلی تلتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا۔" اکبر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

چوہدری کا جی چاہا کہ اٹھا کر مچھلی کو پھینک دے لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح اکبر کی فنکارانہ انا مجروح ہو گی۔ اس روز مولانا نے فارسی کا ایک شعر بھی پڑھا تھا۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔ اس نے سیدھا صاحب سے بدست آور کا مطلب

پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دل کو ہاتھوں میں لو۔ ویسے کچھ فارسی تو وہ خود بھی سمجھتا تھا۔ تو بات یہ تھی کہ دل کو ہاتھوں میں لینا۔۔ یعنی کسی کی دل آزاری سے بچنا اکبر کے حج کے برابر ہے۔

اب اس وقت وہ بدبودار مچھلی اور اکبر کے حج کے بارے میں ملا کر سوچنے لگا۔ اب اس وقت وہ اکبر کی دل آزاری سے بچے تو یہ اس کیلئے حج اکبر کے برابر ہے لیکن بدبودار مچھلی فروخت کرنا ویسے بھی برا ہے اور اسے کھا کر کسی کی طبیعت خراب ہو گئی تو یہ اور بڑا گناہ ہو گا۔ تو کیا یہ بہترین ہو گا کہ وہ اکبر کی دل آزاری ہونے دے لیکن اسے حج کرا دے۔ اکبر نام کے لوگوں کے حج کو یقیناً کوئی خاص اہمیت حاصل ہو گی۔ بھی تو اس شعر میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"اکبر۔۔ تم ایسا کرو کہ اس بار حج پر چلے جاؤ۔" چوہدری نے اکبر سے کہا۔

"اس بار اکبر نے اسے یوں دیکھا' جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ "میں حج کیسے کر سکتا ہوں سیٹھ۔ اس میں تو بہت پیسہ لگتا ہے۔"

"پیسے کی تم فکر نہ کرو' میں تمہیں حج کراؤں گا۔"

اکبر نے وہ مچھلی تیل سے بھری کڑاہی میں ڈالی' جو اس تمام معاملے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس دوران میں وہ جیسے جان بچانے کی کوئی ترکیب سوچتا رہا تھا۔ "مگر سیٹھ' مجھ پر قرضہ بہت ہے اور سنا ہے' قرض ادا کرنے سے پہلے بندہ حج نہیں کر سکتا۔" بالاخر اس نے جواز تلاش کیا۔

"کتنا قرضہ ہو گا؟"

"سات آٹھ ہزار روپے سے کم تو نہیں ہو گا سیٹھ!"

"کوئی بات نہیں۔ میں وہ بھی ادا کر دوں گا۔"

اب اکبر ڈرا اور سہما ہوا نظر آنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ سیٹھ کے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے۔ صبح ہی سے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اب اس نے مدافعانہ انداز کے بجائے جارحیت اپنائی۔ "تم نے خود بھی حج کیا ہے سیٹھ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"تو پہلے تم خود حج کرو۔ اس کے بعد مجھے کرانا۔"

چوہدری نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ "میرے حج میں وہ بات کہاں، تمہارا حج اکبر ہو گا۔ خیر میں کسی اور اکبر سے بات کروں گا۔"

پانچ منٹ بعد سیٹھ جسیم کا آدمی آگیا۔ چوہدری نے اسے تین کلو مچھلی دی۔ وہ اسے ہزار روپے دے کر اور مچھلی لے کر چلا گیا۔ یہ عجیب نیکی ہے، جس کا روز کا اجر الگ بندھ گیا ہے اور اس کی وجہ سے بہت بڑا تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ چوہدری نے سوچا۔ جبکہ میں تو اسے نیکی بھی نہیں سمجھتا۔

اتنی دیر میں وہ مچھلی اکبر تل چکا تھا۔ اس نے مچھلی نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ مچھلی ہے سیٹھ، جس پر تم اعتراض کر رہے تھے۔"

چوہدری نے نتھنے پھڑکائے۔ مچھلی میں سے بے حد اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ چوہدری کو اب بھی ڈر تھا کہ وہ مچھلی کھا کر کسی کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ وہ دل آزاری سے بچ رہا تھا اور اکبر حج سے۔ تو اب اس لازمی گناہ سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ وہ مچھلی خود کھا لی جائے۔

"اکبر۔۔۔ تم یہ مچھلی میرے لئے تل دو۔" اس نے اکبر سے کہا۔

"پوری مچھلی سیٹھ؟" اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو پوچھنے لگا۔ "بہت بھوک لگ رہی ہے؟"

چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بھوک ثابت کرنے کے لئے ابلی ہوئی مچھلی میں سے بڑی بے تابی سے کھانے لگا۔ اسے حیرت ہوئی کل اس نے خود مچھلی ابالی تو وہ بہت بدذائقہ تھی لیکن اکبر کی ابالی ہوئی مچھلی تو جی چاہ رہا تھا کہ کھائے جاؤ۔

"اکبر۔۔۔ ابلی ہوئی مچھلی اتنی لذیذ ہوتی ہے۔ تم نے تو کمال کر دیا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

اکبر خوش ہو گیا۔۔۔ اتنا کہ چوہدری کے ممکنہ پاگل پن کو بھی بھول گیا۔ "میں فنکار ہوں سیٹھ۔ مچھلی کے ذائقے میں بھی کوئی فرق نہیں تھا لیکن چوہدری نے اس مچھلی کو بہت بڑی نیکی سمجھ کر کھایا۔ اس کے نزدیک وہ مچھلی کھانا۔۔۔ یعنی گاہکوں کو اس

مچھلی سے بچانا حج اکبر کے برابر تھا۔ اپنی دانست میں وہ بہت بڑا کام کر رہا تھا۔ اس نے اکبر کی دل آزاری بھی نہیں کی تھی اور مچھلی کو ٹھکانے بھی لگا دیا تھا۔

مچھلی سے نمٹنے کے بعد چوہدری نے ایک ڈکار لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اکبر۔۔۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔" اس نے اکبر سے کہا۔ "آج میں واپس نہیں آؤں گا، تم دکان بند کر دینا۔"

اکبر نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے سیٹھ!" پھر وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں عجیب سی تھیں۔ "پتہ نہیں، آج سیٹھ کو کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے رات کو ٹھیک طرح سویا نہیں ہے۔" وہ بڑبڑایا اور پھر کڑاہی میں پڑے مچھلی کے ٹکڑوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔



صدر جانے والی بس میں بیٹھ کر چوہدری سرشاری کی سی کیفیت میں گم ہو گیا۔ وہ نیکی کے سفر پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا عزم تھا کہ آج وہ ایک خاموش' بے غرض اور اللہ کی بارگاہ میں مقبول نیکی کر کے رہے گا۔

صدر اتر کر وہ ایمپریس مارکیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ اس کے سینے میں دوسروں کے دکھ کا سمندر موجزن تھا۔ دل اس حد تک گداز ہو گیا تھا کہ بلا سبب بھی اس کی پلکیں بھیگی جا رہی تھیں۔ آنسو جیسے آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے چلتا رہا۔

اچانک اسے ایک بھکارن نظر آئی وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی دس بارہ قدم دور کھڑا وہ بھکارن کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

بھکارن جوان بھی تھی اور خوش شکل بھی۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال ہو گی۔ رنگت گوری تھی اور جسم شاداب تھا۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر چوہدری کو بہت دکھ ہوا۔ یہاں سے گزرنے والے اسے کیسی نظروں سے دیکھتے ہوں گے۔ اسے ترغیب بھی دیتے ہوں گے۔

چوہدری کو اپنے پڑوسی دشمن لال دین کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ لال دین نے کہا تھا۔۔۔ بھکارن جوان اور خوبصورت ہو تو اسے بھیک میں کوئی آٹھ آنے بھی نہیں دیتا۔ ہاں قیمت کے طور پر لوگ سو دو سو روپے بھی دے دیتے ہیں۔ یعنی عزت کے ساتھ ایسی بھکارن کو پیٹ بھر کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔

بھکارن کو نظروں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور چوہدری کو دیکھ کر مسکرائی۔ "سیٹھ۔۔۔ کچھ دیتا جا اللہ کے نام پر۔"

چوہدری آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ فٹ پاتھ پر اس وقت راہ گیروں کا ہجوم تھا لیکن بھکارن کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ "تو یہاں کیوں بیٹھتی ہے؟" چوہدری نے ہمدردی سے کہا۔ "یہاں تو سب تجھ پر بری نظر ڈالتے ہوں گے۔"

"کیا کروں سیٹھ۔ مجبوری ہے۔" بھکارن نے کہا۔

چوہدری کو اچانک اس کے پھٹے ہوئے کپڑے نظر آئے۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ بے چاری بہت غریب معلوم ہو رہی تھی۔ "کیا مجبوری ہے تمہیں؟"

"میرے پانچ بچے ہیں سیٹھ!"

چوہدری کو یقین نہیں آیا۔ وہ پانچ بچوں کی ماں تو نہیں لگتی تھی۔ "تو تمہارا شوہر بھی تو ہو گا؟"

"وہ بہت بیمار ہے سیٹھ۔ کچھ کرنے کے قابل نہیں۔"

چوہدری نے اس کے گھر کا اور اس کے دن بھر بھیک مانگنے کا تصور کیا اور لرز کر رہ گیا۔ اس کے پاس خاصی رقم تھی اور وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکالا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ یہ کم تو نہیں۔

بھکارن ہزار کا نوٹ دیکھ کر بے تاب ہو گئی۔ "اس کے لئے مجھے کہاں چلنا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے گھریوں میں تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گا۔ تم یہاں نہ آیا کرو۔ میں ہر مہینے تمہیں ایک ہزار روپے پہنچا دیا کروں گا۔"

ایک لمحے میں بھکارن کے تیور بگڑ گئے۔ "اے سیٹھ۔ سیانا سمجھتا ہے خود کو۔ مجھے اپنے لئے گھر بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ بھی صرف ہزار روپے میں۔ مہنگائی کا پتہ بھی ہے۔"

چوہدری کا دل بھر آیا۔ "جانتا ہوں۔" اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ "میں تمہیں سلائی مشین خرید کر دے دوں گا۔ تم کپڑے سی کر بھی اچھا خاصا کما لو گی۔"

"کسی کو رکھنے کا شوق ہے تو مال خرچ کرنا بھی سیکھ سیٹھ۔" بھکارن نے بہت

خراب لہجے میں کہا۔ "مجھے سلائی کرنی نہیں آتی۔ آتی بھی تو میں کرتی نہیں۔ تو کیا سمجھتا ہے سیٹھ! یہاں بیٹھ کر میں شام تک عزت آبرو کے ساتھ سات آٹھ سو روپے پیٹ لیتی ہوں۔"

"مگر یہ کوئی عزت کا کام نہیں۔۔"

"تو' تو اور بے عزتی کی بات کر رہا ہے۔۔ وہ بھی ہزار روپے میں؟ جا چلا جا' نہیں تو۔۔"

چوہدری بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس دھمکی پر اسے کل صبح کی بھکارن یاد آگئی۔ وہ ڈر گیا۔ اس وقت تو رش بھی بہت تھا لوگوں کا۔ ذرا سی دیر میں چٹنی بن جاتی۔

مایوس وہ اب بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ آگے ایک نابینا فقیر کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے قمیص کی باہر والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے پاس اس جیب میں پانچ سو کا ایک نوٹ تھا۔ اس کے علاوہ دو روپے والے دو سکے پڑے تھے۔

اندھے فقیر کی عمر کم از کم ستر برس ضرور ہو گی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اسے دیکھ کر چوہدری کو اپنے سینے میں چبھن کا شدید احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ بڈھے فقیر کا کوئی گھر بھی ہو گا۔ شاید وہاں بہت سے لوگ بھوکے بھی ہوں گے۔ ممکن ہے' چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہوں۔۔ اس بڈھے کے پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں جو یتیم ہو گئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کوئی گھر نہ ہو۔ اس صورت میں یہ کہاں سوتا ہو گا۔ زندگی کیسے گزارتا ہو گا؟ راستہ کیسے چلتا ہو گا؟ چوہدری کو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

چوہدری کا جی چاہا کہ وہ اس فقیر کو کم از کم پچاس روپے دے لیکن اس کے پاس کھلا نہیں تھا۔ اس نے سوچا' فی الحال وہ اس کے کٹورے میں دو روپے والے یہ دو سکے ڈال دے۔ پھر کھلا کرانے کے بعد اسے پچاس روپے دے دے گا۔

اس نے جیب سے دونوں سکے نکالے لیکن عین وقت پر وہ ٹھٹک گیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ سکے بھاری ہیں۔ وہ انہیں کٹورے میں ڈالے گا تو کھنکناہٹ کی آواز

ہو گی۔ شور ہو گا تو لوگ چونک کر دیکھیں گے۔ پھر ایک دوسرے سے کہیں گے۔۔ دیکھو کیسا ہمدرد' کیسا سخی آدمی ہے' یعنی پبلسٹی کا خطرہ۔

چوہدری تو ایک گمنام نیکی کرنے کی نیت سے نکلا تھا۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ پانچ سو کا نوٹ ہی کٹورے میں ڈال دے لیکن یہ اسے مناسب نہیں لگا۔ اس وقت اسے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ سگریٹ خریدے گا تو پانچ سو کا نوٹ کھلا ہو جائے گا اور وہ پچاس روپے فقیر کو دے دے گا۔

اب چوہدری کو یہ کرنا تھا کہ وہ فقیر کے کٹورے میں یہ سکے ایسے ڈالے کہ فقیر کو بھی پتہ نہ چلے۔ وہ جھکا۔ اس نے دیکھا کہ فقیر کے کٹورے میں صرف ایک اٹھنی پڑی تھی۔ اس کا دل لرز گیا۔ ایک بجا تھا اور صبح سے اس غریب کو صرف ایک اٹھنی ملی تھی۔ اٹھنی۔۔ پھر وہ اکڑوں بیٹھ گیا۔

اندھے فقیر نے آہٹ سن لی تھی۔ "کون ہے بابا؟"

چوہدری خاموش رہا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس نیکی کے فریق ثانی کو بھی خبر نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کاسے میں ہاتھ ڈالا۔ دو دو روپے کے دونوں سکے بڑی خاموشی سے وہاں رکھ دینا چاہتا تھا۔۔ ایسے کہ سکوں کی آواز بھی نہ ہو۔

ابھی اس کا ہاتھ کٹورے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اچانک قریب ہی سے کوئی شخص چلایا۔ "چور۔۔چور۔۔۔ اندھے فقیر کے پیسے چراتا ہے۔"

چوہدری بوکھلا گیا۔ اس نے سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ اسی لمحے فقیر نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چوہدری نے پوری قوت سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ چوہدری کو یہ فکر تھی کہ اس کی گمنام نیکی کا راز نہ کھل جائے۔ نیکی کرنے سے پہلے ہی اس کی شہرت نہ ہو جائے۔ اس نے بہت تیزی سے دونوں سکے اپنی جیب میں ڈال لئے۔

اچانک پیچھے سے کسی نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر جھٹکا۔ "چور کے بچے۔۔۔"

خبیث۔۔ تجھے یہ اندھا فقیر ہی ملا تھا لوٹنے کیلئے؟" کسی نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھیڑ لگ گئی۔ کسی نے اندھے فقیر سے پوچھا۔ "تمہارے کتنے پیسے غائب ہیں؟"

فقیر نے اپنا کاسہ ٹٹولا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اٹھنی تو موجود تھی لیکن یہ شخص اس کاسے میں کیوں گھس رہا تھا۔ کیا کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا مگر اس نے یہ سمجھ لیا کہ اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس شخص کو اس کے کاسے کی طرف ہاتھ بڑھانے پر سزا بھی ملنی چاہئے۔ "میں ابھی ابھی آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "مجھے جو اٹھنی ملی تھی' وہ تو موجود ہے مگر دو سخی مجھے دس دس روپے دے کر گئے تھے۔ وہ غائب ہیں۔" فقیر نے سوچا کہ زیادہ لالچ ٹھیک نہیں۔ بیس روپے مناسب رہیں گے۔

چوہدری کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ تو جانتا تھا کہ فقیر صریحاً جھوٹ بول رہا ہے لیکن وہ لوگوں کو کیسے یقین دلائے گا۔ ابھی وہ غصے میں آنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کی گدی پر ہاتھ رسید کر دیا۔

وہ تھپڑ گویا مصرع طرح تھا' جس پر سب نے شعر کہنے شروع کر دیئے۔ لمحوں میں وہاں مشاعرہ برپا ہو گیا۔ سنبھلنے اور کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ کم وقت میں چوہدری کی خاصی تگڑی مرمت ہو گئی۔ بونس میں ملنے والی مختلف' متنوع اور رنگا رنگ گالیاں اس کے علاوہ تھیں۔

اچانک کسی نے چیخ کر کہا۔ "اسے مارتے رہنا پہلے بے چارے فقیر کے بیس روپے تو دلوا دو۔"

"ہاں۔۔ پہلے چوری کا مال برآمد کرو۔"

"تلاشی لو اس کی۔"

کسی نے چوہدری کی تلاشی لی۔۔۔ تفصیلی تلاشی۔ اس دوران میں بھی اس کی ہلکی پھلکی مرمت ہوتی رہی پھر تلاشی لینے والے نے کہا۔ "ارے۔۔ یہ تو کوئی سیٹھ ہے۔ یہ چور کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس اندر کی جیب میں ہزاروں روپے ہیں اور

باہر کی جیب میں پانچ سو کا ایک نوٹ اور دو روپے والے دو سکے۔"

"دس کے نوٹ نہیں ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں۔" تلاشی لینے والے نے کہا۔

"بے چارے شریف آدمی کو خوامخواہ مارا۔"

ایک بار پھر سیٹھ جسیم کے نوٹوں نے چوہدری کی عزت بحال کر دی تھی۔۔ لیکن اچھی خاصی مرمت کے بعد۔ اب کچھ لوگ اسے چمکار رہے تھے۔ کچھ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے معذرت کر رہے تھے۔ بے گناہی ثابت ہونے کے بعد چوہدری شیر ہو گیا۔ اس نے چمکارنے والوں کو جھڑکا اور پیٹھ تھپکنے والوں کے ہاتھ جھٹکے۔

ادھر فقیر نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ چھوٹی بات کر بیٹھا۔ پانچ سو کہہ دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے بلبلاتے ہوئے کہا۔ "ہائے مجھ غریب کے نوٹ۔ ہائے میرے دس کے نوٹ۔"

"بابا۔۔ تمہارے نوٹ اس شریف آدمی کے پاس نہیں ہیں۔" کسی نے فقیر کو مطلع کیا' جیسے وہ اندھا ہونے کے ساتھ ساتھ بہرا بھی ہو۔

"اچھا۔۔ پھر کوئی اور لے گیا ہو گا۔" اندھے فقیر نے بجھے بجھے لہجے میں کہا اور پھر واویلا شروع کر دیا۔ "ہائے میرے نوٹ۔۔ ارے میرے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے بھوکے مر رہے ہوں گے۔"

"ارے ارے۔۔ کتنی زیادتی ہوئی ہے اس بے چارے کے ساتھ۔" کوئی بولا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا' اس کے کاسے میں اٹھنی کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔" چوہدری نے تپ کر کہا۔

"ہائے میرے نوٹ۔۔ ارے میرے یتیم بچے۔۔" فقیر بدستور واویلا کیے جا رہا تھا۔

"آپ اس کے کاسے میں کیا دیکھ رہے تھے جناب؟" ایک تماشائی نے چوہدری سے بڑے احترام سے دریافت کیا۔

"اس کے کٹورے میں خاموشی سے چار روپے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

چوہدری نے کہا۔ "مگر شاید اصل بات یہ ہے کہ میری کھال کھجلا رہی تھی۔"

فقیر کا واویلا اب بھی جاری تھا۔ ایک شخص نے چوہدری کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تو جناب' آپ اب اسے وہ چار روپے دے دیں۔"

"میں اس جھوٹے' بہتان طراز بڈھے کو ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔" چوہدری نے سختی سے کہا۔

"اپنی عزت کا صدقہ سمجھ کر دے دیں۔" اس شخص نے التجا کی۔

"تو یہ تم لوگ میری عزت کر رہے تھے۔۔۔ ہیں؟" چوہدری آپے سے باہر ہو گیا۔ "مارپیٹ کر' گالیاں دے کر میری عزت افزائی کر رہے تھے؟"

وہ شخص چپکے سے کھسک لیا۔ مجمع بھی تتر بتر ہونے لگا۔ چوہدری اپنی چوٹیں سہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اندھے فقیر کا واویلا اب بھی جاری تھا۔



خلاف معمول چوہدری محکوم اللہ کا غصہ جلد ہی سرد ہو گیا۔ اس کیلئے اسے خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ نیکی کی جستجو میں نکلا ہے۔۔۔ نیکی اور وہ بھی بے غرض اور گمنام نیکی' جو صلے سے بے پروا ہو اور یہ بات اب طے ہو گئی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں تو نیکی الٹا بدی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

چوہدری نے ایک دکان سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس خریدی۔ یوں پانچ سو کے نوٹ کا کھلا بھی مل گیا۔ اس دوران میں اس نے اپنی اندرونی جیب پر یونہی ہاتھ مارا تو اسے زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے گھبرا کر اپنی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت دیر تک جیب ٹٹولتا رہا۔ جیسے کسی بھی لمحے جادو کے زور سے اس کی غائب رقم اچانک جیب میں نمودار ہو جائے گی' لیکن ایسا ہوا نہیں۔

وہ اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا۔ نہ صرف سیٹھ جسیم کے دیئے ہوئے دس ہزار اس کی جیب سے غائب تھے بلکہ وہ پانچ ہزار بھی جو وہ نیکی کی نیت سے اپنی بیوی سے لے کر گھر سے نکلا تھا۔

اسے سنبھلنے میں چند منٹ لگے۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس نے ٹ کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگائی۔ پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے جہانگیر پارک ی طرف چل دیا۔ پارک میں اس نے ایک سنسان گوشے کا رخ کیا اور ایک بنچ پر جا ٹھا۔ وہ سکون سے سوچنا چاہتا تھا۔

اس نے سوچا اندھے فقیر کے ساتھ ایک چھوٹی سی' معمولی سی نیکی کرنے کی جو ں نے کوشش کی تھی' وہ نہ صرف ناکام ثابت ہوئی بلکہ اسے بہت مہنگی پڑی۔ سیٹھ یم کے دیئے ہوئے دس ہزار کو تو خیر چھوڑو' اس کے وہ پانچ ہزار بھی صاف ہو گئے ہ نیکی کی سرمایہ کاری کی غرض سے لے کر نکلا تھا۔ اب وہ کیا کرے گا۔ اسے کوئی ا ضرورت مند نظر آ گیا تو وہ اس کی کیسے مدد کرے گا۔ اور یہ ہاتھ صاف اس کی جامہ شی لینے والوں میں سے کسی نے اس کی مرمت کے دوران کیا ہو گا۔ اس وقت تو ے اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔

یہ سوچتے ہوئے اچانک اس پر دو باتیں منکشف ہوئیں۔ ایک یہ کہ اس کے ہزار کی کوئی اہمیت نہیں۔ اتنے بڑے شہر میں وہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور اسے کوئی ک ضرورت مند بھی نہیں مل رہا ہے۔ دوسرے اسے احساس ہوا کہ اس نے بے جا ر پر سیٹھ جسیم کے دیئے ہوئے دس ہزار کی تحقیر کی ہے۔ اسے اس کا کوئی حق نہیں کیونکہ اس رقم ہی کی وجہ سے دو بار وہ بڑی مصیبتوں سے نکلا تھا۔ وہ رقم اس کیلئے ش رساں ہی ثابت ہوئی تھی اور اس کی تحقیر کر کے وہ ناشکرے پن کا ارتکاب رہا ہے۔

اب کے اسے وہ رقم نکل جانے پر کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ وہ توہم پرست نہیں تھا۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں آ رہی تھی کہ اس کی جیب میں اس ی موجودگی اس کیلئے مبارک تھی۔ اور اب وہ نکل گئی ہے تو یہ اس کیلئے کوئی اچھا ن نہیں۔ اب وہ کسی مشکل میں پھنسا تو سچ مچ بڑی پریشانی ہو گی۔

"وہ بہت دیر اس بنچ پر بیٹھا رہا۔ اس کی طاقت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اس کو ی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی اور نیکی کے تصور سے ہی اسے خوف آ رہا تھا۔

اس نے حساب لگایا۔ اس کی جیب میں دو سکوں کے علاوہ اب صرف 480 روپے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اس میں لوگوں کی ضرورتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ 480 روپے میں کسی کا کیا بھلا ہو سکتا ہے۔

چار بجے کے قریب اسے بھوک لگنے لگی۔ وہ اٹھا اور ایمپریس مارکیٹ کی طرف چل دیا۔ کٹرک روڈ پر ایک ہوٹل تھا' جہاں بہت اچھی بریانی ملتی تھی۔

کٹرک روڈ پر وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک مجہول سے نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کی عمر بیس سال رہی ہو گی۔ لیکن صحت اس کی بہت خراب تھی۔ اس کا چہرہ مدقوق تھا' آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ وہ قمیص پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر اس موسم میں اسے کوٹ پہنے دیکھ کر چوہدری کو بہت حیرت ہوئی۔ دوسری طرف لڑکے کی آنکھوں میں ویرانی اور خالی پن دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا۔

"السلام علیکم جناب!" لڑکے نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹے!" چوہدری نے شفقت سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے کوئی پریشانی ہے تمہیں؟"

"ج--- جی ہاں جناب!" لڑکے سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ' شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں؟" چوہدری نے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی اور ان کی طرف کوئی متوجہ بھی نہیں تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔ نیکی خود چل کر اس کے پاس آئی تھی اور پبلسٹی کا خدشہ بھی نہیں تھا۔

"مم-- میں بیمار ہوں سر"

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" چوہدری نے پوچھا۔

"مجھے--- مجھے شوگر ہے جناب!"

چوہدری کو شاک لگا۔ اس عمر میں شوگر! اس عمر میں تو شوگر کی ضرورت ہو ہے۔ شوگر توانائی میں تبدیل ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کام کراتی ہے۔

لڑکے نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھی تو گڑگڑانے لگا۔ "شاید آپ یقین نہیں آیا سر! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری بیماری بہت بڑھی ہوئی ہے۔"

چوہدری کو شرمندگی ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے توبہ کی۔ وہ تو اپنی خراب کر رہا تھا۔ ضرورت مند کی ضرورت پر' پریشان حال کی پریشانی پر شک کر اس کے اس رویے سے اس لڑکے کی کتنی دل آزاری ہوئی ہو گی اور اب اسے آیا تو اس کا دل لرز کر رہ گیا۔ اس عمر میں شوگر۔

شاید لڑکے کو گمان ہوا کہ اسے اب بھی یقین نہیں آیا ہے۔ اس نے گڑگڑاتے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔ مجھے انسولین کے ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں۔ خود دیکھ لیں سر!" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اور قمیص کی آستینیں اوپر سرکائیں ہاتھ اسے دکھایا۔

اس بار چوہدری پر لرزہ چڑھ گیا۔ لڑکے کے ہاتھ پر سوائے ہڈیوں اور نسوں کچھ بھی نہیں تھا اور اس پر ستم یہ کہ وہ ہاتھ کلائی سے کہنی تک سوئیوں سے ہوا تھا۔ بے شمار سوئیوں کے نشان تھے۔ ان میں سے پرانے سخت اور سیاہ ہو تھے۔ چوہدری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مجھے انجکشن لگوانا ہے سر اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور مجھے بھوک بھی ہے سر!"

"کتنے پیسوں کی ضرورت ہے تمہیں؟"

"دس بیس میں کام چل جائے گا جناب۔"

"دس بیس روپے میں؟" چوہدری نے حیرت سے دہرایا۔ یہ بات اس کیلئے فہم تھی کہ اتنے پیسوں میں انسولین کا انجکشن بھی لگوایا جا سکتا ہے اور پیٹ کھانا بھی کھایا جا سکتا ہے۔

لڑکے کو لگا کہ شاید چوہدری کو دس بیس روپے کا سوال برا لگا ہے۔ اس نے سے کہا۔ "چلئے سر-- آپ مجھے پانچ روپے ہی دے دیں۔"

"تم غلط سمجھے ہو۔" چوہدری نے معذرت کی۔ "میرا مطلب تھا کہ دس یا بیس میں تم یہ دونوں ضرورتیں پوری کیسے کر سکتے ہو۔ انسولین کا انجکشن بھی خاصا ہو گا۔ پھر ڈاکٹر بھی انجکشن لگانے کی فیس لے گا اور اس کے بعد کھانا---"

"یہاں کچھ دور ایک خیراتی شفا خانہ ہے سر۔ وہاں صرف پانچ روپے دینے ہوتے ہیں پرچی بنانے کے۔ کبھی شفا خانہ بند ہو تو انجکشن میں خود بھی لگا لیتا ہوں اپنے۔"

خود انجکشن لگانے کا تصور کر کے چوہدری کا دل کانپ گیا۔ "بیٹے—— میرے پاس بہت زیادہ پیسے تو نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ اور جیب سے سو کا نوٹ نکال کر لڑکے کی طرف بڑھایا۔ "فی الحال تم یہ رکھ لو اور ہاں' انجکشن کبھی خود نہ لگانا۔"

"مم—— مہرب—— بانی جناب——! آ—— آپ کک—— کا نام کک—— کیا ہے؟" لڑکے کے ٹوٹتے لہجے میں شکر گزاری چھلک رہی تھی۔

چوہدری کا دل سچی خوشی سے معمور ہو گیا۔ "نام سے کچھ نہیں ہوتا بیٹے!" اس نے بے حد شفقت سے کہا۔ "میرے پاس اللہ کی دی ہوئی وہ چیز تھی' جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ وہ میں نے تمہیں دے دی' تمہاری امانت۔ بس اتنا کافی ہے' نہ یہ مہربانی ہے نہ احسان۔"

لڑکا آگے بڑھ گیا۔ چوہدری نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکے کے پیروں میں جان پڑ گئی ہے۔ اپنی حالت کے اعتبار سے وہ حیرت انگیز تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لڑکا مین روڈ پر مڑا تو چوہدری بھی اپنے راستے پر چل دیا۔

چوہدری کی اس وقت کی طمانیت ناقابل بیان تھی۔ ایسی خوشی اسے زندگی میں کبھی نہیں ملی تھی۔ ارے—— نیکی اتنی آسان ہے۔ یہی تو میں سوچتا اور کہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے لئے اتنی دشوار ہو گئی تھی۔ کاش میری جیب نہ کٹی ہوتی۔ میں اس لڑکے کو وہ پانچ ہزار دے دیتا۔ یہ کافی دنوں کیلئے علاج سے بے نیاز ہو جاتا۔

چوہدری نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کے پھیپھڑے ہوا سے اور دل جیسے روشنی سے بھر گیا۔ اب وہ سکون سے کھانا کھا سکے گا۔ وہ کامیاب جو ہو گیا ہے' جس کام کی نیت سے وہ نکلا تھا' وہ اس نے کر لیا۔ اور آج اسے نیند بھی بہت اچھی آئے گی۔

وہ ہوٹل کی طرف بڑھا۔ اچانک اسے بوڑھی عورت نظر آئی جو مخالف سمت

سے تیز قدموں سے چلتی اس طرف آ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر بھی دیکھ رہی تھی۔ چوہدری اسے بھی ممکنہ اور متوقع نیکی سمجھ کر غور سے دیکھنے لگا۔ شاید قسمت اس پر مہربان ہو گئی ہے۔ کون جانے' ابھی پے در پے اسے متعدد نیکیاں نصیب ہو جائیں۔

بوڑھی عورت نے اسے متوجہ پایا تو اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس کی نگاہوں میں اب بھی بے چینی تھی۔

"اماں—— کسی کو ڈھونڈ رہی ہو؟" چوہدری نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ اپنے بیٹے کو تلاش کر رہی ہوں۔"

"کتنا بڑا ہے تمہارا بیٹا؟"

"سولہ سال کا ہے۔" بڑھیا نے کہا۔ "ابھی چند منٹ پہلے گھر سے نکلا تھا۔"

"نہیں اماں—— وہ کسی اور طرف گیا ہو گا۔ ادھر سے تو میں نے اس عمر کے کسی لڑکے کو گزرتے نہیں دیکھا۔"

"بیٹا' وہ بدنصیب دیکھنے میں بڑا لگتا ہے اور ہاں' پہچان یہ ہے کہ وہ کوٹ پہنے ہوئے ہے۔"

چوہدری سمجھ گیا کہ یہ اسی لڑکے کی ماں ہے اور شاید یہ بھی اس کی دوا کیلئے پریشان پھر رہی ہے۔ "وہی تو نہیں' جو بیمار ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" بڑھیا نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

چوہدری اپنی خاموش اور گمنام نیکی کو کیسے بے نقاب کرتا۔ اس نے کہا۔ "کوٹ پہنے ہوئے تھا وہ—— اور بہت کمزور تھا۔ صورت سے بیمار لگتا تھا۔"

"ہاں' وہی نامراد میرا بیٹا ہے۔" بڑھیا نے افسردگی سے کہا۔ "تم نے دیکھا تھا اسے؟ کس طرف گیا ہے وہ؟"

"اماں—— وہ ایمپریس مارکیٹ کی طرف گیا ہے۔"

"بھیا—— تم نے پیسے تو نہیں دیئے اسے؟"

چوہدری کو اس پریشان حال بڑھیا پر ترس آنے لگا۔ بے چاری کتنی پریشان ہے

بیمار بیٹے کیلئے۔ وہ اسے اس پریشانی سے نجات دلا سکتا تھا۔ اسے بتا سکتا تھا کہ وہ فکر نہ کرے، اس نے اسے انجکشن کیلئے پیسے دے دیئے ہیں۔ یہ بھی نیکی ہوتی لیکن اس کے نتیجے میں پچھلی نیکی ضائع ہو جاتی۔ بڑھیا کی شکر گزاری اور اس کی اس خاموش نیکی کو مجروح کر دیتی۔ پھر بھی اسے افسوس ہوا کہ وہ اس عورت کو سکون دے سکتا ہے لیکن نہیں دے رہا ہے۔ صرف اپنی خودغرضی کی وجہ سے۔ اب یہ پریشان اسے ڈھونڈتی رہے گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ لڑکا انجکشن لگواکر آئے گا تو اس عورت کو سکون مل جائے گا۔ اس کی پریشانی وقتی ہے۔ اس خیال نے چوہدری کے بوجھل پن کو ختم کر دیا۔ "نہیں اماں' میں نے اسے بس یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے عورت سے کہا۔ "ویسے اماں اسے بیماری کیا ہے؟"

"بہت منحوس بیماری ہے اس کو۔" بڑھیا نے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ پڑیا پر بھی لگا ہوا ہے اور ٹیکے پر بھی۔"

چوہدری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "میں سمجھا نہیں اماں!"

"ارے وہی۔۔ کیا کہتے ہیں اس منحوس چیز کو۔۔ ہاں ہیروئن۔۔ اور نشے کا ٹیکہ۔۔ دونوں لیتیں ہیں خبیث کو۔" بڑھیا سر کے بال نوچنے لگی۔ "میں اسے گھر میں بند رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ باندھ کر رکھتی ہوں پھر بھی کسی نہ کسی طرح نکل جاتا ہے کم بخت۔"

چوہدری کو لگا کہ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ جس دنیا میں وہ رہتا ہے' اس سے کتنا بے خبر ہے اور انسانوں کی سمجھ بھی نہیں ہے اس کو۔

"وہ بہت چالاک ہے اور دنیا احمقوں سے بھری ہوئی ہے۔" بوڑھی عورت اپنی کہے جا رہی تھی۔ "وہ کسی نہ کسی سے پیسے بٹور لیتا ہے۔ تھوڑے پیسے ملے تو پڑیا اور زیادہ ملے تو انجکشن' بس یہی زندگی ہے اس منحوس کی۔"

چوہدری کو لگا کہ عورت براہ راست اسے احمق کہہ رہی ہے اور درست ہی کہہ رہی ہے۔

"مجھے دل کے نرم احمق لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ نفرت ہے مجھے ان سے۔" عورت اب تند لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "اسے پیسے دینے والے سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی نیکی کر رہے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اللہ انہیں جہنم رسید کرے گا تو انہیں پتہ چلے گا۔ عقل کے اندھوں کو نیکی اور گناہ کا فرق بھی نہیں دکھتا۔۔۔"

چوہدری کی روح تک لرز کر رہ گئی۔ نیکی کا خیال تو ہوا ہو گیا۔ وہ بدترین گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا اور اس کی گردن دکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"اب تو یہ مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ پورے گھر کو تباہ کر دیا ملعون نے۔" عورت اب اپنے بیٹے کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ پھر وہ چوہدری کی طرف مڑی۔ "تمہارا شکریہ بیٹے۔ میں جاتی ہوں اسے ڈھونڈنے لیکن مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی احمق مل چکا ہو گا اب تک۔ نہیں ملا تو مل جائے گا۔ میری قسمت میں تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگنا لکھا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

چوہدری نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ عورت کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر تک ایک بہت بڑے احمق سے گفتگو کرتی رہی ہے۔

چوہدری کی بھوک اڑ گئی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتا رہا۔ واقعی اس نے بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ نیکی کرنے کیلئے اتنا بے تاب ہو رہا تھا کہ اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور عقل سے کام نہیں لیا۔ نتیجہ یہ کہ نیکی برباد گناہ لازم۔ یوں تو اس کے دونوں جہاں کے دلدر دور ہونے کے بجائے الٹے بڑھتے چلے جائیں گے۔

وہ بریانی کو بھول کر ایمپریس مارکیٹ کے بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ وہ بری طرح جھنجھلا رہا تھا۔ اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا۔ یہاں سے شہر کے ہر حصے کیلئے گاڑیاں ملتی تھیں اسی لئے ہجوم بہت ہوتا

تھا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ سگریٹ کے کش لیتا اور سوچتا رہا۔ اچانک اسے سورۂ بقرہ کے 37 ویں رکوع کی آخری آیت کا ترجمہ یاد آیا۔ اس میں اللہ نے ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا تھا' جو زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ سوال نہ کرنے کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں خوشحال سمجھتے ہیں اور اللہ نے فرمایا کہ تم ان کو ان کے چہرے سے پہچان سکتے ہو۔ یہ لوگ لوگوں کے پیچھے نہیں پڑتے لوگوں سے مدد نہیں مانگتے۔

یہ آیت یاد آئی تو چوہدری کی وقتی مایوسی دور ہو گئی۔ وہ ایک نئے اور تازہ جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اس آیت میں بیان کئے گئے لوگوں کو تلاش کرنے کیلئے ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ لوگوں کو بہت غور سے دیکھا جائے۔ ان کا مشاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ لوگوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

شام کا وقت تھا۔ بس اسٹاپ پر لوگوں کا رش تھا۔ وہاں جو لوگ کھڑے تھے' ان کے روٹ کی بس آتی تو وہ اس بس میں بیٹھ جاتے لیکن بس کے منتظر لوگوں کی تعداد میں کمی نہیں' زیادتی ہو رہی تھی۔ جتنے لوگ کم ہوتے تھے' اس سے زیادہ آ جاتے تھے۔ بس چہرے بدل رہے تھے۔

چوہدری نے دوسرا سگریٹ جلایا اور کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے لگا کہ اسے اپنا مطلوبہ آدمی مل گیا ہے۔ اس نے اپنی توجہ لوگوں کی بھیڑ سے ہٹا لی اور صرف اس شخص پر مرکوز کر دی۔

وہ شخص صاف ستھری پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سیاہ چمک دار جوتے تھے' جن کی چمک بتاتی تھی کہ انہیں آج ہی پالش کیا گیا ہے۔ اس کی عمر 35 اور 40 کے درمیان ہو گی۔ وہ خوش شکل تھا۔ اس کے چہرے پر وقار اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ چہرے سے ہنس مکھ اور خوش مزاج لگتا تھا۔

چوہدری نے اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اسے احساس تھا کہ جب سے وہ بس اسٹاپ پر آیا ہے' یہ شخص بھی وہاں موجود ہے۔ ممکن ہے اس کی مطلوبہ بس یا

منی بس ابھی تک نہیں آئی ہو۔ بہرکیف اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص پر نظر رکھنی ہے۔

دو منٹ بعد 4k کی بس آئی تو وہ شخص بس کی طرف بڑھا لیکن پھر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ چند لمحے وہ کھڑا ہچکچاتا رہا پھر پیچھے آ کر دوبارہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔

چوہدری نے سوچا' ممکن ہے' یہ بس اسے گھر سے کچھ دور اتارتی ہو۔ اس لئے یہ پلٹ آیا ہے۔

مگر وہ شخص 4k کی دوسری بس کی طرف بھی اسی طرح بڑھا' اسی طرح ہچکچایا اور اسی طرح پلٹ آیا۔

وہ شخص باہر کسی زاویے سے بھی نادار اور ضرورت مند نہیں لگ رہا تھا بلکہ خوش حال نظر آتا تھا مگر اگلے چند منٹوں میں چوہدری کو اندازہ ہو گیا کہ انسانوں کو غور سے دیکھا جائے تو بہت کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ غور سے دیکھنے پر چوہدری نے جان لیا کہ اس شخص کے کپڑے صاف ستھرے بھی ہیں اور ان پر نفاست سے استری بھی کی گئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کی بوسیدگی نظر آ جاتی ہے۔ کپڑے کافی پرانے ہیں۔

پھر چوہدری نے اس کے جوتوں کو دیکھا۔ جوتے چمک دار ضرور تھے لیکن ان کی ایڑیاں بہت گھسی ہوئی اور ناہموار تھیں۔ اس وجہ سے اسے ایک طرف جھکنا پڑ رہا تھا۔

اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ کبھی کبھی اس کے چہرے پر ایک لمحے کیلئے پریشانی کا ایک سایہ سا لہرا جاتا ہے۔ وہ خوش مزاج ضرور ہے اس کے ہونٹ ہر وقت مسکرانے کے عادی بھی ہیں لیکن اس وقت وہ مسکراہٹ بہت بجھی بجھی سی ہے۔

4k کے روٹ پر چلنے والی بسوں کی تعداد کم نہیں۔ ہر ایک منٹ کے بعد ایک بس آ جاتی ہے اور کبھی کبھی تو ایک ساتھ دو بلکہ تین بسیں بھی آ رہی تھیں۔ اس کے مشاہدے کے دوران میں وہ شخص مزید چھ سات بسیں مس کر چکا تھا اور 4k کے

علاوہ کسی بس یا منی بس میں اس نے دلچسپی نہیں لی تھی۔

چوہدری اس شخص کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس شخص کو کسی طرح کچھ دے دے لیکن دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ اس بار وہ جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ایسے شخص کی مدد کیسے کی جائے۔ جو اپنا حال دوسروں سے چھپا رہا ہے۔ وہ برا بھی مان سکتا ہے اور بے عزتی بھی کر سکتا ہے۔ ویسے بھی یوں مدد قبول کر کے وہ شرمندہ ہو گا۔ یہ بھی اچھی بات نہیں۔ اسے تو اس طرح سے کچھ دیا جائے کہ اسے پتہ بھی نہ چلے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اسے کس طرح ممکن بنایا جائے۔

چوہدری سوچتا رہا لیکن اس شخص پر سے اس نے نظر نہیں ہٹائی تھی۔

اب وہ شخص کچھ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا پھر اس نے سر اٹھا کر ایمپریس مارکیٹ کے گھنٹا گھر کی طرف دیکھا اور مایوس نظر آنے لگا۔ چوہدری نے بھی ادھر دیکھا اور اس کی مایوسی کی وجہ سمجھ گیا۔ گھنٹا گھر کی گھڑی بند تھی۔

اس شخص نے اپنے قریب کھڑے ایک اور شخص سے وقت پوچھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ قریب کھڑے شخص نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھنے کے بعد اسے جواب دیا تھا۔ وقت پوچھنے کے بعد اس شخص کی بے تابی اور اضطراب اور بڑھ گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ ایسے ہی ایک لمحے میں چوہدری کو اس کی آنکھوں میں دیکھنے کا موقع مل گیا اور جو کچھ اسے ان آنکھوں میں نظر آیا' اس سے اس کے اندازے کی حتمی تصدیق ہو گئی۔

چوہدری تلی ہوئی مچھلی بیچتا تھا۔ آنکھوں میں نظر آنے والی بھوک کا اسے بہت تجربہ تھا۔ وہ اسے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کی دکان کے سامنے سے کوئی بھوکا شخص گزرتا تو وہ مچھلی کو ایک خاص انداز سے دیکھتا تھا لیکن آنکھوں کی اس کیفیت کے نیچے ایک خالی پن سا۔۔۔ ایک نقاہت سی بھی ہوتی تھی۔ چوہدری اس سے پہچان لیتا تھا کہ اس شخص نے کتنے وقت سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ کبھی وہ ایسے لوگوں کو خود ہی بلا کر مچھلی کھلا بھی دیتا تھا۔

اس وقت اس خوبرو خوش پوش اور باوقار شخص کی آنکھوں میں اسے بھوک تو نظر نہیں آئی لیکن وہاں نقاہت اور خالی پن بالکل واضح تھا اور چوہدری دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے۔ ممکن ہے' گزشتہ رات کھایا ہو۔

چوہدری کا دل بھر آیا۔ دنیا میں ایسے رکھ رکھاؤ' ایسے صبر والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اس بار جو 4k آئی تو وہ شخص بڑے اعتماد سے بس کی طرف بڑھتا گیا۔ لوہے کا ہینڈل تھام کر وہ پائیدان پر چڑھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر نیچے اتر آیا اور فٹ پاتھ کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ شرمندگی' کھسیاہٹ' بے بسی جیسے آپس میں گھل مل رہی تھیں۔

اب چوہدری کو یقین ہو گیا وہ شخص نہ صرف دن بھر کا بھوکا تھا بلکہ اس کی جیب بالکل خالی تھی اس لئے وہ بس میں نہیں چڑھ پا رہا تھا اور اس کی بے تابی' اس کا اضطراب ظاہر کرتا تھا کہ وہ گھر واپس پہنچنے کیلئے بے چین ہے۔

اس لمحے چوہدری کے ذہن میں ایک بے حد خوف ناک سوال نے سر اٹھایا۔ کیا اس شخص کے گھر میں اس کے بیوی بچے بھی بھوکے ہوں گے۔ وہ اس پر سوچ ہی رہا تھا کہ 4k کی ایک اور بس آ گئی۔ اس بار وہ شخص نہ صرف بس کی طرف بڑھا بلکہ بس میں بیٹھ ہی گیا۔

چوہدری کے غبارے میں ایک پن چبھی' شوں کی طویل آواز کے ساتھ ساری ہوا نکل گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے سوچا۔ میرے سارے اندازے غلط تھے۔ شاید اس شخص کا اضطراب اس لئے تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا اور آنکھوں کی نقاہت کا سبب بھوک نہیں ہو گی۔ شاید وہ بیماری سے اٹھا تھا۔ بیماری کے فوراً بعد ہی تو آنکھوں میں یہ کیفیت آ جاتی ہے۔

وہ اس سے زیادہ نہیں سوچ سکا۔ اس کی نظریں اس بس کے دروازے پر جمی تھیں' جس میں وہ شخص بیٹھا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ وہ شخص

اب بس سے اتر رہا تھا۔ اس بار وہ فٹ پاتھ کی طرف نہیں گیا بلکہ بس اسٹاپ سے آگے کی طرف چل دیا۔ لگتا تھا کہ اس نے پیدل گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وہ شخص چوہدری کے قریب سے گزرا تو چوہدری کو اس کی آنکھوں کی نمی بالکل صاف نظر آئی پھر اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ بھی بالکل واضح تھی۔ اب چوہدری نے سمجھ لیا کہ اس کا اندازہ بالکل درست تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اس سلسلے میں کچھ کرنا ہو گا۔

چوہدری تھوڑے فاصلے کے ساتھ اس شخص کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ شخص بس اسٹاپ سے آگے جو چوراہا تھا' وہاں پہنچ کر رک گیا۔ یہاں ایک سائڈ روڈ تھا' جو مین روڈ کو کاٹتا ہوا گزر رہا تھا۔ سامنے اسٹار سینما نظر آ رہا تھا۔ شام کو ٹریفک کے رش کی وجہ سے موٹر سائیکل سوار اسی سڑک کا رخ کرتے تھے۔

وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ چوہدری بھی تھوڑے فاصلے پر رک کر اسے بغور دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ شخص اس امید پر وہاں آیا ہے کہ شاید کوئی موٹر سائیکل والا اسے لفٹ دے دے گا لیکن خودداری اسے ہاتھ کے اشارے سے کسی موٹر سائیکل سوار کو روکنے کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھی۔ کوئی موٹر سائیکل آتی نظر آتی تو اس شخص کا ہاتھ کپکپاتا جیسے اشارہ کرنے کیلئے حرکت میں آ رہا ہو مگر اگلے ہی لمحے سختی سے اس کی مٹھی بھنچ جاتی۔

چوہدری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس طرح اس شخص کی مدد کرے۔ ایسے کہ نہ اسے پتہ چلے' نہ اس کی خودداری کو ٹھیس لگے۔ اس شخص کی شرمندگی ہوئی تو اس کی نیکی لاحاصل ہی ہو گی۔

موٹر سائیکل سوار لوگ گزرتے رہے۔ وہ شخص رکنے کا اشارہ دینے سے خود کو روکنے کیلئے مٹھیاں بھینچتا رہا۔ چوہدری اس کی مدد کرنے کی کوئی ترکیب سوچتا رہا۔ کافی دیر ہو گئی۔ اب سورج ڈوبنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ روشنی کم ہو رہی تھی۔ سائے بڑھ رہے تھے۔

اچانک چوہدری کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے خیال آیا' واحد

صورت یہی ہے کہ چپکے سے اس شخص کی پینٹ کی جیب میں نوٹ ڈال دیئے جائیں۔

کیسے؟ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ بس وہ یہی سوچ رہا تھا کہ جیسے جیب کترے دو انگلیوں کی مدد سے جیب خالی کرتے ہیں' وہ اس شخص کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی جیب بھر دے۔

یہ سوچ کر اس نے جیب سے رقم نکالی۔ اس کے پاس تین سو اسی روپے تھے۔ پہلے اس نے سو روپے الگ کئے پھر سوچا' اس مہنگائی کے زمانے میں سو روپے سے کیا ہوتا ہے۔ دو سو اس شخص کو دے کر بھی اس کے پاس 180 روپے بچیں گے' جو اس کے لئے بہت ہیں۔ چنانچہ اس نے 180 روپے جیب میں رکھے اور سو کے دو نوٹوں کو جیب کتروں کے انداز میں دو انگلیوں کے درمیان دبایا مگر اسے احساس ہوا کہ یوں دو انگلیوں کا کوئی فائدہ نہیں چنانچہ اس نے دونوں نوٹوں کو ملا کر تہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ تعویذ نما ہو گئے۔ تب اس نے اس تعویذ کو اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے درمیان دبایا پھر اس نے بڑی آہستگی سے دونوں انگلیوں کو اپنی قمیص کی پہلو والی جیب میں داخل کیا۔ اسے اطمینان ہوا کیونکہ کام صفائی سے ہوا تھا۔

اب وہ حرکت کرنے کیلئے تیار تھا۔

اسی لمحے اس شخص کے پاس ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ سوار نے ہمدردانہ نظروں سے اس شخص کو دیکھا اور بڑے احترام سے پوچھا۔ "آپ کو کہاں جانا ہے صاحب؟"

"مجھے تو بہت دور جانا ہے بھائی۔" اس شخص نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"پھر بھی؟"

"نیو کراچی جاؤں گا۔"

"چلیں۔ میں آپ کو یو پی موڑ تک چھوڑ دوں گا۔ بیٹھ جائیں۔"

چوہدری کو لگا کہ نیکی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ دو نوٹوں کا تعویذ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس شخص کی طرف بڑھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھنے

ہی والا تھا کہ چوہدری نے دونوں انگلیاں اس کی پینٹ کی جیب میں داخل کیں۔ تعویز کو وہیں چھوڑا اور انگلیاں نکال لیں لیکن اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کیونکہ وہ یہ کام صفائی سے نہیں کر سکا تھا۔ اس کی انگلیاں جیب کے اندر اس شخص کی رانوں سے ٹکرائی تھیں۔ ہاتھ نکالتے ہوئے بھی ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔

چوہدری کا دم نکل گیا۔ اس نے جیب نہیں کاٹی تھی لیکن حرکت جیب کتروں ہی کی سی تھی۔ اسے لگا کہ ابھی وہ شخص شور مچائے گا۔ "ارے میری جیب۔۔۔ اور اسے گردن سے پکڑ لے گا۔ اس کے بعد میری مرمت۔ وہ تیزی سے آگے نکلا۔ وہ شخص موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا لیکن پلٹ کر دیکھنے کی چوہدری کو ہمت نہیں ہوئی۔ وہ تو ابھی سے اپنی گردن پر اس شخص کی گرفت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ موٹرسائیکل زن سے آگے نکل گئی۔ وہ شخص پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ عجیب بات تھی کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے اپنی جیب میں چوہدری کی انگلیوں کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا ہو۔

چوہدری دور جاتی موٹرسائیکل کو دیکھتا رہا پھر اسے ایسا لگا جیسے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اسے پلٹ کر دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا وجود طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے سوچا' سیدھی سی بات ہے۔ اگر میری جیب بالکل خالی ہو اور کوئی میری جیب میں ہاتھ ڈالے تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی بلکہ مجھے ہاتھ ڈالنے والے پر ترس آئے گا۔ مجھے جیب چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہاں جیب میں پیسے ہوں تو اور بات ہے۔

یعنی اس شخص کی جیب واقعی خالی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ وہ نیکی کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

خوشی کا احساس ہوا تو بھوک اس شدت سے لگی کہ اس کا کلیجا نچنے لگا۔ اس لمحے اس نے بریانی والے ریسٹورنٹ میں پہنچ کر ہی دم لیا۔



کھانا کھاتے کھاتے نہ جانے کیسے نیکی سے حاصل ہونے والی خوشی ہوا ہو گئی۔ اصل میں وہ نیکی ہی اس کی نظروں میں مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا' کون جانے معاملہ یہ نہ ہو۔ اس شخص کی جیب میں پیسے ہوں۔ ایسے میں اس کے دو سو روپوں سے کیا فائدہ ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ڈالے ہوئے دو سو روپے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہی بیٹھتے اس کی جیب سے گر گئے ہوں تو وہ نیکی تو نہیں شمار ہو گی' اگر وہ شخص اور اس کے بچے رات کو بھوکے ہی سوئیں۔

چنانچہ وہ بے چین ہو گیا۔ نیکی کی طلب پھر پھانس بن کر اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ نیکی وہ اب تک نہیں کر سکا اور نیکی کئے بغیر وہ گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنا کام دھندا چھوڑ کر اس مشن پر نکلا تھا۔ کامیابی اس کیلئے بہت ضروری تھی۔

وہ کھانا کھا کر نکلا تو اسے احساس ہوا کہ اب مہلت کم رہ گئی ہے۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور چھوٹے چھوٹے کش لیتا اندھا دھند آگے بڑھتا رہا۔ اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ ایک نیکی کی خواہش اس کے اندر پوری شدت سے مچل رہی ہے اور دنیا میں ہزاروں لاکھوں ایسے افراد ہوں گے جنہیں مدد کی ضرورت ہو گی۔ اسے کم از کم ایک ایسا فرد ضرور ملے گا' جس کے ساتھ وہ نیکی کر سکے۔

وہ ایمپریس مارکیٹ کے گردونواح میں گھومتا رہا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ متحرک انسانوں کا ہجوم تھا۔ نیکی اور بدی کے تصور سے آزاد ہر شخص اپنے کام میں مصروف تھا۔

اچانک چوہدری محکوم اللہ کو ایک برقع پوش عورت نظر آئی۔ اس نے شاید

بازار سے اپنے گھر کیلئے مہینے بھر کا راشن خریدا تھا اور وہ گھر لے جانا تھا۔ سامان کافی تھا۔ وہ ہر گزرتے ہوئے رکشا کو رکنے کا اشارہ کرتی لیکن وہ خالی ہونے کے باوجود یوں گزر جاتے جیسے انہوں نے اس عورت کو' نہ اس کے شارے کو دیکھا ہو' نہ اس کی پکار سنی ہو۔

چوہدری اس عورت کے قریب کھڑا ہو گیا۔

پھر ایک رکشے والا ٹھہر ہی گیا۔ "کہاں جانا ہے مائی؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"پیر کالونی۔" عورت نے جواب دیا۔

"پچاس روپے ہوں گے۔"

"بھائی یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" عورت نے احتجاج کیا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان حجت ہوتی رہی۔ بالآخر چوہدری محکوم اللہ کو مداخلت کرنا ہی پڑی۔ "کیوں زیادتی کرتے ہو؟" اس نے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔ "یہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی تک بیس روپے بھی مشکل سے بنیں گے۔"

"یہ اتنا سامان بھی تو ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"تو یہ رکشہ میں ہی جائے گا تم اپنی پیٹھ پر لاد کر تو نہیں لے جاؤ گے۔"

"او بھائی' میں پچاس سے کم میں نہیں جاؤں گا۔" رکشے والا جو عورت سے چالیس پر رضا مند ہو رہا تھا پھر پچاس پر اڑ گیا۔

"تو یہ میٹر کس مرض کی دوا ہے۔" چوہدری نے رکشہ کے میٹر پر ہاتھ مارا۔

"ہاتھ پرے ہٹاؤ یارا۔" رکشہ ڈرائیو نے اسے سخت نگاہوں سے دیکھا۔ "اب تو مجھے پیر کالونی جانا ہی نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں جاؤ گے۔ تم سڑک پر نکلے ہو۔ رکشہ خالی ہے۔ میٹر موجود ہے تمہیں زیادہ پیسے مانگنے کا کوئی حق نہیں۔" چوہدری بھی برہم ہو گیا۔

رکشے والا کوئی جواب دینے کے بجائے رکشہ آگے بڑھا لے گیا۔

عورت نے چوہدری کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا' جیسے اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو پھر وہ اپنا سامان اٹھا کر سڑک پار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

سامان بہرحال بہت زیادہ اور بھاری تھا۔

"لائیے بہن' میں آپ کی مدد کروں۔" چوہدری نے بے حد شائستگی سے کہا لیکن عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ انداز۔۔سے لگتا تھا کہ چوہدری نے ایک بار اور پیشکش کی تو وہ شور مچا دے گی۔

اب چوہدری اس طرح کے معاملات میں سمجھ دار اور چوکنا ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر بے پروائی سے کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

نیکی کی طلب میں اب بھی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مزید بھٹکتا رہا پھر اس نے ایک لفنگے نوجوان کو ایک لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا۔ لڑکی بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ چوہدری نے مداخلت کی تو لفنگے نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کیا تکلیف ہے بزرگو۔ یہ تمہاری بیٹی تو نہیں۔"

"میری بیٹی ہی سمجھو۔ جاتے ہو یا نہیں۔"

"جاؤ بڑے میاں ورنہ میرے ہاتھ سے ضائع ہو جاؤ گے۔" لفنگے نے دھمکی دی۔

چوہدری ایک لمحے کو ڈرا پھر نیکی نے اسے اکسایا۔ اس نے سوچا کہ یہ تو ادت بھی مل سکتی ہے۔ دوسری طرف اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ لفنگا گیدڑ بھبکی ے رہا ہے ورنہ اس کے لہجے میں کمزوری ہے۔ سو چوہدری نے اپنی قمیص کی اندرونی ب میں ہاتھ ڈالا۔ لفنگا گھبرا کر فرار ہو گیا۔

اب چوہدری کو احساس ہوا کہ لڑکی حرکت میں نہیں ہے۔ وہ ایک جگہ کھڑی ا۔ "بیٹی۔۔ چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔"

لڑکی یہ سن کر خوف زدہ نظر آنے لگی۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کی خوف ا پر چوہدری حیران ہوا۔ تاہم اس نے اپنی بات دہرائی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس بار لڑکی نے جواب دیا۔

"یہاں کھڑی رہو گی تو تمہیں تنگ کرنے والے آتے رہیں گے۔" چوہدری نے

"آنے دو۔ تمہیں کیا۔ میرا کام خراب مت کرو۔"

"چوہدری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی کا کیا کام ہے' جو وہ خراب کر رہا ہے لیکن لڑکی کے تیور دیکھ کر اس نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ جا ہی رہا تھا کہ اس نے لڑکی کو کسی سے کہتے سنا۔ "بڑے میاں نے کام خراب کر دیا۔ اب جانے کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تو ابھی بچی ہے۔" مردانہ آواز سنائی دی۔ "اس جوان کے پاس سے کچھ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ اسامی تگڑی دیکھا کر مجھے تو یہ بعد والا ہی بہتر لگ رہا تھا۔"

چوہدری نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی کے ساتھ ایک مرد کھڑا تھا۔ "تگڑی اسامی کا مجھے کیسے پتہ چلے گا؟" لڑکی نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"آدمی کے ظاہر سے' اس کے کپڑوں سے کچھ نہیں ہوتا۔" مرد نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "چال دیکھا کر' چال۔ جیب بھاری ہو تو آدمی کے قدموں میں اعتماد ہوتا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے کہ صحیح وقت پر میں سی آئی اے والا بن کر آ جاؤں لیکن بندے کی جیب میں مال ہی نہ ہو تو فائدہ' اب میں سچ مچ کا سی آئی اے والا تو ہوں نہیں کہ اندر ہی کر دوں سالے کو۔"

چوہدری محکوم اللہ تیزی سے وہاں سے کھسکا۔ جو تصویر وہاں اسے نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑی بھیانک تھی۔ دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ کیا کیا ہوتا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کیا رشتہ ہے یا کوئی رشتہ ہے بھی یا نہیں؟ بہرحال یہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ مل کر دھندا کرتے تھے۔ مرد لڑکی کو چارہ بنا کر سڑک پر کھڑا کر دیتا تھا۔ لڑکی کم عمر تھی اور خوبصورت بھی۔ اسے دیکھ کر لوگ للچاتے ہوں گے۔ پھنسانے کے چکر میں خود ہی پھنس جاتے ہوں گے۔ مرد سی آئی اے والا بن کر مداخلت کرتا ہو گا اور جیبیں خالی کرا لیتا ہو گا۔

اچانک چوہدری کو خیال آیا کہ وہ مرد بھی ابھی کچا ہے ورنہ اس کے بارے میں یہ نہ کہتا کہ مجھے تو یہ بعد والا ہی بہتر لگ رہا تھا۔

اس واقعے کے عد چوہدری کچھ ڈر بھی گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نیکی کی آرزو میں کوئی مصیبت ہی گلے پڑ جائے۔ کل سے اب تک کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔
یہ سب اپنی جگہ لیکن نیکی کی طلب میں اب بھی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ

تھکن سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ اب ساڑھے سات بجے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے سے وہ مسلسل بے سمت مارا مارا پھر رہا تھا۔ سات گھنٹے' سات گھنٹے کم نہیں ہوتے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس دوران میں وہ کہاں کہاں سے گزرا تھا۔ سات گھنٹے سے ضرورت مندوں کی اس دنیا میں وہ ایک حقیقی ضرورت مند کی تلاش میں بھٹک رہا تھا کہ اس کی مدد کر کے ایک بے غرض اور گمنام نیکی کما سکے لیکن ایسا لگتا تھا کہ یہاں کسی کو کسی سے کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

اب اس کی نیکی کی خواہش تھکن کے شدید احساس کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی۔ اس نے آخری بار قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کنٹرک روڈ پر چل پڑا۔ اس نے سوچا' یہاں سے جیکب لائن ہوتے ہوئے وہ پرانی نمائش تک جائے گا۔ راستے میں اگر کوئی ضرورت مند مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ نمائش سے بس پکڑ کر سیدھا اپنے گھر کا رخ کرے گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس چھوٹی سڑک پر چل دیا۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا۔ بھرا ہوا پیٹ اور اس پر شدید تھکن۔ چند گہرے کش لئے تو وہ سرور میں آ گیا۔ اگر آج موقع نہیں ملا تو کوئی بات نہیں۔ زندگی رہی تو کل بھی کوشش کرے گا بلکہ کوشش کرتا رہے گا۔

اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی مدھم روشنی میں سائے لرزتے پھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اچانک بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اسے ایک عورت بیٹھی نظر آئی' جس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ عورت بہت پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے اتنے گہرے تھے کہ انہیں دیکھ کر چوہدری محکوم اللہ کے دل میں ہمدردی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

وہ اس کے پاس رک گیا۔ "کیا بات ہے بہن کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

"میں کیا کروں بھائی۔ میرے بچے کی طبیعت خراب ہے۔ اسے ہسپتال لے جانا ہے۔ میں نے اپنے بڑے بچے کو رکشہ لانے کیلئے بھیجا تھا۔ بہت دیر ہو گئی' وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔"

"تمہارے گھر میں کوئی اور نہیں؟"

"بس یہ دو بچے ہیں میرے۔"

"اور تمہارا شوہر۔"

"وہ مل میں کام کرتا ہے ابھی کام سے واپس نہیں آیا ہے۔"

"تم رہتی کہاں ہو؟"

"ادھر پیچھے جھونپڑی ہے ہماری۔"

چوہدری کو وہ متوقع نیکی پکے ہوئے پھل کی طرح لگی۔ وہ اسے توڑنے کیلئے بے تاب ہوگیا۔ "مجھے بتاؤ میری بہن میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟"

عورت خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ لرزے لیکن آواز نہیں نکلی۔

"میں رکشہ لا کر دوں تمہیں؟ جانا کہاں ہے؟"

"میں ہسپتال کیسے جا سکتی ہوں۔ میرا دل تو بڑے بچے میں اٹکا رہے گا۔ وہ پتہ نہیں کہاں ہے؟ کوئی اسے اٹھا کر تو نہیں لے گیا۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا؟" عورت رونے لگی۔

"روؤ مت میری بہن۔" چوہدری نے اسے چمکارا۔ "اچھا۔۔۔ میں تمہارے بڑے بچے کو تلاش کروں؟"

"تم تو بھائی اسے پہچانتے بھی نہیں ہو۔ کیسے ڈھونڈو گے۔" عورت نے بے بسی سے کہا۔

"میں کیا کروں۔" چوہدری نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"ہاں۔۔۔ ایک صورت ہے۔" عورت نے اسے پرامید نظروں سے دیکھا۔

"تم حکم کرو میری بہن۔"

"تم تھوڑی دیر میرے اس بچے کو سنبھال لو۔ میں اپنے بڑے بچے کو تلاش کرتی ہوں اور میں رکشہ بھی لے آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بہن۔ میں حاضر ہوں۔" چوہدری نے بچے کو گود میں لینے کیلئے ہاتھ

پھیلائے۔

عورت نے کہنے کو کہہ تو دیا لیکن اب وہ دھندلی روشنی میں چوہدری محکوم اللہ کو شک میں لپٹی ہوئی تولنے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں دوسرے بچے کو بھی نہ کھو دے۔

چوہدری نے اس کی الجھن سمجھ لی۔ "تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو بہن۔ میں بھی بچوں والا ہوں۔ کبھی یہ وقت میری بیوی پر بھی آ سکتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ تم جا کر بڑے بچے کو ڈھونڈ لاؤ۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔"

چوہدری کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ عورت کے شکوک دھل گئے۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور بچے کو اس کی گود میں دے دیا۔ "اسے لے کر یہیں بیٹھے رہنا میرے بھائی۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

چوہدری بچے کو گود میں لے کر اس کھمبے کے نیچے بیٹھ گیا۔ عورت اس طرف چلی گئی جہاں سے چوہدری آیا تھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹ کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کی مامتا یقیناً اسے اذیت دے رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد چوہدری نے اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں بچے کا جائزہ لیا۔ بچے کی سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کر چوہدری کا دل بھر آیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔ اس نے بچے کے رخساروں کو بوسہ دیا اور اس کے کانوں میں اس طرح سرگوشی کی جیسے بچہ اس کی ہر بات سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ "تم یقیناً زندہ رہو گے ننھے بچے۔ تم تو مستقبل ہو۔ مستقبل جسے روشن ہونا چاہئے۔" اس نے بچے کی پیشانی چوم لی۔

تھوڑی دیر گزری تو چوہدری بے چین ہوگیا۔ اس نے کبھی اپنے کسی بچے کو بھی گود میں نہیں لیا تھا اور پھر اس طرح گود میں لے کر زمین پر بیٹھنا۔ تھکن سے اس کا ویسے ہی برا حال تھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے اسے لگا کہ اس کا جسم پتھر کا ہو جائے گا۔

ادھر بچہ کسمسایا۔ اچانک چوہدری کو احساس ہوا کہ وہ اندر تک اپنے کپڑوں کے نیچے تک کسی گرم گرم مائع سے بھیگتا جا رہا ہے۔ یہ سمجھنے میں اسے ذرا دیر لگی کہ مستقبل نے اس پر پیشاب کر دیا ہے۔ اتنی دیر میں شاید بھیگنے کی وجہ سے بچے نے

روتا بھی شروع کر دیا تھا لیکن اس کی آواز بہت کمزور تھی۔

چوہدری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اپنے چار بچے تھے لیکن یہ پیشاب والی واردات اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ بچے کو کھمبے کی جڑ میں رکھے اور بھاگ کھڑا ہو۔ جلدی سے جا کر نہا لے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس وقت ایک نیکی کر رہا ہے۔ ایسی نیکی جو ابتدا میں آسان لگتی ہے مگر اب بے حد دشوار ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ اسی عالم میں بچے کو لے کر ٹہلتا رہا۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر بچے کو چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ نیکی اس کی دانست میں دشوار ثابت ہو رہی تھی لیکن وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نیکی کتنی زیادہ دشوار ثابت ہونے والی ہے۔ وہ تو بس عورت کی واپسی کی دعائیں مانگے جا رہا تھا۔

ٹہلتے ہوئے اس کا رخ اب اس طرف تھا' جدھر عورت اپنے بڑے بچے کی تلاش میں گئی تھی۔ اچانک اس کی پشت کی طرف سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک گلی سے چند سائے لپکتے نظر آئے۔

"وہ رہا۔" کسی نے چیخ کر کہا۔

چوہدری کا جی چاہا کہ بھاگ کھڑا ہو لیکن اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس سے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ اس پر کوئی افتاد آنے والی ہے' لیکن افتاد کی نوعیت کا اسے علم نہیں تھا۔



فضل حسین نمائش کی اندر والی سڑک پر دکان کرتا تھا۔ گھر اس کا اندر لائنز ایریا میں تھا۔ اس وقت دکان پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ اچانک ایک لڑکا ہانپتا ہوا آیا۔

"فضل چچا ——— فضل چچا —— چاچی نے کہلوایا ہے کہ عمران کی طبیعت خراب ہے۔" لڑکے نے بتایا۔

فضل پریشان ہو گیا۔ عمران اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔ ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اس کی بیوی کی طبیعت پہلے ہی بہت خراب تھی۔ دوپہر کو وہ گھر گیا تھا تو سعیدہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ وہ اسے دوا دے آیا تھا اور تاکید بھی کر دی تھی کہ دوا وقت پر لیتی رہے۔ عمران اس وقت ٹھیک ٹھاک تھا۔

فضل نے جلدی جلدی گاہکوں کو سودا دیا پھر بھی پندرہ منٹ لگ گئے۔ اس نے جلدی جلدی دکان بند کی اور گھر کی طرف لپکا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر گھر پہنچ جاتا۔ گھر پہنچا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی بیوی بخار میں بے سدھ پڑی تھی اور بچہ موجود نہیں تھا۔

اس نے بیوی کو جھنجوڑ ڈالا۔ "سعیدہ —— عمران کہاں ہے؟"

"مجھے ——— نہیں معلوم ——— یہیں ہو گا۔" سعیدہ ہوش میں نہیں تھی۔

"یہاں کوئی آیا تھا۔"

"نہیں' کوئی نہیں۔"

فضل پھر باہر آیا۔ سعیدہ بے ہوش تھی اور یہ طے تھا کہ بچے کو کوئی اٹھا کر لے گیا ہو گا۔ وہ پریشان تھا۔ اس نے محلے کے چار پانچ آدمی اکٹھا کئے۔ انہوں نے ادھر ادھر پوچھا کسی مشکوک آدمی کے متعلق۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ ایک آدمی کسی بچے کو لے کر اس طرف جا رہا تھا۔

وہ سب اس طرف دوڑے۔ دور تک کوئی نہیں تھا پھر وہ گلی سے نکلے۔ سامنے کٹرک روڈ تھا۔ اچانک انہیں وہ شخص نظر آیا۔ وہ ایک بچے کو کندھے سے ٹکائے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فضل کے ایک ساتھی نے نعرہ لگایا۔ "وہ رہا۔" اور وہ سب اس پر جھپٹے۔

بچے کو لے جانے والے نے پلٹ کر دیکھا اور اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔



اگلے ہی لمحے چھ آدمی چوہدری محکوم اللہ کے سر پر سوار تھے۔ ایک نے آتے ہی بچہ اس سے چھین لیا۔ "ارے یہ تو بہت گرم ہو رہا ہے۔ بہت بخار ہے۔" اس نے کہا۔

"تم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ فضل بھائی۔" کسی نے کہا۔ "اس بردہ فروش سے ہم نمٹ لیں گے۔"

"ک ک۔۔ کیا۔۔ بات ہے۔" چوہدری ہکلایا۔

جس نے بچہ اس سے چھینا تھا' وہ گلی کی طرف واپس جا رہا تھا۔

"پوچھتا ہے' کیا بات ہے۔" جھپٹنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "ابھی بتاتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی چوہدری کی مرمت شروع ہو گئی۔ چوہدری کا ذہن اور جسم دونوں شل ہو گئے۔ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکا۔ اس کی مرمت ہوتی رہی اور وہ خاموشی سے پٹتا رہا پھر مارنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "اب بس کرو۔ کچھ پولیس کیلئے بھی چھوڑ دو۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ اب اسے تھانے لے چلو۔" دوسرا بولا۔

پولیس کے نام پر چوہدری بھڑک گیا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پولیس کو بھی بھگتتا۔ چنانچہ اس نے جھٹکا مار کر خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ اتنی سعادت مندی سے پٹتا رہا تھا کہ مارنے والوں کو اس کے اس طرح بھاگ لینے کی امید بھی نہیں تھی۔ ان کے سنبھلتے سنبھلتے وہ خاصا دور نکل گیا تھا پھر بھی وہ تینوں

اس کے پیچھے بھاگے۔

چوہدری محکوم اللہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ پتہ نہیں' وہ کتنی اندھی گلیوں سے گزرا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر بھاگا۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز معدوم ہونے پر وہ سکون کا سانس لینا ہی چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے کتے لگ گئے۔ ایک کتے کے دانتوں کی زد میں آ کر اس کی شلوار گھٹنوں کے نیچے سے پھٹ گئی۔ شکر یہ ہوا کہ دانت گوشت میں نہیں لگے۔ ورنہ چودہ انجکشن کی مصیبت اور گلے پڑتی۔

بالآخر کتوں سے بھی جان چھوٹی تو وہ ٹھہر گیا۔ اس وقت وہ ایک گلی کے وسط میں تھا اور اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں رک کر سانسیں درست کرے لیکن وہ خوف زدہ تھا۔ اس میں رکنے کی ہمت نہیں تھی۔ غضب خدا کا۔۔ کتنی خوفناک مصیبت میں پھنسا تھا وہ۔

وہ ہانپتا کانپتا اس گلی سے نکلا تو ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔

وہ وہیں آ پہنچا تھا جہاں سے جان چھڑا کر بھاگا تھا۔ یہ سب تاریک گلیوں کی کارستانی تھی۔ وہاں وہ لوگ تو موجود نہیں تھے جنہوں نے اسے مارا تھا لیکن چھ سات دوسرے مرد وہاں موجود تھے اور وہ عورت کھڑی بری طرح رو رہی تھی جو اپنا بچہ اسے سونپ کر گئی تھی۔ اس کے ساتھ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔

پے در پے نازل ہونے والی مصیبتوں نے چوہدری محکوم اللہ کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

"یہی ہے وہ آدمی۔" عورت اسے دیکھتے ہی ہذیانی انداز میں چلائی۔

چوہدری محکوم اللہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا۔ اس بار وہ زیادہ جارح افراد کے نرغے میں پھنسا تھا۔ حسب سابق اس کی مرمت شروع ہو گئی۔ وہ لوگ بھی اسے بردہ فروش کہہ کر پکار رہے تھے۔

"اس سے پوچھو' میرا بچہ کہاں ہے۔" عورت چیختے جا رہی تھی۔

مارنے والے چوہدری سے بچے کے متعلق پوچھ رہے تھے لیکن چوہدری کو بولنے کا کوئی موقع نہیں دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا اور مرمت جاری تھی۔

اب اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ پولیس کا نعرہ سن کر بھی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ خدا جانے وہ ایک لمحہ تھا یا صدی۔ اسے بہرحال ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زمانوں سے یونہی پٹے جا رہا ہے۔

اسے ہوش اس وقت آیا جب مارنے والوں کے ہاتھ رکے۔ تب اس نے حیرت سے دیکھا جو شخص بچے کو لے کر بھاگا تھا' وہ عورت کو بچہ دکھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟"

"ہاں۔۔ ہاں۔۔" عورت نے بے تابی سے بچے کو گود میں لے لیا اور اسے بار بار چومنے لگی۔

چوہدری جھوم رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔



فضل بچے کو لے کر ڈاکٹر یاسر کے کلینک پر پہنچا۔ اسی وقت اس کی پڑوسن زہرہ باجی ایک بچے کو گود میں لئے ڈسپنسری سے نکل رہی تھی۔ اس نے فضل کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔ "تم کس کے بچے کو لائے ہو فضل؟"

"میرا عمران ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"عمران! عمران تو میرے پاس ہے۔ میں نے اس کیلئے دوا لی ہے۔"

تب فضل نے پہلی بار اپنی گود کے بچے کو دیکھا۔ وہ اس کا عمران نہیں تھا اور عمران زہرہ باجی کی گود میں تھا۔ "یہ سب کیا ہے باجی۔"

"میں تمہارے گھر گئی تھی۔ سعیدہ پر تو غفلت طاری تھی اور عمران بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں اسے یہاں لے آئی۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔ بڑی زیادتی ہو گئی۔" فضل بڑبڑایا۔

زہرہ باجی نے اسے یوں دیکھا' جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ "کیا برا ہوا' یہ کہ میں نے عمران کو ڈاکٹر کو دکھا دیا۔" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔

"نہیں' یہ بات نہیں باجی۔ اس بے چارے کی بلاوجہ مرمت ہو گئی۔"

"کس بچارے کی؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھا دوں۔" فضل نے اپنی گود والے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ عمران کو گھر لے جائیں اور ذرا سعیدہ کو بھی دیکھ لیں۔"

فضل نے بچے کو ڈاکٹر کو دکھایا' اس کے لئے دوا لی اور اسی طرف چل پڑا۔ جہاں سے وہ بچہ ملا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس بے چارے کی پھر مرمت ہو رہی تھی۔ بس مارنے والوں کے چہرے مختلف تھے۔



وہ سب چوہدری محکوم اللہ سے معذرت کر رہے تھے۔

"اتنا پٹنے کے بعد تمہاری معذرت میرے کس کام کی؟" چوہدری نے بھنا کر کہا۔

"آپ خود سوچیں' اس میں کسی کی کیا غلطی ہے؟" فضل بولا۔ "آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔"

"میں تمہاری جگہ نہیں' اپنی جگہ تھا اور میں صرف نیکی کرنا چاہتا تھا۔" چوہدری روہانسا ہو گیا۔

"معاف کر دو میرے بھائی۔ اللہ تمہیں اجر دے گا۔" بچے کی ماں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

اللہ کے نام پر چوہدری کا دل موم ہو گیا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بہن۔"

ادھر فضل نے بچے کی ماں کو دوا کی شیشی دی۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے' رات تو گزر جائے گی۔ صبح بچے کو ہسپتال ضرور لے جانا۔"

"شکریہ بھائی' تمہاری مہربانی۔"

چوہدری محکوم اللہ وہاں سے چل دیا۔ نمائش جاتے ہوئے وہ سوچتا رہا۔ ایک دن میں وہ تین بار پٹ چکا تھا اور اس کی اتنی مرمت ہوئی تھی کہ ساری زندگی میں مل ملا کر بھی وہ اتنا نہیں پٹا تھا۔ اس کے ذہن میں' اس کی زبان پر وہ سینکڑوں گالیاں مچل

رہی تھیں، جو ابا کے خوف سے وہ زبان پر نہیں لا سکا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس آخری معاملے کا بہرحال ایک مثبت پہلو ہے۔ وہ یہ کہ بیمار بچے کو بروقت دوا مل گئی۔ یعنی ضائع ہونے والے وقت کی تلافی ہو گئی۔ اب اس نے یہ بھی سوچا کہ جب بچے کی ماں اپنے بچے کو لے کر واپس آئی ہو گی اور اسے وہاں نہیں نظر آیا ہو گا تو اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کا دل پگھلنے لگا۔ اس عورت کی وہ اذیت اس کی اپنی تکلیف سے یقیناً کہیں بڑھ کر تھی۔ جو اسے پٹنے سے پہنچی تھی۔

چوہدری کا نیکی کی آرزو سے معمور دل فوراً ہی صاف ہو گیا۔ لیکن نمائش پہنچ کر جب اس نے اپنی جیب پر ہاتھ مارا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی جیب صاف ہو چکی تھی۔ دو روپے والے دو سکے تک موجود نہیں تھے۔

اب کسی نے اس مار پیٹ کے دوران میں اس کی جیب پر ہاتھ صاف کیا تھا یا بھگدڑ میں پیسے اس کی جیب سے گر گئے تھے، یہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔ نتیجہ تو ایک ہی تھا۔ اسے اب گھر تک پیدل ہی جانا تھا۔ نمائش سے گلبرگ۔"



وہ کڑھتا رہا۔ اس کا جسم فریادیں کرتا رہا اور وہ پیدل چلتا رہا۔ وہ گلبرگ پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ نیکی کا تصور بھی اس کے ذہن سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس وہ غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا تھا۔ وہ اس خوفناک دن کی سزا کسی کو دینا چاہتا تھا۔

وہ اس گلی میں داخل ہوا، جس میں اس کا مکان تھا۔ اپنے گھر کے سامنے لال دین کے مکان اور مرغی خانے کو دیکھ کر وہ نفرت سے پاگل ہو گیا۔ اس مرغی خانے کی بدبو نے اسے عاجز کر دیا تھا۔ بدبو تو شاید دوسروں کو بھی آتی ہو گی لیکن بولتا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ لال دین کے اثر و رسوخ سے سب خائف تھے۔ چوہدری کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئی تھیں۔ غیر قانونی ہونے کے باوجود وہ مرغی خانہ وہیں کا

وہیں تھا۔

اس وقت لال دین کے گھر میں تاریکی تھی۔ چوہدری کو یاد آیا کہ جب صبح وہ گھر سے نکل رہا تھا تو لال دین اپنے بڑے بیٹے سے آخری شو میں فلم دیکھنے کی بات کر رہا تھا۔ وہ سب لوگ فلم دیکھنے گئے ہوں گے۔

تھکے ہوئے اور مشتعل چوہدری محکوم اللہ نے سوچا کہ وہ دن بھر سرتوڑ کوشش کے باوجود کوئی نیکی نہ کر سکا تو آخر میں ایک بدی ہی کرتا چلے۔ شاید اس میں ہی کامیابی مل جائے۔ اس وقت اسے کامیابی کی شدید ضرورت تھی۔

چنانچہ چوہدری نے دیوار پھلانگی اور لال دین کے گھر میں داخل ہو گیا۔ لال دین کا مرغی خانہ بہت بڑا تھا اور وہ پورے کا پورا لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ مرغی خانے کے دروازے بند تھے۔ مرغیاں سو رہی تھیں۔ وہاں موجود مرغیوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں تھی۔

چوہدری نے ادھر ادھر سے بہت سے کاغذ اکٹھا کیے اور انہیں مرغی خانے کی جالی دار دیواروں سے ملا دیا پھر اس نے جیب سے ماچس نکالی اور کاغذوں کو دیا سلائی دکھا دی۔ کاغذ آگ پکڑنے لگے۔ ذرا دیر میں اسے اطمینان ہو گیا کہ اب آگ یقیناً لگے گی تب وہ دیوار پھاند کر باہر آ گیا۔

رحمت نے اس کی دستک پر دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ چوہدری محکوم اللہ کی حالت بہت تباہ تھی۔ وہ سوال کرتی رہی لیکن نڈھال چوہدری بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر بستر پر ڈھے گیا۔ وہ اسے نہ سن سکا۔ ساری رات وہ بخار میں پھنکتا رہا۔ رحمت اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی میں بھیگی ہوئی پٹیاں رکھتی رہی۔ وہ ہذیانی کیفیت میں نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔



وہ بہت جیتا جاگتا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہی بزرگ اس کے سامنے تھے جنہیں اس نے گزشتہ رات دیکھا تھا۔ وہ آئے' اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگے۔ "بہت تھک گئے ہو؟" انہوں نے کہا۔

"میں خود سے بیزار ہوں۔ مرجانا چاہتا ہوں۔"

"ایسی بری باتیں نہیں کرتے۔ تکلیف کیا ہے تمہیں؟"

"تف ہے اس زندگی پر' میں سرتوڑ کوشش کے باوجود ایک نیکی بھی نہیں کر پایا۔" چوہدری نے کہا پھر بزرگ پر آنکھیں نکالیں۔ "اور آپ کیوں آئے ہیں میرے پاس۔ آپ تو نیک آدمی ہیں۔ جب کہ میں بہت گنہگار ہوں۔"

بزرگ مسکرائے۔ "میں تمہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔"

چوہدری آپے سے باہر ہو گیا۔ "کس بات کی مبارکباد؟ نیکی کی راہ میں مسلسل پٹنے کی مبارکباد۔" وہ چلایا۔

"تم چاہو تو یہی سمجھ لو۔" بزرگ اب بھی مسکرا رہے تھے۔ "مگر سچ یہ ہے کہ اتنے کم وقت میں تم نے اتنی بہت سی نیکیاں کیں کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ تمہیں اس عنایت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے جو کوشش کی نیکی کے لئے' وہ الٹ گئی' ناکام ہو گئی۔"

"دیکھو۔۔ نیت کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ تمہاری نیت بھی اس پر ظاہر تھی۔ اب ظاہر میں جو بھی ہو اور دنیا والے جو بھی سمجھیں' میں تمہیں یہ خوشخبری دینے آیا ہوں کہ اللہ نے تمہاری ہر نیکی قبول فرمائی۔ بس افسوس اس بات کا ہے کہ تم توفیق کا معاملہ نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے نیکی تمہارے لئے مشکل ہو گئی مگر اللہ کی

رحیمی دیکھو' اس کے باوجود اس نے تمہاری ہر نیکی قبول کر لی۔ بڑا اجر کما لیا ہے تم نے۔"

"مگر میں تو کچھ بھی نہیں کر سکا۔"

"اس عجز نے تمہاری نیکیوں کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔" بزرگ نے کہا۔ "شاید تم اپنی دانست میں کامیاب ہوتے تو اپنی نیکیوں پر غرور کرتے اور نیکی کا مرتبہ کم ہو جاتا۔ شاید رب نے تم پر یہ کرم فرمایا کہ تمہیں اپنی نیکیاں ناکام لگیں اور اس کے نتیجے میں تم ضرر سے بچ گئے۔ ویسے تم نے اللہ کے حکم پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ تم نے حق بات کہی۔ سچی گواہی دی۔ اللہ کے بندوں کی خدمت کی۔ ان کے کام آنے کی کوشش کی۔ ان کے دکھ درد محسوس کئے' ان کیلئے اچھا سوچا۔ اللہ نے سب کچھ قبول فرما لیا مگر تمہاری وہ نیکی سب سے خوبصورت تھی' جو تم نے ایک ضرورت مند کی جیب میں رقم ڈال کر خاموشی سے کی۔ وہ اللہ کو بہت پسند آئی۔"

چوہدری کھل اٹھا۔ "مجھے تو اس پر یقین ہی نہیں تھا کہ میں نے نیکی کی ہے۔"

"اسی سے اس کی خوبصورتی بڑھ گئی۔ تمہیں بھی یقینی طور پر علم نہیں تھا کہ وہ نیکی ہے۔ اس کا صلہ۔۔ انشاء اللہ بہت بڑا ہو گا۔ یہ بھی اس کا صلہ ہے کہ اللہ نے تمہاری بدی کو بھی خوش انجام کر دیا۔ اب تمہیں بدی کا بھی اچھا اجر ملے گا۔"

بزرگ غائب ہو گئے اور چوہدری کراہتا رہا۔



صبح رحمت کے جھنجوڑنے پر چوہدری کی آنکھ کھلی۔ اس کی فجر پھر قضا ہو چکی تھی۔ وہ اس پر افسوس کر رہا تھا کہ بیوی نے دھماکہ کیا۔ "وہ حشمت آیا ہے۔ دروازے پر کھڑا ہے۔ میں نے تمہاری طبیعت خراب کا بتا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ کہتا ہے کہ تم سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔"

چوہدری نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ "تم مت اٹھو۔ اب طبیعت کیسی ہے تمہاری۔"

چوہدری کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو رہا تھا۔ "مجھے کیا ہوا؟"

رات بھر بخار رہا ہے تمہیں۔ بڑبڑاتے رہے۔ لیٹے رہو۔" رحمت نے بڑی محبت سے کہا۔

"لیکن حشمت۔"

"میں اسے اندر بلا لیتی ہوں۔ ویسے بھی باہر اس سے بات کرنا ٹھیک نہیں۔ وہ چیخے چلائے گا تو محلے میں بدنامی ہو گی۔"

چوہدری سہم گیا۔ اب دیکھو' کیا افتاد آتی ہے۔

رحمت چلی گئی۔ چند لمحے بعد حشمت کمرے میں داخل ہوا۔ رحمت نے اس کیلئے کرسی لا کر رکھ دی۔ وہ چوہدری کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیسی طبیعت ہے چوہدری صاحب؟"

چوہدری کو گمان ہوا کہ وہ طنزیہ کہہ رہا ہے۔ "رحمت کہتی ہے' مجھے رات بھر بخار رہا ہے۔" اس نے عاجزی سے کہا۔

"وہ تو دیکھنے سے ہی پتہ چل رہا ہے۔" حشمت نے کہا۔

"تم نے کیسے تکلیف کی حشمت؟"

حشمت ہچکچا رہا تھا۔ کبھی نظریں اٹھاتا' کبھی جھکا لیتا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا چوہدری صاحب کہ کیا کہوں۔"

"بات کیا ہے۔" چوہدری کو الجھن ہونے لگی۔ "جو ہونا ہے' فوراً ہی ہو جائے۔"

حشمت اب بھی ہچکچا رہا تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھایا' اور چوہدری کے پاؤں پکڑ لئے۔ "مجھے معاف کر دو چوہدری صاحب۔"

چوہدری طاقت نہ ہونے کے باوجود اضطراری طور پر اٹھ بیٹھا۔ "ارے ارے۔۔ کیا کرتے ہو۔" اس نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی۔

"بس آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"بات کیا ہے حشمت؟"

"میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ آپ کو برا بھلا کہا۔۔ اپنی مکار بیوی کے بہکاوے میں آ کر۔ اب مجھے یاد آیا کہ آپ نے کوئی تہمت نہیں لگائی تھی۔ آپ نے جو دیکھا

۔۔ اور جو کچھ آپ کو بتایا گیا تھا' اس کے مطابق بات کی نہیں تھی بلکہ اب میں ھا ہوں کہ آپ نے تو وہ بات سمجھی بھی نہیں تھی' جو ہم نے سمجھ لی۔ آپ تو میری یادت' میری مزاج پرسی کرنا چاہتے تھے۔ آپ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔" مت اب رونے لگا۔

چوہدری کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "بات کیا ہے؟ میں اب بھی نہیں ھا۔"

"آپ بہت سادہ اور معصوم آدمی ہیں چوہدری صاحب۔ آج میں نے کام سے ٹی کر لی اور اپنی بیوی کو نہیں بتایا۔ میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گزاری کرتا رہا پھر بجے میں دیوار پھاند کر اپنے گھر میں گھسا تو میں نے دیکھا کہ افضل وہاں موجود تھا ۔۔" حشمت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

چوہدری نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔ "اللہ تمہیں سکون دے مت۔"

"بس آپ مجھے معاف کر دیں چوہدری صاحب۔" وہ گڑگڑایا۔

"ٹھیک ہے حشمت۔ اگرچہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی شکایت نہیں تھی بھی تمہاری خوشی اور سکون کیلئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔" چوہدری نے کہا۔ یکن ہو سکے تو میری ایک بات مان لو۔"

حشمت نے سر اٹھا کر احترام آمیز نظروں سے دیکھا۔ "حکم کریں چوہدری حب۔"

"دیکھو' آدمی کو اللہ نے بہت کمزور بنایا ہے اور وہ غفور الرحیم ہے۔ اسے ں میں درگزر کی خوبی بہت اچھی لگتی ہے۔ سو بندوں کے ساتھ درگزر کرنا اسے پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی بیوی کو معاف کر دو اور اسے ایک اور موقع اللہ تمہیں اس کا بڑا اجر دے گا اور اگر وہ سدھر گئی تو اور زیادہ اجر ملے گا ں۔"

حشمت نے چوہدری کا ہاتھ تھاما اور اسے چومنے لگا۔ "جو آپ کا حکم چوہدری ب۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آج اس کا فیصلہ کر دوں گا لیکن آپ کی خاطر میں

اسے معاف کر رہا ہوں۔ اب اسے جا کر بتاؤں گا کہ جس پر اس نے اتنا رکیک الزام لگایا تھا' اس کی خاطر اسے معاف کر رہا ہوں اور چوہدری صاحب' وہ بھی معافی مانگنے آئے گی آپ کے پاس۔ میں خود اسے لے کر آؤں گا۔"

چوہدری گھبرا گیا۔ "ایسا نہ کرنا' اسے بتا دینا کہ میں نے بھی اسے معاف کر دیا ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔"

حشمت کے جانے کے بعد رحمت کمرے میں آئی اور روتے ہوئے بولی۔ "خدا کے واسطے' مجھے بھی معاف کر دو۔"

"کیوں' تم نے کیا کیا ہے؟"

"میں نے تمہیں برا بھلا کہا۔ فجر کی نماز کو منع کیا اور دل میں تمہیں بہت برا سمجھا۔ تم تو بہت اچھے ہو جی۔"

"مگر مجھے تو برا نہیں لگا۔"

"پر اس دن سے تمہاری فجر قضا ہو رہی ہے۔"

چوہدری ہنسنے لگا۔ "وہ تو میری اپنی بدقسمتی ہے۔ روز تھک کر سو رہا ہوں۔ آنکھ ہی نہیں کھلتی۔"

"بس تم مجھے معاف کر دو۔"

"چلو' تمہیں بھی معاف کیا۔"

"اور سنو--- رات تو یہاں بہت ہنگامہ ہوا۔" رحمت نے اچانک کہا۔

"کیا ہوا؟"

"رات کسی نے لال دین کے مرغی خانے کو آگ لگا دی۔"

چوہدری کے دل میں کئی دن کے بعد سچی خوشی کی ایک زبردست لہر اٹھی۔ "اچھا--- تو ساری مرغیاں روسٹ ہو گئی ہوں گی۔" اس نے بظاہر بڑی تشویش سے کہا حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قہقہے لگائے۔

"نہیں جی' بس چند ایک مرغیاں جل مریں۔" رحمت نے کہا۔ "دراصل محلے والوں نے بہت تیزی سے آگ بجھا دی تھی لال دین تو بیوی بچوں کے ساتھ رات کا شو دیکھنے کیلئے گیا ہوا تھا۔"

"اچھا' تو تقریباً ساری مرغیاں بچ گئیں۔" چوہدری نے مرے مرے لہجے میں ہا۔

"ہاں' لیکن آگ جلانے والے نے بڑی نیکی کی۔"

چوہدری نیکی کے نام پر بھڑک اٹھا۔ اس کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ "کیا طلب؟"

"جس وقت آگ لگائی گئی' لال دین کے گھر میں ایک چور گھسا ہوا تھا۔ رحمت چٹخارے لے کر بتا رہی تھی۔ "آگ لگنے سے سارا محلہ جمع ہو گیا تھا۔ چور ن لاکھ روپے نقد اور دس بارہ لاکھ کے زیورات لے کر نکلنے والا تھا کہ اسے پکڑ لیا یا۔ لال دین بہت بڑے نقصان سے بچ گیا۔ مرغی خانے میں آگ نہ لگتی تو چور مال لے کر نکل لیا ہوتا۔ اچھا سنو' میں تمہارے لئے لوٹا لاتی ہوں۔ تم کلی کرو اور منہ دھو ۔ میں نے تمہارے لئے دلیا بنایا ہے۔" رحمت یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

چوہدری کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ کڑھ رہا تھا۔ نفرت اور ناکامی کی آگ ں جل رہا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے عضلات نرم پڑ گئے۔ اسے اپنا اب یاد آیا اور جو بات وہ خواب میں بھی نہیں سمجھ سکا تھا' اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ہ کی مہربانی سے اسکی بدی خوش انجام ہو گئی تھی اور اسے خوشخبری دی گئی تھی کہ ا کا بھی بڑا اجر ملے گا۔

اب چوہدری محکوم اللہ کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

اس کے دل میں ندامت کی ایک لہر اٹھی۔ وہ نیکی کا خواہش مند' اپنے پڑوسی کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ ایسا ہو جاتا تو وہ تو مومن ہی نہ رہتا۔ وہ مومن تو نہیں جس کے ہاتھوں اس کے پڑوسی کو نقصان پہنچے۔ لال دین اپنی جانے لیکن اسے تو یب نہیں دیتا۔ اس بار تو اللہ نے اسے بچا لیا۔

وہ شرمندہ ہوا پھر اس کے وجود میں ندامت کی ایک تند لہر اٹھی۔ پہلے اس کی یں بھیگیں' پھر پورا وجود بھیگ گیا۔ اس نے اپنا چہرہ چھت کی طرف کیا اور گڑگڑا بولا۔ "میرے معبود' میری غلطی کو درگزر فرما۔ میرے مالک' میں شرمندہ ہوں۔" ہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آنسو تھمے تو اسے احساس ہوا کہ جیسے اس کے وجود میں

بکھری ہوئی تمام آلائشیں دھل گئیں ہیں۔ اب وہ پاک ہے۔

پھر اسے ایک بات کا خیال آیا۔ ”میں تیرا شکر گزار ہوں اے رحیم و کریم۔“ اس نے عاجزی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”تو نے مجھے توفیق سے اور وسائل سے نوازا اور میں شرمندہ ہوں میرے رب کہ میں بقدر توفیق نیکی نہ کر سکا۔ کائنات کے سب خزانے تیرے لئے ہیں اے میرے رب تو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔ میرے آقا' مجھے ایسی نیکیوں کی توفیق عطا فرما' جن سے تیرے سوا سب بے خبر رہیں۔ میں خود بھی بے خبر رہوں۔“ پھر اس نے تکئے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

رحمت' لوٹا اور تسلا لے کر کمرے میں آئی تو چوہدری محکوم اللہ کے چہرے پر بکھرے ہوئے رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

